دہشت گردی کے اڈے
یا
خیر کے مراکز

- ☆ دینی مدارس کی حقیقت کیا ہے؟
- ☆ یہاں پڑھنے پڑھانے والے کون ہیں؟
- ☆ کیا جدید معاشرے کو مدارس کی ضرورت ہے؟
- ☆ کیا مدارس فقط ان پڑھ مُلا فراہم کر رہے ہیں؟
- ☆ کیا ان کا نظامِ تعلیم جدید ضرورتوں سے ہم آہنگ ہے؟
- ☆ ترقی پذیر ممالک کے لیے یہ بوجھ ہیں یا ریلیف کا ذریعہ؟
- ☆ مدارس کا نصاب اخلاق ساز ہے یا اخلاق سوز؟
- ☆ مدارس کا ماحول تنگ نظری سکھاتا ہے یا وسعت خیالی؟
- ☆ مدارس کا تربیت یافتہ انتہا پسند ہے یا روادار؟
- ☆ مدارس میں داخلہ لینے والے محروم ہیں یا خوشحال؟

انور غازی

الحجاز کراچی

موضوعِ کتاب .... دینی مدارس
مصنف .... انور غازی
ای میل .... anwarghazi313@yahoo.com
اشاعتِ اوّل .... جنوری 2011ء
ناشر .... الحجاز پبلشرز
مطبع .... العامر پرنٹنگ پریس 03212382266

ملنے کا پتا

مکتبۃ الخلیج، دکان نمبر 11، سلام کتب مارکیٹ
نزد جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن، کراچی
0314-2139797
0300-2822531

بسم الله الرحمن الرحيم

فہرست عنوانات

عنوان	صفحہ

عنوان	صفحہ

عنوان	صفحہ

عنوان	صفحہ

عنوان	صفحہ

عنوان	صفحہ

عنوان	صفحہ

عنوان	صفحہ

☆☆☆☆

انتساب

ماں جی کے نام

اپنی دو جماعتیں پڑھی ...... نیم خواندہ "ماں" کے نام ...... جس کے پاس ...... جب بھی ...... میں اپنی نئی کتاب لے کر جاتا ہوں ...... تو اس کی آنکھوں میں ...... خوشی کے مارے ڈھیروں پانی اُتر آتا ہے ...... اپنے پلو سے آنکھیں رگڑ رگڑ کر آنسو خشک کرتی ہے ...... اور بلا کی معصومیت سے مجھ سے پوچھتی ہے: "پتر ...... اے تو ہی لکھی ہے ناں؟" ...... میرے بار بار اقرار کے باوجود ...... وہ بے یقینی سے ...... میری آنکھوں میں جھانکتی ہے ...... کہ کہیں میں مذاق تو نہیں کر رہا ...... پھر میں سرورق پر چھپے ...... اپنے نام پر اُنگلی رکھ کر کہتا ہوں ...... "ماں خود پڑھ لے ...... کس کا نام لکھا ہے؟" ...... ماں اپنی عینک کو پلو سے صاف کر کے ...... ناک پر جماتی ہے ...... اور میرا نام پڑھنے کی کوشش کرتی ہے ...... پچاس سال پہلے پڑھی ...... دو جماعتوں کا تمام تر علم ...... بروئے کار لا کر ...... نام پڑھتی ہے ...... اور سر اُٹھا کر پوچھتی ہے: "پتر! ...... اے انور تے توں ہی ہے ...... پر ...... اے مُوا غازی کون ای؟" ...... میری ماں نے تو میرا نام ...... "انور" ...... ہی رکھا تھا ...... یہ "غازی" تو میری اپنی ...... ایجاد کردہ بدعت ہے ...... تب مجھے پتا چلتا ہے ماں کو ...... کیوں یقین نہیں آتا؟ ...... جس روتے دھوتے، منہ بسورتے "انور" کو ...... وہ مار پیٹ کر ...... زبردستی ...... مسجد بھیجا کرتی تھی ...... کہ ناظرہ قرآن پڑھ لے ...... اس کے نزدیک ...... تو اس انور کی عمر میں ...... اب تک کوئی اضافہ نہیں ہوا ...... "انور غازی" کے مصنوعی فریم کی پشت پر بیٹھے ...... چھوٹے سے انور کو جاننے والی ...... ان ناموں سے ...... کہاں مرعوب ہو سکتی ہے؟ ...... مگر قربان جاؤں ...... اس کی محبت کی ...... اس ادا پر ...... کہ صاف ستھری ...... نئی نویلی کتاب کو از سرِ نو ...... جھاڑ پونچھ کر غلاف چڑھوا دیتی ہے ...... تاکہ گردشِ ماہ وسال کے اثرات سے محفوظ رہ سکے ...... اور پھر کمرے میں موجود الماری کے ...... سب سے اوپر کے خانے پر رکھوا دیتی ہے ...... تاکہ ہر دم اس کی نگاہ میں ہو۔

"اے ماں! دنیا جہاں کی ڈگریاں ...... اور ...... تمام تر علم و دانش ...... تیری اس نیم خواندگی کے ...... پاؤں کی دھول ہوں ...... تمام لیاقتیں ...... قابلیتیں ...... اور ...... اہلیتیں ...... تیری ان معصومانہ اداؤں پر ...... سو دل و جان سے نثار ہوں ...... میں آج جو کچھ بھی ہوں ...... تیری دعاؤں ...... کا اعجاز ہے ...... تو نہیں ...... تو اس جہانِ رنگ و بو میں ...... کچھ بھی نہیں ...... کچھ بھی نہیں ...... کچھ بھی نہیں !!!

حرفِ اوّل

پروپیگنڈے کا جواب!

''ایڈولف ہٹلر'' 20 اپریل 1889ء کو آسٹریا کے ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوا۔ اسے فائن آرٹس سے دلچسپی تھی لیکن ویانا کے کالج آف فائن آرٹس میں داخلہ نہ مل سکا، کیونکہ وہ مطلوبہ معیار پر پورا نہیں اُترتا تھا۔ 1913ء میں ہٹلر جرمنی آیا۔ یہاں وہ ایک عام سپاہی کے طور پر فوج میں بھرتی ہوا۔ پہلی جنگ عظیم میں جرمن کے لیے لڑا۔ 1919ء میں جرمنی کی ''ورکر پارٹی'' کا رکن بنا۔ یہی پارٹی 1920ء میں ''نازی پارٹی'' کے نام سے مشہور ہوئی۔ 1921ء میں ہٹلر اس پارٹی کا چیئرمین منتخب ہوگیا۔ 1930ء میں انتخابات ہوئے تو ''نازی'' ملک کی دوسری بڑی پارٹی کے طور پر سامنے آئی۔ 1933ء کے انتخابات میں نازی پارٹی اکثریت حاصل نہ کرسکی مگر پریزیڈنٹ نے سب سے بڑی پارٹی کی حیثیت سے اسے حکومت بنانے کی دعوت دی اور ہٹلر ملک کے سب سے اعلیٰ عہدے ''چانسلر'' تک پہنچ گیا۔ چانسلر بننے کے بعد ہٹلر نے جو سب سے پہلا کام کیا، وہ نازی پارٹی کا فروغ تھا۔ اس دوران اس نے ملک میں بے روزگاری کے خاتمے اور دوسرے متعدد ترقیاتی اقدامات کے ذریعے سے جہاں جرمنوں کی اکثریت کو اپنا گرویدہ بنایا وہاں انہیں یہ بھی بتایا کہ وہ دنیا کی عظیم ترین اور فاتح قوم ہیں۔ 1939ء میں ہٹلر کی جانب سے پولینڈ پر جارحیت، دوسری جنگ عظیم کے آغاز کا باعث بنی۔ اس کے دورِ حکومت میں نازی جرمنی، یورپ کے بیشتر حصے پر قابض رہا۔ اس پر ایک کروڑ 10 لاکھ افراد کے قتل کا الزام بھی لگایا جاتا ہے۔ ان میں مبینہ طور پر 60 لاکھ یہودی بھی شامل تھے۔ یہودی، ہٹلر کے ہاتھوں اس قتل عام کو 'ہولوکاسٹ' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

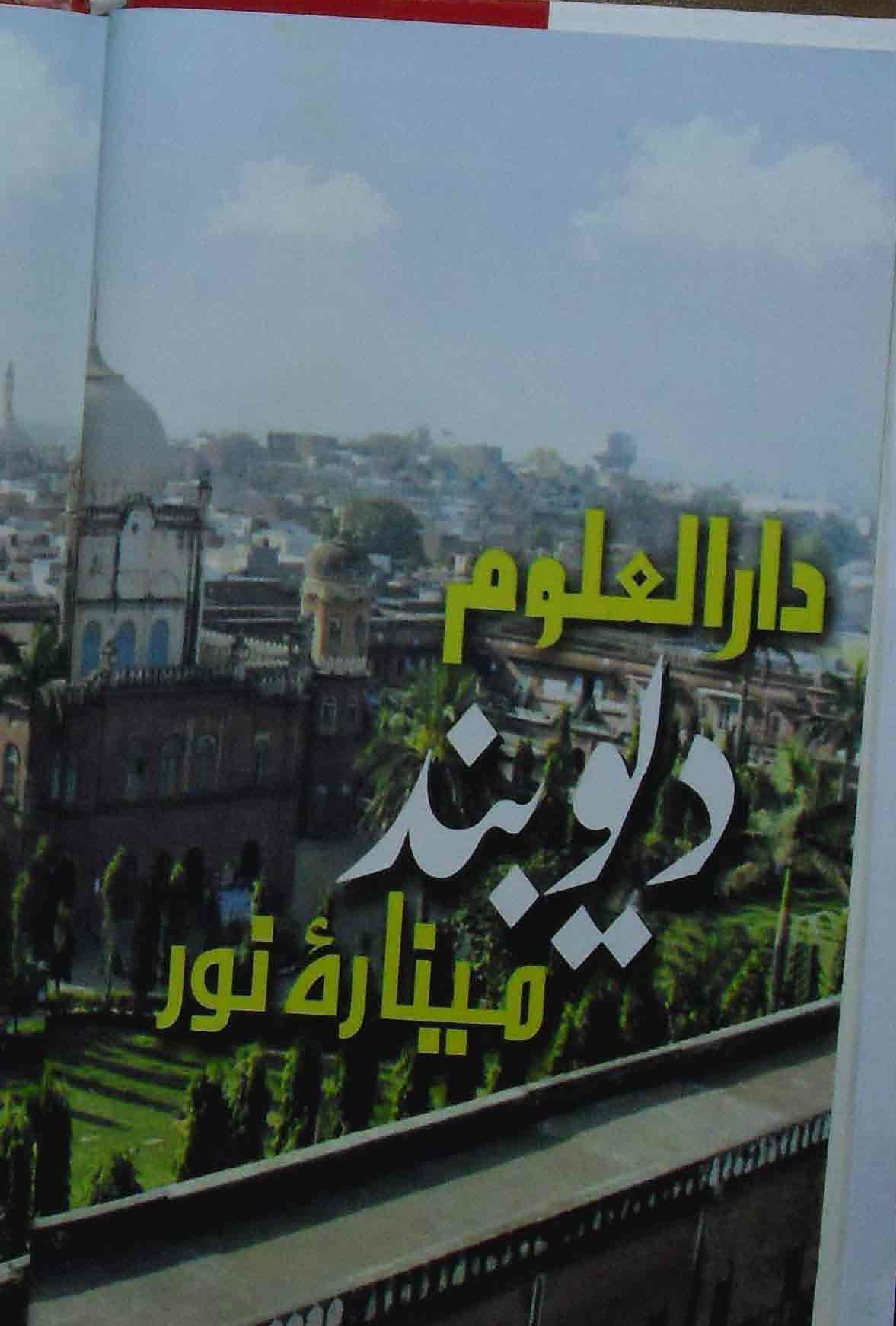
تاریخ کے اوراق کو پلٹ کر دیکھتے ہیں تو ہٹلر سے متعلق دلچسپ اور حیرت انگیز باتیں پتا چلتی ہیں۔ مؤرخین کے مطابق ہٹلر ایک نہایت ذہین، شاطر، عیار، ظالم اور اذیت پسند شخص تھا۔ اس کی

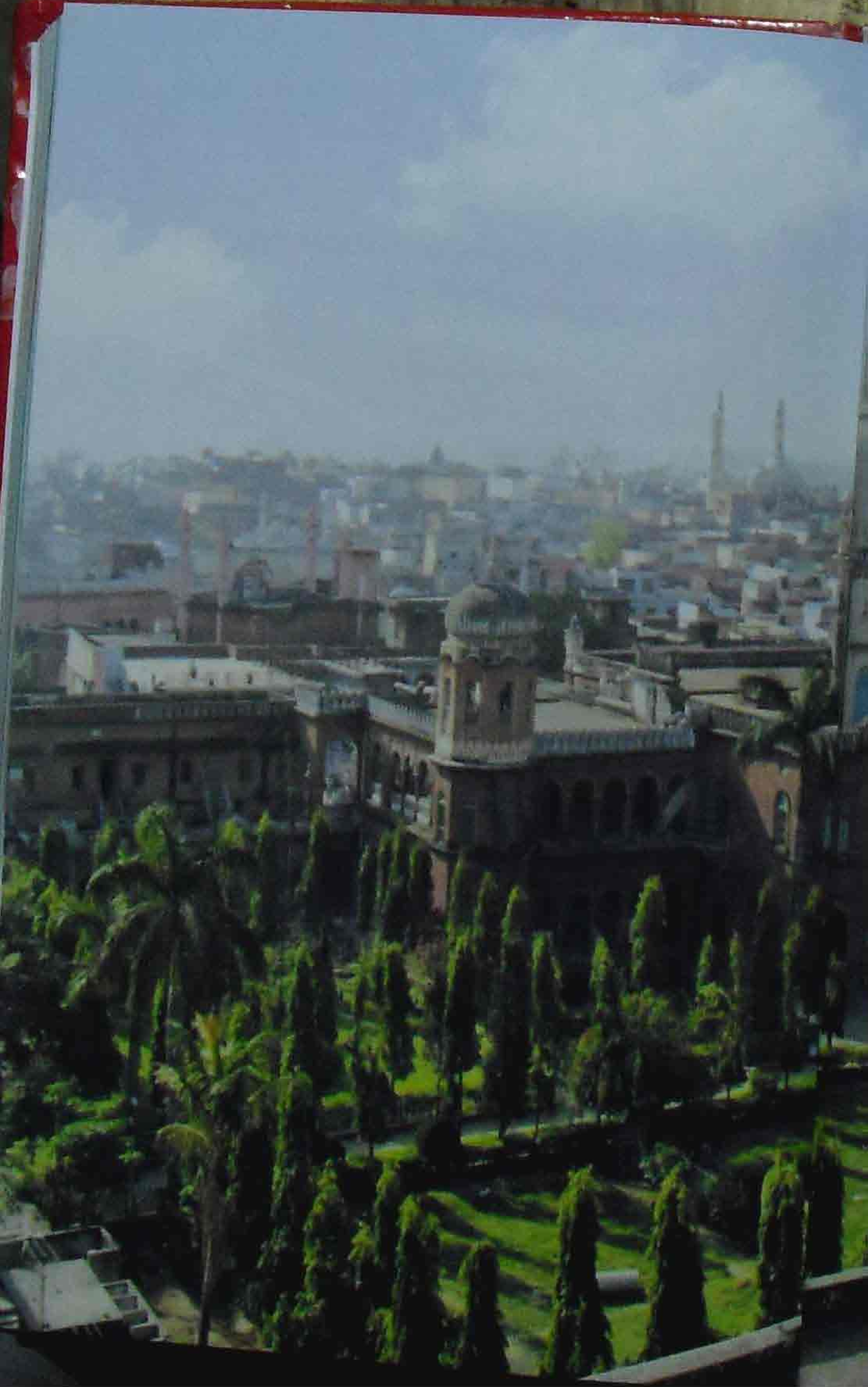
شخصیت کو کرشماتی شخصیت کہا جاتا ہے۔ جب وہ لاکھوں کے مجمع کے سامنے تقریر کے لیے کھڑا ہوتا تو گویا پورے مجمع پر سحر کر دیتا تھا۔ الفاظ ہٹلر کے لیے کھلونا تھے۔ اندازِ بیان دلچسپ تھا۔ ہٹلر کی مقبولیت کی ایک وجہ اس کی پارٹی کے نظریات تھے۔ انہی نظریات کی بنا پر نہ صرف جرمنی کے دو ٹکڑے ہوئے بلکہ تاریخ انسانی کی بدترین شخصیتوں میں ہٹلر کا شمار ہوا۔ ہٹلر جہاں ایک ذہین و فطین سیاستدان تھا وہیں اس کی معاشی اصلاحات نے اس کے اقتدار کے اولین سالوں میں ہی جرمنی کو معاشی طاقت اور اہل جرمن کو خوشحال بنا دیا تھا۔ یہ معاشی ترقی بھی ہٹلر کی مقبولیت کی بڑی وجہ بنی۔ 16 جنوری 1945ء کو ہٹلر نے ''فرہر بینکر'' نامی جگہ پر سکونت اختیار کر لی تاکہ یہاں سے وہ پسپا ہوتے ہوئے تیسرے دھڑے کی نگرانی اور مدد کر سکے کیونکہ اتحادی افواج شرق و غرب سے بڑھتی جا رہی تھیں۔ اپریل کے آخر میں سوویت افواج برلن میں داخل ہو گئیں۔ اُنہوں نے برلن کے صدر مقام کی جانب پیش قدمی شروع کر دی جہاں ایوانِ چانسلر واقع تھا۔ مؤرخین کے مطابق 22 اپریل 1945ء کو ایک فوجی کانفرنس کے دوران ہٹلر نے یہ اقرار کیا کہ اب شکست یقینی ہے اور جرمنی یہ جنگ ہار جائے گا۔ ہٹلر نے اس موقع پر اپنے معالج ''ورنر ہاسس'' سے کہا وہ خودکشی کا کوئی موزوں طریقہ بتائے۔ ''ہاسس'' نے اُسے سنکھیا زہر اور سر میں گولی مار کر زندگی کو ختم کرنے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ 30 اپریل 1945ء کو ہٹلر نے برلن میں زیرِ زمین پناہ گاہ میں اپنی نئی نویلی دلہن ''ایوان براؤن'' کے ساتھ خودکشی کر لی۔

ہٹلر خود جتنا ہوشیار اور چالاک تھا، اس نے کابینہ بھی اسی انداز سے رکھی تھی۔ خصوصاً ''گوئبلز'' اس کا پروپیگنڈا ماسٹر تھا۔ اس نے جنگ عظیم دوم میں پروپیگنڈے کی کئی نئی تکنیکس متعارف کرائیں۔ اس کا وہ قول تو آج تک پروپیگنڈے کی دنیا پر حکمرانی کر رہا ہے: ''جھوٹ اتنا بولو، اتنا بولو کہ وہ سچ دکھائی دینے لگے۔'' گوئبلز نے 1935ء میں ایک نئی تھیوری پیش کی تھی۔ اس کا کہنا تھا: ''اگر آپ کا حریف سچا اور آپ جھوٹے ہوں تو پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں، بس جب آپ کا حریف بات کرنے لگے تو آپ اس کے نزدیک شور کرنا شروع کر دیں، اس کی بات لوگوں تک پہنچنے ہی نہیں پائے گی۔'' دوسری جنگ عظیم کے دوران ''گوئبلز'' نے اس تھیوری سے بڑا کام



دارالعلوم دیوبند میں انار کا قدیم درخت۔ یہاں تقریباً ڈیڑھ سو برس قبل استعمار کی فکری یلغار کا مقابلہ کرنے کے لیے اس تعلیمی تحریک کا آغاز ہوا جو بیسویں صدی میں دنیا بھر میں حفاظتِ دین کے لیے سب سے مؤثر ثابت ہوئی ہے۔ مدارس اسی امانت کے امین اور محافظ ہیں، جس کی مبارک جڑ اس درخت کے سائے میں لگائی گئی تھی اور جس کی بار آور شاخیں دنیا بھر میں پھیلی ہوئی ہیں۔


دارالعلوم
دیوبند
مینارۂ نور





دارالعلوم دیوبند کے دارِ جدید کی جگہ زیرِ تعمیر نئے دارالاقامہ کی عالیشان عمارت کا طائرانہ منظر۔



دارالعلوم دیوبند کے رہائشی ہاسٹل کا شمالی حصہ۔ جس کے عقب میں مسجد رشید کے فلک بوس مینارے نظر آرہے ہیں۔

لیا۔ اس نے ریڈیو کی ایسی لہریں ایجاد کرائیں جو دشمن کے ریڈیو کی نشریات میں شور پیدا کر دیتی تھیں جس کے نتیجے میں لوگ ریڈیو کی نشریات نہیں سن سکتے تھے۔ اس نے مقامی زبانوں میں خفیہ ریڈیو اسٹیشن بنوائے۔ یہ اسٹیشن مقامی زبانوں میں لوگوں کو اتحادیوں کے خلاف ابھارتے تھے۔ اس نے دشمن کے ارادے توڑنے کے لیے 35 بڑی زبانوں میں پمفلٹ اور اخبارات شائع کروائے۔ نازی جہاز یہ پمفلٹ اور اخبارات فضا سے دشمن کے علاقوں میں پھینک جاتے تھے۔ لوگ یہ پمفلٹ پڑھ کر پریشان ہو جاتے۔ انہیں محسوس ہوتا نازی جیت رہے ہیں اور اتحادی ہار رہے ہیں۔ اس نے جنگ کے دوران افواہ سازی کو باقاعدہ فن کی شکل دی۔ وہ اپنے جاسوسوں کے ذریعے مقامی علاقوں میں اس قسم کی افواہیں پھیلاتا تھا: ''اتحادی پسپا ہو رہے ہیں۔ نازی آگے بڑھتے چلے آ رہے ہیں۔ تھوڑے عرصے بعد اس علاقے پر نازیوں کی حکومت ہوگی۔'' اس نے ایک بار اپنی اس کامیاب پالیسی کے بارے میں تفصیل بتائی کہ وہ چند دوستوں کے ساتھ ایک فیکٹری کے دورے پر گیا۔ وہاں جب وہ اپنے دوستوں کو فیکٹری کے بارے میں بتا رہا تھا تو اچانک مشین چلنے لگی، مشین کی آواز اس کی آواز پر حاوی ہوگئی۔ اس نے چیخ چیخ کر دوستوں کو بتانا شروع کیا، لیکن مشین کی آواز کی وجہ سے اس کا ایک بھی لفظ اس کے دوستوں کے پلے نہ پڑا۔ اس واقعے سے اس کے ذہن میں ''پروپیگنڈے'' کی نئی تکنیک آئی اور اس نے شور پیدا کرنے کی تھیوری پیش کی۔ جنگ عظیم دوم تو ختم ہوگئی لیکن گوئبلز کی تکنیک پر عمل ہوتا رہا۔ یہ تھیوری معمولی ردو بدل کے ساتھ آج تک استعمال ہوتی آ رہی ہے۔ ہٹلر کے پروپیگنڈا ماسٹر ''گوئبلز'' کا فلسفہ تھا:

''اتنی دھول اڑائیں کہ حقیقت کا چہرہ اس کے پیچھے چھپ جائے۔ سچ کے قریب اتنا شور پیدا کر دیں کہ اس کی آواز لوگوں کے کانوں تک نہ پہنچ سکے۔''

بے شک پروپیگنڈے کا شور اصل حقیقت کو چھپا دیتا ہے۔ نائن الیون کے بعد جتنا زہریلا پروپیگنڈا دینی مدارس کے طلبہ، علماء اور صلحاء کے بارے میں کیا گیا ہے، شاید ہی اتنا کسی اور طبقے کے بارے میں ہوا ہو۔ دینی مدارس کے اُجلے دامن کو کن کن طریقوں سے داغدار کرنے کی بھونڈی کوشش نہیں کی گئی؟ دینی مدارس...... جو خیر کے مراکز ہیں...... کو کس کس طرح دہشت گردی کے

اڈے ثابت کرنے کی کوشش کی گئی؟ جو کام اسکول اور کالج میں ترقی کی علامت قرار دیا گیا، اسے مدارس کے لیے قابلِ تعزیر گردانا گیا۔ دینی مدارس میں ہونے والی جسمانی ورزش کو دہشت گردی کی تربیت کہا جاتا ہے، جبکہ اسکولوں میں ہونے والی ورزش کو ''ایکسر سائز'' کا نام دیا گیا۔ کالج کے نوجوان اگر کراٹے کلب جاتا ہے، اسے ایتھلیٹ کہہ کر اس کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے جبکہ مدارس کے لڑکے عصر کے بعد ریاضت کریں، انہیں طالبانائزیشن کا خطرہ قرار دیا جائے۔ انصاف تو دیکھیے! جو کچھ مغرب اور مغرب زدہ افراد کریں وہ معیارِ تہذیب وتمدن کہلائے اور جو کچھ مدارس کے طلبہ، علماء اور صلحا کریں وہ کمالِ جہالت کہلاتا ہے۔ یہ نام نہاد اسکالرز دنیا بھر کے کارنامے اور فخر وافتخار کالجیوں کے نام جبکہ ساری رسوائیاں اور الزامات اہلِ مدارس کے نام کر دیتے ہیں۔ ٹیڑھا منہ کر کے انگریزی بولنے والوں کو پڑھے لکھے اور ''قال اللہ وقال الرسول'' کی صدائیں بلند کرنے والوں کو جاہل، اجڈ اور نکمے قرار دیتے ہیں۔ جعلی ڈگریوں والے قوم کے نمایندے کہلائیں جبکہ وفاق المدارس کی اعلیٰ سند کو وقتاً فوقتاً چیلنج کیا جاتا رہے۔

رشوت خوری کے عادی افسران پرُتعیش زندگی گزاریں تو باعزت کہلائیں اور اگر نماز، روزہ اور ذکر واذکار کے خوگر علماء وطلبہ سادگی کا طور اپنائیں تو باعثِ حقارت ٹھہریں۔ قومیت وتعصب کے بدبودار نعرے لگانے والے سرِعام ملک کو توڑنے کی بات کریں تو واہ واہ! اور اگر قرآن وسنت کے حاملین دل جوڑنے کی بات کریں تو نفرین اور آہ آہ۔ کراچی میں خون کی ہولی کھیلنے والے آزاد اور کراچی کے مدارس کے طلبہ وعلماء کی خصوصی نگرانی اور انکوائری۔ یہ سب کیا ہے؟ مدارس کے خلاف اتنا پروپیگنڈا کیوں؟ مدارس کے تمام طلبہ وعلماء کو شمالی علاقہ جات اور وزیرستان کے طالبان کیوں قرار دیا جاتا ہے؟ یکا یک علمائے کرام کے خلاف معروف دانشوروں سے کالم کیوں لکھوائے جاتے ہیں؟ الیکٹرونک میڈیا کے ٹاک شوز میں علماء اور اسلامی شعائر کا احترام نہ کرنے والوں کو بطورِ خاص کیوں بلایا جاتا ہے؟ کسی بھی عام گاؤں کی مسجد کے غیر عالم امام اور صرف حفظ کر کے گھر میں ٹیوشن پڑھانے والے کسی بھی شخص کی انفرادی غلطی کو علماء کے سر تھوپنے اور پیالی میں طوفان برپا کرنے کی کوشش کیوں کی جاتی ہے؟ بڑھتی ہوئی مہنگائی لوگوں کو وہاں تک لے جانے کی کوشش

تو نہیں ہے جہاں پہنچ کر وہ مدارس کی مالی اعانت کے قابل ہی نہ رہیں۔ دینی مدارس کو چندہ دینے والوں کو ڈرا دھمکایا جاتا ہے۔ مخیر حضرات کو خوفناک انجام کی برہنہ دھمکیاں دی جاتی ہیں۔ موبائل فون میسجز پر علماء، مولوی اور مولانا کے الفاظ استعمال کر کے لوگوں کے قلوب سے ان کی محبت اور عزت ختم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ علماء پاکستان کی زمینی اور نظریاتی سرحدوں کے محافظ ہیں۔ ان مفت کے محافظین کے خلاف پروپیگنڈا مہم کہیں ملک کو کمزور کرنے کی سازش تو نہیں؟

انہی حالات کو دیکھ کر ہم نے دینی مدارس کے بارے میں اس زہریلے پروپیگنڈے کے جواب میں لکھنے کا فیصلہ کیا۔ یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ دینی مدارس کے خلاف یہ پروپیگنڈا مہم کہاں کہاں سے چل رہی ہے؟ اس کا سرچشمہ کہاں ہے؟ دینی مدارس کے طلبہ اور علماء کے خلاف سازشوں کے تانے بانے کہاں بنے جا رہے ہیں؟ ان کو نقصان پہنچانے کی ناپاک جسارت کہاں سے کی جاتی ہے؟ مدارس اور ان سے وابستہ افراد کو کیوں تضحیک کا نشانہ بنایا جاتا ہے؟ داڑھی، ٹوپی اور پگڑی کو کیوں دہشت کی علامت بنا دیا گیا ہے؟ خیر کے مراکز کو دہشت گردی کے اڈے ثابت کرنے کی کیوں کوشش کی جا رہی ہے؟

میں یہ بھی بتاتا چلوں گوناگوں مصروفیات کی وجہ سے شاید یہ کتاب لکھنے میں مزید تاخیر ہو جاتی لیکن اس کا سبب یہ بنا کہ 2005ء میں جامعہ کراچی کی لائبریری میں ہماری ملاقات انگلینڈ سے آئی ہوئی اینی (Anney) سے ہوئی۔ انہیں ''پاکستان میں دہشت گردی اور دینی مدارس'' (Terrorism & Islamic Seminary in Pakistan) پر مقالہ تیار کرنا تھا۔ میرے استفسار پر انہوں نے بتایا: ''میں انٹرنیشنل کرائسز گروپ (International crises studies) اور انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز (Institute of policy studies) کی مرتب کردہ مختلف رپورٹوں سے اپنا مقالہ تیار کر رہی ہوں۔ یہ سن کر مجھے حیرت کا جھٹکا لگا یہ کون سا طریقہ ہے؟ آپ 2005ء میں دینی مدارس اور دہشت گردی کے موضوع پر ریسرچ کر رہی ہیں لیکن آپ جن رپورٹوں سے مدد لے رہی ہیں بلکہ لفظ بہ لفظ ترجمہ کر رہی ہیں وہ تو سالوں پرانی اور نا انصافی پر مبنی ہیں۔ ان رپورٹوں میں لکھے مدارس اور روئے زمین پر موجود مدارس میں بعد

المشرقین ہے۔ آپ پروپیگنڈے کو حقائق سمجھ رہی ہیں۔ کچھ تو خدا کا خوف کریں۔ میں نے اینی سے کہا: ''پھر آپ جیسوں کے مقالوں اور رپورٹس کی روشنی میں ہی مغرب میں دینی مدارس اور علماء کے حوالے سے پالیسیاں بنتی ہیں جس کے بعد ازاں نتائج کشیدگی، دوری اور نفرت کی صورت میں نکلتے ہیں۔ اس کا ذمہ دار آپ جیسے لوگ نہیں تو اور کون ہے؟''

انگلینڈ سے آئی ہوئی ''اینی'' نے تھوڑی دیر سوچا اور پھر میری بات سے اتفاق کرتے ہوئے اپنا سر اثبات میں ہلایا۔ میں نے کہا: ''کیا ہی اچھا ہو آپ کم از کم کراچی ہی کے دو تین دینی مدارس کا بچشم خود مشاہدہ کرلیں۔ زمینی حقائق دیکھیں۔ ہمارے ہاں کہا جاتا ہے: ''لیس الخبر کالمعاینہ'' محض خبریں، سنی سنائی باتیں اور حقیقت سے کوسوں دور ٹھنڈے کمروں میں بیٹھ کر مرتب کردہ رپورٹیں، مشاہدے کے مساوی ہرگز نہیں ہوسکتیں۔'' کراچی کے دو بڑے جامعات کا دورہ کرنے کے بعد ''اینی'' نے اپنا مرتب کردہ مقالہ نظر ثانی کے لیے علیحدہ کردیا اور اس کے ساتھ ساتھ دینی مدارس کے بارے میں اس کا نظریہ بھی بدل چکا تھا۔ ہم نے یہ کتاب ''دینی مدارس: دہشت گردی کے اڈے یا خیر کے مراکز؟'' ایسے ہی لوگوں کے لیے لکھی ہے۔

اس کتاب میں فائیو اسٹار ہوٹلوں کے پُرتعیش کمروں میں رہائش پذیر کرائے کے ریسرچ اسکالرز کی اپنی فائلوں کا پیٹ بھرنے اور پھر ان نام نہاد محققانہ رپورٹیں پر شور وغوغا مچانے اور غل غپاڑہ کرنے والوں کے لیے مسکت جواب ہے۔ مغرب اور مغرب زدہ لوگوں کے زہریلے پروپیگنڈے کا توڑ اور تریاق ہے۔ اس کتاب میں 108 بڑے اہم مدارس اور 58 خانقاہوں کا جامع تعارف اور 40 صفحات پر مشتمل نایاب تصاویر بھی ہیں۔ آخر میں مدارس کے موضوع پر 115 فارسی، انگریزی، عربی اور اردو کتابوں کی فہرست بھی دی گئی ہے، تاکہ اس موضوع پر مزید تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے سہولت ہو۔

مجھے اُمید ہے اس کتاب کو تعصب کی عینک اُتار کر پڑھا جائے تو ''اینی'' کی طرح بہت سے اپنے نظریات تبدیل کرنے پر مجبور ہوں گے۔ جس طرح ٹونی بلیئر کی سالی نے اسلام قبول کرنے کے بعد کہا ہے: ''میں نے مسلمانوں کو مغربی پروپیگنڈے کے مقابلے میں بہت مختلف

پایا۔'' اگر چہ پروپیگنڈے کے اس دور میں یہ ایک چھوٹی سی کاوش ہے۔ ''گوئبلز'' کے روحانی جانشینوں کے مقابلے میں یہ ایک ادنیٰ سی سعی ہے، لیکن فرض تو بہر حال پورا کرنا ہے۔ چنانچہ میں اپنا فرض نبھا رہا ہوں۔ آپ بھی اپنا فرض نبھائیے۔ مدارس کے خلاف پروپیگنڈا کرنے والوں تک یہ کتاب پہنچائیے۔ کسی ایک فرد کا نظریہ بھی مدارس کے بارے میں تبدیل ہوگا تو میں اسے اپنی کامیابی سمجھوں گا۔

انور غازی، کراچی

27/10/2010

تقریظ

ویل ڈن انور غازی

(عطاء الحق قاسمی)

میں ''جنگ'' اخبار میں انور غازی کے کالم کے ساتھ ان کی تصویر دیکھتا ہوں تو وہ مجھے بہت کم عمر دکھائی دیتے ہیں اور جب ان کی تحریر پڑھتا ہوں تو وہ مجھے اپنے بزرگ لگنے لگتے ہیں۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ خصوصاً آج کل کے دور میں کہ کوئی نوجوان مطالعہ کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لے۔ یہ تاثر ان کے کالموں کے مطالعے کے دوران ذہن میں اُبھرتا ہے اور قاری محسوس کرتا ہے کہ اسے راستہ دکھانے والا بے علمی کے اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں نہیں مار رہا بلکہ وہ علم کی مشعل تھامے اس کے آگے آگے چل رہا ہے۔

بعض لکھنے والوں کو علمی بدہضمی بھی ہو جاتی ہے اور وہ کھٹے ڈکار لینے لگتے ہیں۔ علم اگر حلق سے نیچے نہ اُترے تو تحریر میں بھی جذب نہیں ہوتا بلکہ وہ کسی پکوان میں رچا بسا ہونے کے بجائے اوپر اوپر تیرنے والے مصالحے کی طرح ہوتا ہے۔

انور غازی علم کو ہضم کرنا جانتے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنی تحریر کو حتی الامکان بوجھل نہیں ہونے دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ میں ''کارزار'' کے عنوان کے تحت شائع ہونے والے ان کے کالم بہت باقاعدگی اور بہت شوق سے پڑھتا ہوں اور دل سے ہر مرتبہ ''اللہ کرے زور قلم اور زیادہ'' کی دُعا نکلتی ہے۔ ویل ڈن انور غازی! اسی لگن کے ساتھ لکھتے رہو۔ ابھی راستے میں اور بہت سی کامیابیاں تمہاری منتظر ہیں۔

عطاء الحق قاسمی، لاہور

یکم مارچ 2010ء

تقریظ

چار خوبیاں

(جاوید چودھری)

انور غازی صاحب کی تحریر میں پختہ کار اور بزرگ لکھنے والوں کی پختگی اور ندرت پائی جاتی ہے۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے خیالات کی روانی کے ساتھ زبان و بیان کی قدرت اور اچھوتے موضوعات کے انتخاب کا سلیقہ بھی دے رکھا ہے۔ ہمارے زیادہ تر لکھاری کسی نہ کسی فکری اور ادبی معذوری کا شکار ہوتے ہیں۔ بعض لوگ موضوعات کے انتخاب میں لاجواب ہوتے ہیں لیکن ان کے خیالات میں روانی نہیں ہوتی۔ بعض لوگوں کو اللہ تعالیٰ خیالات کی روانی سے مالا مال کر دیتا ہے لیکن ان کے پاس الفاظ کا ذخیرہ نہیں ہوتا۔ بعض لوگ انتہائی خوبصورت زبان لکھ سکتے ہیں لیکن وہ موضوعات کے انتخاب میں بہت اناڑی ہوتے ہیں۔ دنیا میں بہت کم لکھاری ایسے ہوتے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ ان تینوں صلاحیتوں سے نوازتا ہے اور وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی اس نوازش کو امانت سمجھ کر اس سے مثبت اور بہتر کام لیتے ہیں۔ انور غازی صاحب کا شمار اردو لکھنے والے ان چند اصحاب قلم میں ہوتا ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے ان تینوں صلاحیتوں سے نواز رکھا ہے۔

میں نے جب بھی ان کی تحریر پڑھی تو مجھے اس میں دلچسپی اور تاثر نظر آیا۔ اچھی تحریر کی ایک اور خوبی اس کا تاثر ہوتا ہے۔ جب کوئی پڑھنے والا کوئی تحریر پڑھنے کے بعد پانچ دس منٹ کے لیے خاموش بیٹھ جائے تو اس کا مطلب ہوتا ہے لکھنے والے نے پڑھنے والے کے جذبات کو اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ میں نے جب انور غازی صاحب کی تحریریں پڑھیں تو میں ان کے تاثر میں گم ہو گیا اور میں کئی منٹ تک ساکت بیٹھا رہا۔ یہ ان کی تحریروں کی چوتھی خوبی ہے۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں انور غازی اسی لگن اور جذبے کے ساتھ کام کرتے رہیں اور اللہ تعالیٰ انہیں اس پلیٹ فارم پر پہنچا دیں جہاں سے وہ لاکھوں لوگوں سے مخاطب ہوں اور لوگ ان کی تحریروں اور خیالات سے مستفید ہوں۔

جاوید چودھری، اسلام آباد

تقریظ

عہدِ گم گشتہ کی ہوا کا جھونکا

(اوریا مقبول جان)

مدینہ، کوفہ، دمشق، بغداد اور دنیائے اسلام کے ہر طبقہ شہر میں میں چند بوریہ نشین ایسے ضرور موجود ہوتے تھے جن کے ساتھ چٹائی پر بیٹھ کر آپ اپنے زمانے کے کسی بھی علم پر گفتگو شروع کریں، آپ کے لاینحل سوالوں کا جواب انہیں کے علمی سرمائے سے حل ہوتا تھا۔ علم الابدان ہو یا یونانی فلسفہ، ستاروں کی گزرگاہوں کا ادراک ہو یا زمین پر بدلتے موسموں کا علم...... یہ لوگ ان سب پر ایسی دسترس رکھتے تھے کہ اس علم کے ماہرین بھی انگشت بدنداں رہ جاتے۔ صدیوں ان بوریہ نشینوں کے علم کا سکہ پوری دنیا پر چلتا رہا، لیکن جو بات ان میں قابلِ ذکر تھی اور جو انہیں ممیز و ممتاز کرتی تھی وہ یہ کہ وہ نہ ان فلسفوں سے مرعوب تھے اور نہ ہی ان تہذیبوں کی چکا چوند ان کی آنکھوں کو چندھیا سکتی تھی۔ یہ تو وہ لوگ تھے جن کے علم کی روشنی اور جن کے کردار کی مشعل ان تہذیبوں کو ماند کر رہی تھی۔ یہ ہمارے معاشرے کے معزز ترین اور محترم لوگ ہوا کرتے تھے جن کے مدرسے وہ یونیورسٹیاں تھیں جہاں سے تاریخ، فلسفہ، طب، کیمیا، طبیعات، فلکیات اور ارضیات جیسے مضامین کی طرحیں بدلیں اور سوچیں متعین ہوئیں۔

ہم اس دورِ زوال کے رہنے والے ہیں جہاں عوام کا رُخ تو مغرب کی چکا چوند روشنیوں کی طرف ہو ہی چکا تھا کہ یہ صدیوں کی غلامی کا ثمر تھا لیکن اگر کوئی یادِ ماضی کو دہرانا چاہتا اور اس قصۂ پارینہ کی لذت اُٹھانے کے لیے ان چٹائیوں، مدرسوں اور مکتبوں کی جانب دیکھتا تو وہاں بھی اسے عسرتِ فکر کا سامنا ہوتا۔ بس اپنے گزشتہ ماضی سے لپٹے اور انہی علوم تک محدود، جوان مشعل بردار بوریہ نشینوں نے انہیں ورثے میں دیے تھے۔ ایسے میں میرے جیسے ماضی پرست شخص کے دکھ کا اندازہ کیجیے جس کی ساری اُمید ہی ان خاک نشینوں سے وابستہ ہو لیکن ایک عالمِ حیرت بھی کبھی کبھی

انسان کی زندگی میں در آتا ہے۔ کئی سال تک میں ایک شخص سے ٹیلی فون پر مخاطب رہا۔ کبھی تعارف کرانے والا کہتا: ''مولانا انور بات کریں گے۔'' اور کبھی خود ان کی بڑے ادب سے لتھڑی ہوئی آواز آتی: ''انور بول رہا ہوں۔'' سلام کا انداز وہی جو ان مدرسوں کی تربیت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ایسا تو سارے مولانا ہی کر لیتے ہیں۔ تہذیب تو انہیں دین سکھا دیتا ہے لیکن اس سے آگے یہ لوگ اپنے آباواجداد کی طرح دنیا بھر کی تاریخ اور فلسفہ پر عبور حاصل کر کے اس کا توڑ نہیں کرتے۔ کوئی غزالی جنم نہیں لیتا کہ ''تہافتہ الفلاسفہ'' لکھے۔

ایسے میں آپ کو کوئی ایسی تحریر پڑھنے کو مل جائے جس میں نثر کی وہ ساری خوبیاں موجود ہوں جو ایک منجھے ہوئے قابلِ ذکر نثر نگار میں ہوتی ہیں تو آپ چونکتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ یقیناً یہ کوئی یونیورسٹی میں اُردو ادب کا ذہین ترین طالب علم رہا ہوگا۔ افسانے لکھتا ہوگا یا نثر پارے تحریر کرتا ہوگا۔ پڑھنا شروع کریں تو ایسا لگے جیسے دنیا بھر میں ہونے والے واقعات، ان کے محرکات، ان کا سیاسی پس منظر اور تاریخی پیش منظر سارا یوں آپ کی نظروں میں گھوم جائے جیسے آپ نے اس مضمون پر دنیا بھر کے پرنٹ میڈیا کی ورق گردانی کر لی ہو اور اس موضوع پر گزشتہ ادوار کی گزری ساعتیں بھی گن لی ہوں۔

ایسے میں آپ یقیناً سوچیں گے کہ یہ شخص مغربی یونیورسٹی میں متعین کوئی استاذ ہے یا وہاں کا کوئی گریجویٹ۔ اور نہیں تو کوئی ایسا کہنہ مشق صحافی ضرور ہے جس کی عمر عالمی معاملات کو پڑھتے اور لکھتے گزری ہے لیکن کیا کریں مولوی آخر مولوی ہوتا ہے۔ اپنی روایت سے بندھی داستانوں، قصیدوں، قصوں اور حکایتوں کو نہیں بھولتا۔

میں بھی شاید انور غازی اور مولانا انور کو دو الگ الگ شخصیتیں سمجھتا اگر مجھے ان کے کالموں میں عرب شاعروں کے قصیدے، اسلاف کی حکایتیں اور مسلمانوں کے گزشتہ ماضی سے وابستہ داستانیں نہ ملتیں۔ لیکن یہ میرے لیے عالمِ حیرت ہے کہ اگر یہ مولانا انور ہیں تو ان کی دسترس دنیا میں ہونے والے واقعات، ان کی اصل جہت اور پس منظر تک کیسے ہے؟ ایسا تو کوئی ماڈرن زبان میں Political Analysist یعنی سیاسی تجزیہ نگار ہی کر سکتا ہے اور وہ بھی کثیر المطالعہ ہو اور اگر

یہ انور غازی ہیں تو پھر لبید سے لے کر امراء القیس تک کے اشعار اور صحاحِ ستہ سے لے کر آج تک کے دینی افکار یہ سب ان کالموں میں کیسے آ گیا؟

مجھ جیسے کوتاہ نظر شخص کو یہ بات بہت دیر سے سمجھ آئی کہ یہ مولانا انور تو اسی گمشدہ روایت کا امین ہے، انہیں بوریہ نشینوں کا وارث ہے جن کی دسترس میں تمام قدیم وجدید علوم ہوتے تھے اور وہ نہ تو ان سے کبھی مرعوب ہوئے اور نہ اپنے ماضی پر شرمندہ۔ وہ تو خم ٹھونک کر کھڑے ہو جاتے تھے اور ان کے علم کے آگے کسی کی شمع نہ جل سکتی تھی۔ میرے ''مولانا انور غازی'' وہ ہوائے تازہ کا جھونکا ہے جو ایک طرف تو کوفہ، بغداد، دمشق، نیشاپور اور دیوبند کے بوریہ نشینوں کے علم کی خوشبو لے کر آیا ہے تو دوسری طرف شیکسپیئر، ڈاکنز، ہارڈی، جین آسٹن، جارج ایلیٹ، ورڈز ورتھ، شیلے، بائرن اور براؤننگ جیسے دیوقامت قلمکاروں کے اندازِ تحریر کی ایک جھلک معلوم ہوتی ہے۔ یہ میرے جیسے معاملہ ناشناس لوگوں کو حیرت میں تو ضرور ڈال دیتا ہے لیکن میں اس حیرت پر خوش ہوں، شاد ہوں اور پُر امید ہوں۔

اوریا مقبول جان، لاہور

تقریظ

اللہ نظر بد سے بچائے......

(مولانا سید عدنان کاکاخیل)

میں جب بھی ان سے ملتا ہوں تو ایک بات اکثر کہتا ہوں: "خدارا! بسیار نویسی سے باز آؤ، کم لکھا کرو۔" مگر کوئی نصیحت ان پر کارگر ثابت نہیں ہوتی۔ ہر تھوڑے عرصے بعد ایک نئی کتاب کا مسودہ لیے کھڑے ہوتے ہیں کہ اس پر چند جملے لکھ دو۔ خدا جانے ان کو مواد کہاں سے مل جاتا ہے؟ پھر ترتیب وشواہد کے جاں گسل مراحل کیسے چشم زدن میں طے ہوتے ہیں اور آناً فاناً ہم پر تقریظ لکھنے کی ناگوار خدمت کیسے آن پڑتی ہے؟ ہم سے تو کبھی متواتر دو مہینے بھی جم کر اپنا ہفتہ وار کالم نہ لکھا گیا۔ ایک ہفتہ لکھتے ہیں تو پھر دو ماہ چھٹی اور یہ ہیں کہ...... اللہ نظر بد سے بچائے...... لکھے ہی چلے جارہے ہیں۔ لکھے ہی چلے جارہے ہیں۔

میں نے تو ان کو بہت ڈرایا ہے۔ خاصا خوفزدہ کیا ہے کہ زیادہ لکھنے والے زیادہ غلطیاں کرتے ہیں۔ ان کے قارئین اکتا جاتے ہیں، وغیرہ وغیرہ...... مگر ان پر خاطر خواہ اثر نہیں ہوا۔ اب قارئین کے ذمہ ہے کہ اگر وہ انور غازی کی کتابوں کے انبار تلے دبنا نہیں چاہتے تو جس قدر حوصلہ شکنی ممکن ہے کریں تاکہ ہم اگلے چند مہینے کسی بھی "کتابی حملے" کے امکان سے محفوظ و مامون گزار سکیں۔ بصورت دیگر تیار رہیں کہ ابھی آپ اس کتاب کو ختم نہ کر پائے ہوں گے کہ موصوف ایک نئی تصنیف لطیف لیے پھر آپ کے سر پر کھڑے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کی حفاظت فرمائے۔

باقی رہا موضوعِ سخن تو آپ نے کتاب کے فلیپ پر سوالات تو پڑھ لیے ہوں گے اور ان کے جوابات جاننے کے لیے دل مچل رہا ہوگا تو پھر بسم اللہ کیجیے۔ کتاب بڑی خوبصورتی سے آپ کے دل و دماغ کی گرہیں کھولتی چلی جائے گی، ان شاء اللہ!

سید عدنان کاکاخیل

کلیۃ الشریعہ، جامعۃ الرشید، کراچی

30 اکتوبر 2010

تقریظ

کردار کا غازی

(ڈاکٹر عامر لیاقت حسین)

علامہ محمد اقبالؔ نے خود فراموشی کی نجانے کس کیفیت کے زیر اثر کہا تھا کہ

اقبال بڑا اُپدیشک ہے، من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا یہ غازی تو بنا، کردار کا غازی بن نہ سکا

یہ تو خیر اقبال کی حد سے بڑھی ہوئی عاجزی اور انکساری کا مظاہرہ تھا مگر میرے دوست اور کرم فرما ''انور غازی'' صرف نام یا گفتار ہی کے نہیں بلکہ کردار کے بھی غازی ہیں اور قلم کے مجاہد ہیں۔ اُن کا یہ قلمی جہاد پانچ برسوں سے جاری ہے اور کارزار ادب وصحافت میں انہوں نے اپنے آپ کو کھپایا ہے۔ من باتوں میں موہ لینے کا ہنر بھی انہیں خوب آتا ہے۔ دینی وادبی حلقوں میں ان کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ان کے فن پر کوئی رائے زنی کرے اس کی بھی انہیں احتیاج نہیں مگر اصرار تھا مجھ سا عاجز اُن کی نئی آنے والی کتاب پر کچھ تاثرات رقم کرے۔

بے شک ان کی تحریر میں سلاست وروانی ہے، دینی حمیت ہے، ادبیت ہے اور ایک ایسی نثری چاشنی ہے کہ قاری اس میں کھو کر رہ جاتا ہے۔ یہ ان کی پہلی قلمی کاوش نہیں بلکہ اس سے پہلے ان کے کئی سفرنامے اور مختلف النوع تصانیف زیور طباعت سے آراستہ ہو کر قارئین سے پسندیدگی کی سند وصول کر چکی ہیں۔ مجھے ان کا ایک سفرنامہ ''حرمین کا مسافر'' پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ یوں تو حرمین شریفین کے حوالے سے میں نے کئی سفرنامے پڑھے ہیں لیکن ''حرمین کا مسافر'' ایک ایسا سفرنامہ ہے جس میں بعض روحانی تجربات کچھ اس طرح بیان ہوئے ہیں کہ جنہیں پڑھ کر بلا مبالغہ مجھ پر رقت طاری ہو گئی اور میں انور غازی کی ادیبانہ صلاحیتوں، اخلاص دینی اور تجرباتِ روحانی کا قائل ہو گیا۔

اسی دوران مختلف اخبارات میں شائع ہونے والے ان کے مضامین زیر نظر آئے اور بہت

جلد میں ان کا قدردان بن گیا۔ ان کی جس بات نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ ہے اسلامی نشاۃ ثانیہ کے لیے ان کا اخلاص۔ یوں تو ان کی سب ہی تحریریں قابل ستائش ہیں مگر دینی موضوعات پر ان کی نگارشات کا انداز ہی الگ ہے۔ مذہبی ماحول میں ادب وعقیدت میں ڈوب کر بڑے بڑے علمی اور دینی حقائق وہ اس خوبصورتی سے لکھتے ہیں کہ انہیں پڑھ کر دل ودماغ کی گرہیں کھلتی چلی جاتی ہیں اور جدید فلسفے سے آئی ہوئی فضاؤں میں روایتی قدامت پسندی کی ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگتی ہیں اور گھٹن زدہ ماحول میں دین ودانش کا ابر باراں برسنے لگتا ہے۔

مجھے یقین ہے یہ کتاب طالبانِ علم اور تشنہ طلب محققین کے لیے عظیم رہنمائی اور ہمارے علمی، دینی اور ادبی لٹریچر میں ایک گرانقدر اضافے کا باعث بنے گی۔ دینی وادبی حلقے اس کا گرم جوشی سے خیر مقدم کریں گے۔ دِلی دعا ہے مصنف اسی طرح کی تعمیری، تحقیقی، فکر ونظر اور جہد وعمل کو جلا بخشنے والی علمی خدمات سرانجام دیتے رہیں۔

ڈاکٹر عامر لیاقت حسین، کراچی

10/3/2010

تقریظ

کتابوں کا چشمہ

(مفتی فیصل احمد)

ہم عصروں کی کوششوں کو سراہنا نفسیاتی طور پر ایک مشکل امر ہے۔ خصوصاً جبکہ وہ ہم عصر، ہم پیشہ ہی نہیں ہم پیالہ اور ہم نوالہ بھی ہو۔ مگر کچھ لوگ ایسی غیر معمولی صلاحیت اور صفات کے مرقع ہوتے ہیں کہ ان کو سراہے بغیر چارہ نہیں رہتا۔ انور غازی...... جن کے ساتھ مولانا کا سابقہ اور ایم اے کا لاحقہ لگا ہوا ہے...... بھی اسی قسم کی طلسماتی شخصیت ہیں جن کے اوصاف دن بدن نکھرتے چلے جارہے ہیں اور ان کی صلاحیتوں کا اعتراف اب ''مجبوری'' بن چکا ہے۔ غازی صاحب کا زرخیز ذہن، وسیع مطالعہ، قارئین کی ضروریات سے آگاہی، بے تکلف اندازِ تحریر اور دین و دنیا کے ضروری فنون سے آراستگی انہیں ہر دلعزیز بنا چکی ہے۔ پھر...... قسمت بھی ان پر مہربان ہے۔ انہیں اللہ تعالیٰ نے نادر اور ضروری موضوعات پر کام کرنے کی توفیق دی ہے۔ ان کے متنوع کالم اس بات پر شاہد عدل ہیں۔ زیر نظر کتاب بھی ایسے ہی نادر و نایاب موضوع پر ہے۔ جس کے معرکۃ الآراء ہونے میں کوئی کلام نہیں ہوسکتا۔

پروپیگنڈے کے اس دور میں مدارس کے حوالے سے جو منفی تاثر پیدا ہو چکا ہے، اس میں غیر جانبدار اور معتدل لوگ بھی غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ الیکٹرونک میڈیا پر بیٹھے ''محققین'' جنہوں نے آج تک کسی مستند مدرسے کی عمارت میں قدم بھی نہیں رکھا ہوتا، مدارس کے حوالے سے ''حقائق'' کے انبار لگا کر تحقیق و اعتدال کا خون کرتے رہتے ہیں۔ مغرب سے مفادات کا خوگر ہر شخص مدارس کے خلاف زہر اگلنے کو بطور فیشن اپنا چکا ہے۔ کسی نقاد کو تنقید کے اصول یاد نہیں رہتے۔ کسی محقق کو تحقیق کی ابجد بھی یاد نہیں آتی۔ کسی روشن خیال کو تعصب کی تاریکی کا احساس نہیں ہوتا اور سامعین و قارئین کو تشویش میں ڈال دیا جاتا ہے۔ ایسے میں ضروری تھا کہ مناظرانہ رویے سے دامن بچاتے ہوئے صرف تصویر کا صحیح رخ دکھانے کی کوشش کی جائے۔ مدارس اپنی ایک تاریخ

رکھتے ہیں۔ ان کی تاریخ اور حال سے پردہ اٹھنا ہی ان کی صفائی کے لیے بہت کافی ہے۔ انور غازی صاحب نے موضوع اور اس حوالے سے فوری طور پر ذہن میں آنے والے سوالوں کے اکثر پہلوؤں کا بھرپور جائزہ لے لیا ہے۔ موضوع سے متعلق کتابیات اور ماخذ کی تفصیل بھی دیدی ہے۔ یوں ہر طرف روشنی کی کرنیں پھوٹ پڑی ہیں اور اب کسی تنگ نظر کو ''اندھیرے'' کی شکایت کا موقع نہیں ہے۔ اب اگلے مرحلے میں ایک ایک پہلو پر تفصیلی کام ہونا چاہیے۔ امید ہے کہ آگے چل کر اس سے بہت سی نئی کتابیں نکلیں گی۔ یوں انور غازی کی اس کتاب کو اس موضوع پر ''کتابوں کا چشمہ'' کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ دعا ہے جس مقصد اور جذبے سے یہ کتاب لکھی گئی ہے اسے بارگاہِ الٰہی میں شرف قبولیت اور دنیا میں مقبولیت عطا ہو۔

فیصل احمد، منتظم اعلیٰ و مفتی

دارالافتاء برائے مالیاتی و تجارتی امور (SCS) کراچی

28-10-2010

تقریظ

آرٹس سے سائنس تک

(جمال عبداللہ عثمان)

مختلف اور قسماقسم موضوعات پر لکھنا شاید اتنا مشکل نہ ہو جتنا کسی ایک موضوع پر تمام جزئیات کے ساتھ مواد اکٹھا کر کے اسے کتابی قالب میں ڈھالنا جان جوکھوں کا کام ہے۔ میری نظر میں، ایک ہی کتاب میں کئی موضوعات کو لے کر چلنا اس لیے زیادہ مشکل نہیں کہ ذہن کے نہاں خانوں میں جو جو آئیڈیاز، جو جو نظریات آئیں، انہیں قرطاس پر منتقل کرنا ہوتا ہے۔ جبکہ کسی خاص موضوع پر کتاب لکھنے کے لیے سیکڑوں کتابیں پڑھنا پڑتی ہیں۔ بعض اوقات ایک ایک جز کے لیے کئی کئی گھنٹے صرف کرنا پڑتے ہیں۔ بالکل ایسے ہی جس طرح ایک پی ایچ ڈی کسی ایک جز، شخصیت یا کارنامے کو لے کر اس پر پورا مقالہ لکھتا ہے۔ وہ اس کے لیے بیسیوں لائبریریوں کی خاک چھانتا ہے۔ دسیوں اہلِ علم سے ان کی رائے معلوم کرنے دور دراز کے سفر کرنے نکلتا ہے۔ پھر ممکن ہے ہزاروں صفحات، لاتعداد لائبریریوں اور اہلِ علم کے سرمائے کو کوئی بھی محنتی شخص بھاگ دوڑ، محنت اور جانفشانی سے اکٹھا کرنے کا کارنامہ انجام دے دے، لیکن اس علم کو اپنے الفاظ کے قالب میں ڈھالنا اور اس طرح ڈھالنا کہ پڑھنے والا عش عش کر اُٹھے، کسی بڑے فنکار ہی کا کام ہے۔

انور غازی صاحب کو اللہ تعالیٰ نے یہ ملکہ عطا فرمایا ہے کہ وہ کسی بھی کتاب کو پڑھ کر نہ صرف اس سے بہترین عطر نکالنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، بلکہ نئے نئے آئیڈیاز بھی ان کے ذہن میں آجاتے ہیں۔ کسی بھی اہلِ علم کی چند منٹ کی گفتگو سن کر اس سے وہ ایسے ایسے نکتے نکال لاتے ہیں کہ بندہ حیران ہو جاتا ہے۔ گویا نقطے میں نکتے نکالنے میں ماہر ہیں، لیکن اس وقت ان کی جس خوبی کی طرف ہم نشان دہی کرنا چاہ رہے ہیں اس کی مثال آپ یوں سمجھ لیجیے۔ ایک بچہ آٹھویں جماعت تک پڑھتا ہے۔ اس کے بعد اسے سائنس یا آرٹس میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوتا





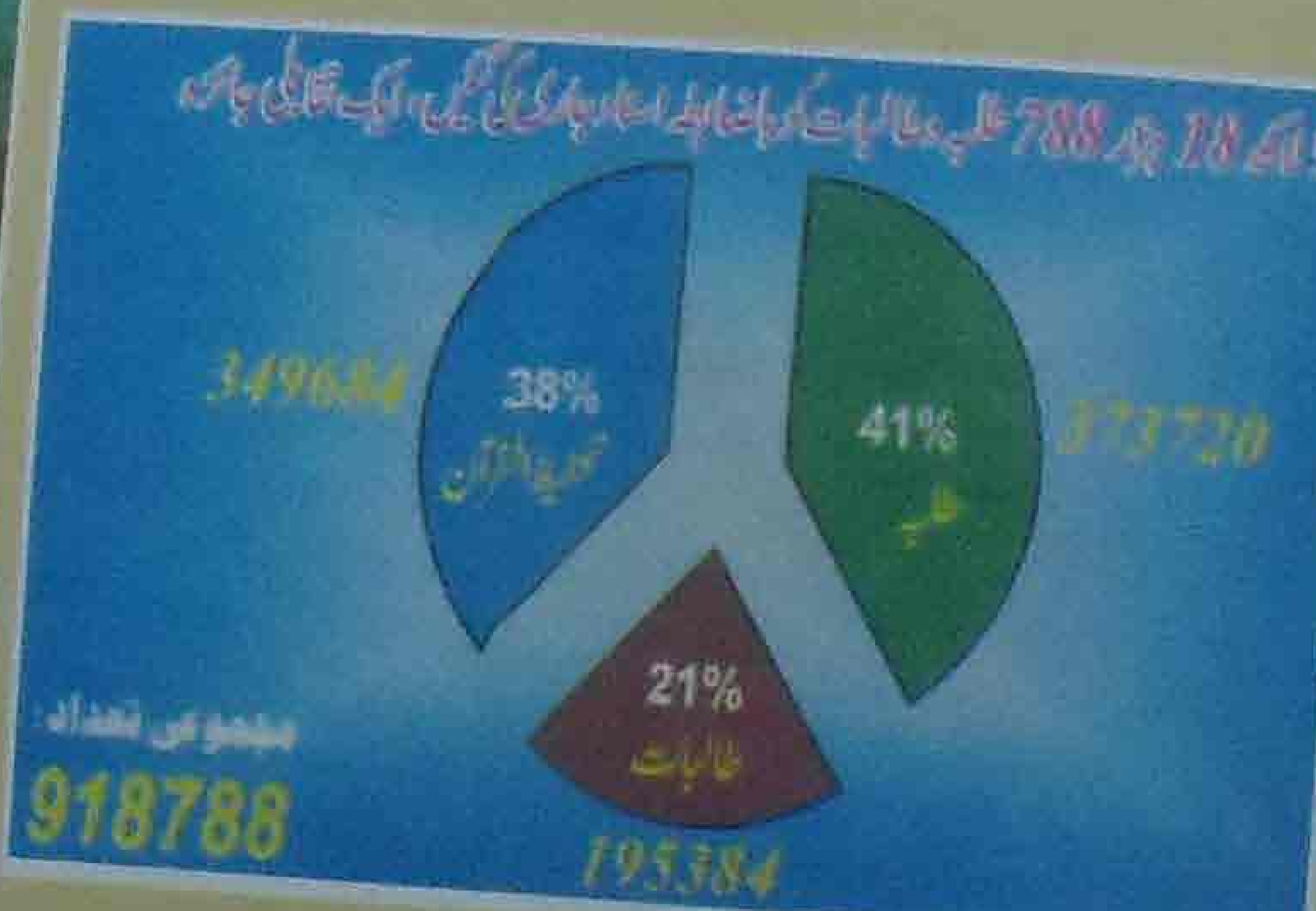
وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے مرکزی دفتر کے اندرونی حصے کے مناظر۔ وفاق کی 53 سالہ کارکردگی، مختلف النواع خدمات اور کروڑوں کے اخراجات کو سامنے رکھا جائے تو ان ''سادگیوں'' کے ساتھ اتنی اعلیٰ کارکردگی پر حیرت ہوتی ہے۔ اور یہ کہے بغیر چارہ نہیں رہتا۔

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ





یہ گراف 2004ء تک کے اعداد و شمار کے آئینے میں بنایا گیا ہے۔ اب یہ تعداد تقریباً دوگنی ہو چکی ہے۔





گزشتہ چند سالوں میں مدارس کی شاندار تعلیمی و تربیتی کارکردگی کا اندازہ اس گراف سے لگایا جا سکتا ہے۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ گزشتہ عشروں میں مدارس کے خلاف مغربی میڈیا کی ہمہ گیر مہم کی وجہ سے ان کی مقبولیت اور ان کی طرف طلبہ کے رجوع میں کمی آئی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ پہلے اگر دیندار گھرانوں کے بچے مدارس میں زیادہ نظر آتے تھے تو اب پوش علاقوں اور کالجوں اور یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ طلبہ کی بڑی تعداد مدارس کا رخ کر رہی ہے۔

وفاق المدارس العربیۃ پاکستان



وفاق المدارس العربیہ پاکستان کی عمارت کا بیرونی منظر۔ اس سے پندرہ ہزار سے زائد مدارس منسلک ہیں۔
یہ مختصر سی عمارت اس امر کی شاہد ہے کہ دلوں میں اخلاص اور کام کی لگن ہو تو فقیری میں بھی نام پیدا کیا جاسکتا ہے۔

ہے۔ آرٹس میں بے شمار درجہ بندیاں ہیں۔ آپ کے سامنے سیکڑوں در کھلے نظر آتے ہیں۔ اس میں قدرے مشکل مضامین بھی ہیں اور انتہائی آسان بھی، لیکن اس کے مقابلے میں آپ سائنس کو دیکھ لیجیے۔

سائنس میں آپ کے سامنے چند ہی آپشن ہوتے ہیں۔ آپ ڈاکٹر بن سکتے ہیں یا پھر انجینئرنگ کے شعبے میں قسمت آزمائی کر سکتے ہیں۔ دونوں میں ناکامی کے بعد تیسرے آپشن کے طور پر سائنس کے کسی مضمون کا انتخاب کرنا ہوتا ہے، بصورتِ دیگر مجبوراً آرٹس کے بے تحاشا مضامین ہی آپ کا مقدر ٹھہرتے ہیں۔ عموماً ہوتا یہی ہے کہ سائنس میں قسمت آزمائی کے بعد مجبوراً بیشتر طالب علم آرٹس ہی کو اپنا مضمون بنالیتے ہیں۔ پھر دیکھا جاتا ہے کہ سائنس کا طالب علم آرٹس کے کسی بھی مضمون میں دوسرے طلبہ کے مقابلے میں اچھی کارکردگی دکھاتا ہے لیکن اس کے مقابلے میں آرٹس کے طالب علم پر نظر ڈالیے! اگر اس کے سامنے سائنس کے مضامین کھولے جائیں تو اس کا سر چکرانے لگتا ہے۔ وہ اس کی گتھیاں کبھی نہیں سلجھا سکتا۔ اس کے فارمولے، اس کی اصطلاحات اور تجربات اس کے ذہن میں کبھی نہیں سما سکتے۔ گویا آرٹس کے طالب علم کے لیے سائنس کے مضامین پڑھنا نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن ہوتے ہیں۔

انور غازی صاحب کو آپ اسی مثال سے سمجھ لیجیے۔ وہ ایک طویل عرصے تک ''آرٹس'' کے طالب علم رہے۔ وہ مختلف موضوعات پر لکھتے رہے۔ امریکا سے لے کر برطانیہ تک اور فلسطین سے شیشیان تک...... کون سا ملک اور کون سا موضوع ہے جو ان کے قلم کی زد میں نہ آیا ہو۔ ملک کے قومی اخبارات میں ان کے مختلف موضوعات پر سیکڑوں مضامین چھپے۔ ان مضامین کے مجموعے منظر عام پر آئے۔ یقیناً یہ مضامین اپنے عنوانات کے لحاظ سے بڑے پُراثر اور تحقیقی ہیں۔ اس تمام تر تحقیقات، اثر انگیزی اور محنت کے باوجود ''چھوٹا منہ بڑی بات'' کے مصداق یہ ان کے ''آرٹس'' کا زمانہ تھا، لیکن سب نے دیکھا اور دیکھ رہے ہیں کہ پھر یکدم غازی صاحب نے سائنس کے مضامین...... اور وہ بھی متخصص کے طور پر...... کی طرف رُخ کر لیا۔ گویا آرٹس کا طالب علم سائنس کی طرف چلا گیا۔ اہلِ علم جانتے ہیں کہ یہ نہ صرف مشکل ترین کام تھا بلکہ ناممکنات میں سے ہے

کہ آرٹس کا طالب علم سائنس کے مضامین منتخب کرلے اور پھر اس میں اعلیٰ کارکردگی بھی حاصل کرلے۔ عموماً ہوتا یہ ہے کوئی بھی شخص اپنی کسی تصنیف کی وجہ سے مشہور ہو جاتا ہے۔ اس نے اپنی تصنیف پر سائنس کی سی محنت کی ہوتی ہے لیکن پھر وہ اپنی کاہلی، سستی یا دیگر مصروفیات کے باعث آرٹس کا طالب علم بن جاتا ہے۔

سو، انور غازی اس لیے انفرادی حیثیت کے مالک ہیں کہ آرٹس کے مضامین میں تو وہ ہمیشہ اول ہی آتے رہے لیکن جب انہوں نے سائنس کے مضمون کا انتخاب کیا۔ پھر اس کا پہلا امتحان دیا تو نہ صرف اس میں کامیابی ملی بلکہ وہ آرٹس سے بھی زیادہ اچھی پوزیشن لے کر کامیاب ہوئے۔ مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ میں نے ان کی تمام کتابیں لفظ بہ لفظ پڑھیں۔ اس کتاب کو بھی حرف بہ حرف دیکھا۔ آج جبکہ مدارس مغربی دنیا کی زد پر ہیں۔ بیگانوں سے کیا گلہ، اپنے بھی خفا ہیں۔ چنانچہ ایک ایسے موضوع کو لے کر چلنا اور اس انداز سے چلنا کہ مخالف کو بھی دلائل کے ذریعے چاروں شانے چت کر دیا جائے۔ اس کتاب کو پڑھ کر میں اسی نتیجے پر پہنچا ہوں اگر کسی کو یقین نہ آئے تو ان کی تمام تصنیفات اور اس کتاب کے چند صفحے پڑھ کر بہتر اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

جمال عبداللہ عثمان

کالم نگار، روزنامہ جسارت کراچی

4/اکتوبر2010ء

تقریظ

تریاق

(عبدالمنعم فائز)

گز گز لمبی زبانیں اور یبوست سے بھرے دماغ کتنا زہر اگلا کرتے تھے؟ کہاں گئے وہ افلاطون جن کی سقراطی گفتگو کی تان مدارس کی اصلاح پہ جا کے ٹوٹتی تھی۔ مغربی تھنک ٹینکس کے بوسیدہ دماغوں کی تراوش کو حرزِ جاں بنانے والے نام نہاد مفکر اب ڈھونڈے نہیں ملتے۔ وہ بڑھ بڑھ کے کہا کرتے تھے: ''مدرسہ؟ وہ تو معاشرے کے ٹھکرائے ہوئے لوگوں کی آماجگاہ ہے۔ غریب و یتیم بچوں کا مستقبل دفن کرنے کا قبرستان اور دہشت گردی کے تمام سوتے یہیں سے پھوٹتے ہیں۔''

آج وہ بقراطیے منہ چھپائے پھرتے ہیں۔ لوگ ان سے پوچھتے ہیں: ''مانا یہاں معاشرے کے ٹھکرائے زمانے کی نیرنگیوں سے بچنے کے لیے سر چھپاتے ہیں، لیکن یہ کیا ہوا کہ ایلیٹ کلاس کے بچے بھی سفید کپڑے زیب تن کیے سر پہ ٹوپی سجائے مدرسے کی طرف بڑھے چلے آرہے ہیں؟ دہشت گردی کے سوتے یہاں سے پھوٹتے ہیں تو پھر اس سال 40 فیصد نئے داخلہ لینے والے کہاں سے آئے؟ یہ ایم اے اور پی ایچ ڈی کرنے والوں کو زندگی میں کون سا خلا محسوس ہوتا ہے کہ مدرسوں کے دامن میں آ کے پناہ لیتے ہیں؟

آئے روز کالج، اسکول اور یونیورسٹیوں میں پیپر آؤٹ ہوتے ہیں، شاید اسی قومی دھارے میں دینی مدارس کو بھی شامل کرنا چاہتے ہیں۔ ہفتہ ہفتہ یونیورسٹیاں بند رہتی ہیں شاید ایسی ہی تعلیم مدارس میں بھی شروع کرنے کی مہم عروج پر ہے۔ طلبہ کے سیاسی ونگ تو اساتذہ کو زدوکوب کرنے سے نہیں چوکتے یہی اخلاقیات مدرسہ میں بھی ہونی چاہییں؟

وفا کیشوں کو جفاکشی سے کیا ڈر؟ یہ نشہ تو ترشی سے دوآتشہ ہوتا ہے۔ مدرسہ کی چٹائی پہ بیٹھ کے

حجازی علم پڑھنے والوں کو جو سرور ملتا ہے وہ کارل مارکس اور لینن کی تھیوریوں پہ اترانے والوں کو کہاں نصیب؟ زمانے نے طعنوں سے بھرے ترکش سے نفرت کے تیر برسائے مگر ان کی پیش قدمی جاری رہی۔قدم سوئے مکتب، نظر سوئے مولا!

برادرم انور غازی صاحب کی کتابوں کی تعداد اب ایک ہاتھ کی انگلیوں سے تجاوز کرگئی ہے۔ لکھنا ان کی زندگی کا حصہ بن گیا ہے۔ان کے کالم اور تحقیقی مضامین تقریباً روزانہ کسی نہ کسی اخبار کی زینت بنتے ہیں۔زیر نظر کتاب کا ایک ایک صفحہ ان کے سوز دروں کی عکاسی کرتا ہے۔آپ نے دینی وعصری اداروں کو بہت قریب سے دیکھا۔آئے روز میڈیا پہ ہونے والے پروپیگنڈے کا گہری نظر سے جائزہ لیا اور ہزاروں صفحات کا مطالعہ کرکے ایک تاریخی دستاویز ترتیب دی ہے۔ بلاشبہ یہ کتاب مدارس کی کارکردگی، نصاب اور طریقہ کار پر تحقیق کرنے والوں کے لیے ایک گراں قدر تحفہ ہے۔تعصب کی عینک اتار کے مطالعہ کرنے والوں کو معلوم ہوگا مدارس دہشت گردی کے اڈے ہیں یا خیر پھیلانے کے مراکز؟ بلاشبہ یہ کتاب مغربی اور مغرب زدہ کالم نگاروں اور مصنفین کی طرف سے پھیلائے گئے زہریلے پروپیگنڈے کا شافی تریاق ہے۔

عبدالمنعم فائز

شعبہ صحافت، جامعۃ الرشید، کراچی

13/10/2010

دینی مدارس کیا ہیں؟

کہانی کا آغاز:

کہانی کا آغاز 1830ء سے ہوتا ہے۔ اس وقت برطانیہ کا بادشاہ ''ولیم فور'' تھا۔ برصغیر اس کے نوآبادیات میں سے تھا۔ برطانیہ ہزار جتن کے باوجود اس علاقے پر اپنا پنجہ مضبوط نہیں کر پا رہا تھا۔ آئے دن حریت و آزادی کے متوالے اس کی مشکلات میں اضافہ کرتے۔ ان کو دبانے اور ختم کرنے کے لیے ہر حربہ آزمایا جارہا تھا لیکن ہندوستان کے حالات مزید خراب سے خراب تر ہوتے جارہے تھے۔ اسی سال یعنی 1830ء میں ایک شخص برٹش پارلیمنٹ کا رکن منتخب ہوا۔ یہ مورخ، ادیب اور دانشور تھا۔

یہ 25 اکتوبر 1800ء کو برطانیہ کے ''روتھ لے ٹمپل'' میں پیدا ہوا تھا۔ اس کے والد کا نام ''رے چاری میکالے'' تھا۔ یہ ''پریسبائیٹیرین'' چرچ کے پیرو تھے اور ''کلاپھم'' فرقے سے تعلق رکھتے تھے۔ فرقہ عیسائیت کے فروغ کے لیے کی جانے والی سرگرمیوں کی وجہ سے بہت مشہور تھا۔ 1832ء میں ان کو ''ایسٹ انڈیا کمپنی'' کا قانونی مشیر بنادیا گیا۔ ان حالات میں اس کی تقرری خاصی اہمیت رکھتی تھی جبکہ آزادی کے نعرے زبان زد عام وخاص تھے اور برطانیہ کسی بھی صورت ''سونے کی چڑیا'' کو چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھا۔ کیونکہ برطانیہ عظمیٰ متحدہ ہندوستان سے سارا خام مال لوٹ کر انگلستان پہنچانا چاہتا تھا۔ چنانچہ برصغیر کے حالات کا جائزہ لینے کے لیے برٹش گورنمنٹ نے 1833ء میں اس شخص کو تمام لوازمات، سہولیات اور اختیارات کے ساتھ ہندوستان روانہ کیا۔ وہ بیوی کے ساتھ سیاح کے روپ میں ہندوستان آیا۔

برصغیر کے ہر قسم کے لوگوں سے ملا۔ ہر ایک کی رائے لی۔ مسلمانوں کے حالات کا باریک بینی سے جائزہ لیا۔ ان کا طرز زندگی دیکھا۔ ان کے کلچر کو دیکھا۔ ان کی اقدار، معاشرت، رہن سہن اور طور طریقے پر ریسرچ کی۔ ان کے خاندانی تعلقات پر گہرا غور کیا۔ ان کی تعلیمات کا باریک بینی

سے جائزہ لیا۔ بڑوں، چھوٹوں کے حقوق اور ان کی عادات واطوار دیکھیں۔ مسلمانوں کے مذہبی رہنماؤں سے ملا۔ ان کے انٹرویوز کیے۔ مساجد کے اماموں سے ملاقاتیں کیں۔ عوام کے مذہبی لگاؤ کو دیکھا۔ وہ برصغیر میں یہ دیکھ کر حیران اور ششدر رہ گیا کہ مسلمانوں میں شرح خواندگی تقریباً 90 فیصد ہے۔ باقی دس فیصد بھی ضروری دینی اور عصری تعلیمات اور اس کے تقاضوں سے آگاہ تھے۔ تمام مدارس کی کفالت اور سرپرستی حکومت کرتی ہے۔ بڑی بڑی جائیدادیں اور املاک مدارس کے لیے وقف تھیں۔ وہ تین سال تک سیاح کے روپ میں گھوما پھرا۔ رپورٹ تیار کی اور واپس انگلستان چلا گیا۔

لارڈ میکالے کی ہوشربا ءرپورٹ:

1935ء کی دوپہر اس نے برٹش ارکان پارلیمنٹ کے سامنے وہ رپورٹ پڑھی۔ اس رپورٹ کی کاپی آج بھی اورینٹل کالج لاہور کی لائبریری میں موجود ہے۔ تمہید باندھتے ہوئے اس نے لکھا:

"I have traveled across the lenght and breatdth of india and i have not seen one person who is a beggar, who is a thief. Such wealth I have seen in this country, such high moral values, people of such calibre, that i do not think we would ever conquer this country."

’’میں نے پورے ہندوستان کا سفر کیا ہے۔ اس سفر کے دوران کئی حیرت انگیز انکشافات ہوئے۔ میں نے ایک بھی بھکاری نہیں دیکھا۔ چوری ڈاکے کا تصور نہیں ہے۔ یہ علاقہ دولت سے لبالب بھرا پڑا ہے۔ مسلمانوں میں اعلیٰ اخلاقی اقدار ہیں۔ وسیع الظرف ہیں۔ یہاں کے لوگ ذہین فطین اور قابل ہیں۔ برصغیر میں شرح خواندگی تقریباً 92 فیصد ہے۔ بڑوں کا ادب واحترام ہے۔ اپنے مذہب سے گہری وابستگی ہے۔ اپنے کلچر پر مضبوطی سے عمل پیرا ہیں۔ غلامی کو وہ سب سے بڑی لعنت سمجھتے ہیں۔‘‘ اس کے بعد اس نے برٹش گورنمنٹ سے کہا: ’’میرا نہیں خیال کہ ہم ان لوگوں کو رام کر کے اس علاقے کو فتح کر سکتے ہیں۔‘‘

ایجوکیشن سسٹم میں تبدیلی:

اس رپورٹ پر برٹش حکومت نے بہت سوچ بچار کی۔ اس کے بعد یہ تہلکہ خیز رپورٹ وائسرائے ہند کو روانہ کردی گئی۔ مہینوں کے غور وفکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچے جس شخص نے اس مرض کی تشخیص کی ہے، اسی سے اس بیماری کا شافی کافی علاج بھی پوچھا جائے۔ چنانچہ برٹش گورنمنٹ نے سیاح کے روپ میں آنے والے اس شخص سے پوچھا کہ اس کا حل کیا ہے؟ ہم کس طرح اس علاقے پر اپنا کنٹرول برقرار رکھ سکتے ہیں؟ آپ اس کے علاج کی تفصیلی رپورٹ لکھ کر پیش کریں، حکومت اس پر عمل کرے گی۔ اس ذہین اور شاطر دماغ نے بڑی عرق ریزی سے مسلمانوں کو ان کی شناخت ختم کرنے کے لیے بھیانک منصوبہ تیار کیا اور حکومت کے سامنے وہ تفصیل رکھ دی۔ اس نے لکھا:

"Unless we break the very backbone of this nation, which is her spiritual and cultural heritage, and, therefore, I propose that we replace her old and ancient education system, her culture, for if the Indians think that all that is foreign and English is good and greater than their own, they will lose their self-esteem, their native self-culture and they will become what we want them, a truly dominated nation."

''جب تک برٹش گورنمنٹ مسلمانوں کی ریڑھ کی ہڈی کو نہ توڑے اس وقت تک یہ سب ممکن نہیں۔ وہ ہے ان کو روحانی اور ثقافتی طور پر مفلوج کرنا۔ ان کے طرزِ معاشرت اور زندگی کو بدلنا اور اس کے لیے ضروری ہے کہ ان کے نصاب ونظام تعلیم کو بدلا جائے۔ ان کے قدیم طرز کی تعلیم کو ختم کیا جائے۔ میں تجویز دیتا ہوں کہ برٹش گورنمنٹ فوری طور پر مسلمانوں کے ایجوکیشن سسٹم تبدیل کرے۔ اس سے کچھ عرصے میں خود بخود ان کا کلچر بدل جائے گا۔ مسلمانوں کی اپنے مذہب سے گہری وابستگی ختم کرنے کے لیے ضروری ہے جدید کلچر کو فروغ دیا جائے۔ غیر محسوس طریقے سے ایسے اقدامات کیے جائیں کہ مسلمان سمجھنے لگیں کہ ان کا مذہب، کلچر اور ثقافت پسماندہ ہے۔ وہ

انگریزی طرزِ معاشرت پر فخر کرنے لگیں۔ اپنی ثقافت، معاشرت کو گھٹیا تصور کرنے لگیں۔''
اس کا منصوبہ برٹش حکومت کو پسند آیا اور اس نے یہ بھاری ذمہ داری اسی کے کاندھوں پر ڈال دی۔ یہ شخص جلد ہی ہندوستان کے لیے نصابِ تعلیم بنانے میں مصروف ہوگیا۔ مسلمانوں کے تہذیب وتمدن کو بدلنے والے برطانیہ کے اس قانونی مشیر نے کہا: ''میں ہندوستان کے لیے ایسا نظامِ تعلیم بنا رہا ہوں جس کو پڑھنے کے بعد مسلمان بچے اگر عیسائی اور یہودی نہ بنے تو مسلمان بھی نہیں رہیں گے۔''

یہ بدنام زمانہ ''لارڈ میکالے'' (Macavlay thomas Babington) ہے جس نے مسلمان بچوں کے لیے ایسا زہریلا نصابِ تعلیم مرتب کیا جس میں مسلمانوں کی نسلِ نو کے لیے فکری اور ذہنی ارتداد کا پورا پورا سامان موجود تھا۔ اس کے بعد مسلمانوں کے ساتھ کیا کیا ہوا؟ بھول گئے وہ ساری باتیں مگر یہ نہیں بھول سکتے۔

انگریز کے قبضے کے بعد:

پس منظر کے طور پر یاد رکھیں جب ہندوستان میں انگریز آیا۔ اس نے یہاں آکر قبضہ جمایا۔ اس سے پہلے تین قسم کے مدارس اس وقت چل رہے تھے۔ ایک تو وہ مدارس تھے جنہیں اسلامی حکومت اپنی نگرانی میں چلاتی تھی۔ ان کے تمام اخراجات خود حکومت برداشت کرتی تھی۔ دوسری قسم کے مدارس وہ تھے جو اہل ثروت کی وقف کی ہوئی جائیدادوں کے ذریعے چلتے تھے۔ لوگ بڑی بڑی جائیدادیں دینی مدارس کے لیے وقف کرتے تھے۔ مدارس کے اخراجات انہی وقف جائیدادوں سے چلتے تھے۔ آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کس قدر رواج تھا اس وقت دینی مدارس کے لیے جائیدادیں وقف کرنے کا۔

خود انگریز مورخین نے لکھا ہے صرف ایک صوبہ بنگال میں دینی مدرسوں کے لیے وقف جائیدادیں پورے بنگال کی چوتھائی کے برابر تھیں۔ صرف اس صوبے میں 80 ہزار مدارس تھے۔ تیسری قسم مدارس کی وہ تھی کہ نواب، رئیس اور وڈیرے قسم کے لوگ اپنے اخراجات پر، اپنی ہی نگرانی میں چلاتے تھے۔ یوں اس زمانے میں مدارس کا ایک جال بچھا ہوا تھا۔ مسلمان علم دین

حاصل کرتے تھے۔

انگریز کے قبضے کے بعد جب اسلامی حکومتیں ختم ہوئیں تو ان کے ماتحت چلنے والے دینی مدارس بھی مٹ گئے۔اس طرح جو جائیدادیں دینی مدارس کے لیے وقف تھیں، وہ بھی انگریز نے اپنے قبضے میں لے لیں اور اس کی سرپرستی کرنے والے نواب اور رئیس قسم کے لوگوں میں سے بعض کو گرفتار کرلیا گیا۔ کچھ شہید ہوگئے۔ بعض کو انگریزوں نے اپنے ساتھ ملالیا۔ اسی طرح ان کی نگرانی میں جو مدارس چل رہے تھے وہ بھی ختم ہوگئے۔ نتیجہ یہ نکلا انگریز کے قبضہ جمانے کے بعد ہندوستان میں دینی مدارس کا بالکل خاتمہ ہوگیا۔ دس سے پندرہ سال کا عرصہ اس طرح گزرا کہ دینی مدارس کا نام ونشان مٹ گیا۔

دارالعلوم دیوبند کی بنیاد:

ایک طرف تو لارڈ میکالے اور اس کے روحانی فرزند یہ کھیل کھیل رہے تھے جبکہ دوسری طرف مسلمانوں کے ایمان اور دینی تعلیم کی سلامتی کے لیے اس وقت کے علماء وصلحا نے مل کر ''دارالعلوم دیوبند'' کی بنیاد رکھی۔ قارئین! آگے بڑھنے سے پہلے ''دارالعلوم دیوبند'' کی تاریخ پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ اس کا قیام جمعرات 15 محرم 1283ھ بمطابق 30 مئی 1866ء میں ہوا۔ اس کا قصہ بھی عجیب ہوا۔ چند دردمند مسلمان جمع ہوئے۔ ان میں حاجی عابد صاحب کا نام ذکر کیا جاتا ہے۔ انہوں نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ جب سارے ذرائع ختم ہوگئے تو اب ہمیں عوام کے چندے سے دینی مدارس کا نظام قائم کرنا چاہیے۔ لوگوں نے اس پر تعجب کا اظہار کیا اور کہا جن مدارس کو پوری پوری حکومتیں سنبھالے ہوئے تھیں وہ اب غریب عوام کے چندوں سے کیونکر چل سکیں گے؟ مگر حاجی عابد صاحب نے اصرار کیا اور سب سے پہلے اپنی جیب سے تین روپے چندہ نکالا اور دینی مدرسے کے نام وقف کیا۔ پھر دیوبند کی بستی کا چکر لگایا۔ ایک ایک مسلمان کے پاس گئے۔ شام تک تین سو روپے جمع ہوگئے۔ جو اس وقت کے لحاظ سے ایک بڑی رقم تھی۔ مدرسے کا اعلان کردیا گیا۔

اس کے بانی مولانا قاسم نانوتوی رحمہ اللہ، مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ ہیں۔ حاجی عابد صاحب دارالعلوم کے پہلے مالی معاون تھے۔ پہلے ہی دن ابتدا اپنے تین روپوں سے کی اور شام تک

اسی جھولی میں شہر بھر سے 300 روپے اکٹھے کر کے دارالعلوم کے مصارف کے لیے پہلی بنیاد فراہم کرتے ہوئے ایک عظیم صدقہ جاریہ کے اولین مستحق بن گئے۔ حاجی صاحب کی 30 سالوں تک تکبیر اولی فوت نہیں ہوئی۔ پہلے استاذ ملا محمود دیوبندی رحمہ اللہ ہیں۔ پہلے شاگرد شیخ الہند محمود حسن رحمہ اللہ ہیں۔

دارالعلوم دیوبند کے فضلائے کرام کی تعداد 1 لاکھ 75 ہزار بتائی جاتی ہے۔ دارالعلوم کے دارالافتاء کا قیام 1310ھ بمطابق 1892ء ہوا۔ اس کے کتب خانے میں 2 لاکھ کتابیں 20 زبانوں میں 100 علوم وفنون کے متعلق ہیں۔ علمائے دارالعلوم دیوبند کی تصانیف کی تعداد 12 ہزار ہے۔ ایک رپورٹ کے مطابق دنیا بھر میں 60 کتب خانے علمائے دارالعلوم دیوبند کی کتابیں شائع کرتے ہیں۔

علمائے دیوبند کی خدمات:

علمائے دیوبند کی خدمات متنوع اور ہمہ گیر ہیں جو علم وعمل کے ہر پہلو کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ علمی حوالے سے کوئی ایسا فن نہیں ہے جس پر ان بزرگوں میں سے ایک ایک شخصیت کی کثیر تصانیف کا ذخیرہ نہ ہو۔ صرف ان مصنفات کی فہرست مرتب کرنے کے لیے ایک دفتر درکار ہے جو اکابر علمائے دیوبند کے شاہکار قلم کی یادگار ہیں، جس میں ان حضرات کے علوم ومعارف کا وسیع ذخیرہ موجود ہے۔ قدیم وجدید مباحث پر براہین سے آراستہ اتنا وقیع کام کیا ہے کہ دور حاضر میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ مصنفین کے علاوہ دارالعلوم نے اعلیٰ درجے کے مدرسین، ولولہ انگیز خطیب، خشک چشموں کو رواں کرنے والے واعظین، رزم گاہ حق وباطل میں شجاعت وبسالت کے جوہر دکھانے والے مجاہدین، ناخن تدبیر سے سیاست کے پیچ وخم سلجھانے والے بے مثال مدبرین، زمانے کی امامت وقیادت کا فریضہ انجام دینے والے مفکرین پیدا کیے۔

اللہ تعالیٰ کی صفت علم کے مظہر حجۃ الاسلام امام غزالی کا خمیر وہیں سے اٹھا۔ شیخ الہند کے اعزاز کی مستحق وہی سرزمین ٹھہری۔ شیخ العرب والعجم کا آفاق وہیں کے ایک مرد قلندر کے حصے میں آیا۔ حکمت ودانائی کے موتی بکھیرنے والا الحکیم الاسلام وہیں کہیں ایک قطعہ زمین میں آسودہ خاک

حدیث رسول کی مانگ میں ستارے ٹانکنے والا سید انور شاہ کشمیری اسی خطے کے کسی گوشے میں جنت کے مزے لے رہا ہے۔ ادب کی نازک کلیوں میں نفاست کے رنگ بھرنے والا شیخ الادب اسی مکتب کی فضا سے اُبھرا اور زمانے بھر کے ادیبوں پر چھا گیا۔ دنیا کے نقشے میں اُبھرنے والی مملکتِ خداداد پاکستان کی نیم جان رگوں میں تازہ خون رواں کرنے والے عثمانی نسبتوں سے وابستہ ہستیوں کی پرورش اسی سرزمین کا احسان ہے اور وہاں احکامِ دین کے رموز واسرار سے پردے اُٹھانے والے حکیم الامت بھی وہیں طلب علم کی منزلیں طے کر چکا ہے۔

کس کس کا ذکر کریں؟ ایک سے ایک بڑھ کر اپنی ذات میں ایک مکمل دار العلوم ہے۔ ایک بھرپور لائبریری ہے۔ ان میں سے ہر ایک چلتا پھرتا کتب خانہ ہے۔ علوم ومعارف کا دریا ہے جس کی وسعتوں کا کنارہ ہے نہ ٹھکانہ۔ وہ درخشندہ ماضی کے امین، حال کے امام اور مستقبل کے لیے مینارۂ نور تھے۔ دنیا ان کے نام اور کام دونوں سے واقف ہے۔ ان کی عظمت کو سلام کرتی ہے۔ ان کی علمی، عملی روحانی رفعتوں کی معترف ہے۔ ان کی خودی، غیرت وحمیت، کردار کی بلندی، اخلاق کی پاکیزگی اور جرات وشجاعت کو ملتِ اسلامیہ کے لیے باعثِ افتخار سمجھتی ہے۔ معروضی اور زمینی حقائق بتاتے ہیں یہ اپنے مشن، منشور اور مقصد میں کامیاب ہوئے ہیں۔

علی گڑھ کی تعلیمی تحریک:

اسی طرح اس وقت کے عصری علوم میں مہارت رکھنے والے سرسید احمد اور ان کے ساتھیوں نے ''علی گڑھ'' کی بنیاد رکھی تا کہ مسلمان نوجوان انگریزی تعلیم حاصل کر کے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوسکیں۔ قارئین! آگے بڑھنے سے قبل ''علی گڑھ کالج'' اور اس کے بانی کی تاریخ پر سرسری نظر ڈالتے ہیں۔ سرسید احمد خان 17 اکتوبر 1817ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے آباؤ اجداد ''شاہ جہاں'' کے دور میں ہرات سے ہندوستان آئے۔ دستور زمانہ کے مطابق سرسید احمد خان نے عربی فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے نانا خواجہ فرید الدین احمد خان سے حاصل کی۔ ابتدائی تعلیم میں آپ نے قرآن پڑھا اور عربی اور فارسی ادب کا مطالعہ کیا۔ اس کے علاوہ آپ نے حساب، طب اور تاریخ میں بھی مہارت حاصل کی۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے

بعد آپ نے اپنے خالو مولوی خلیل اللہ سے عدالتی کام سیکھا۔ 1837ء میں آگرہ میں کمشنر کے دفتر میں بطور نائب منشی فرائض سنبھالے۔

1841ء اور 1842ء میں مین پوری اور 1842ء اور 1846ء تک فتح پور سیکری میں سرکاری خدمات سرانجام دیں۔ محنت سے ترقی کرتے ہوئے 1846ء میں دہلی میں صدر امین مقرر ہوئے۔ 1845ء میں آپ کا تبادلہ ضلع بجنور ہوگیا۔ ضلع بجنور میں قیام کے دوران آپ نے کتاب ''سرکشی ضلع بجنور'' لکھی۔ جنگ آزادی کے دوران بجنور میں قیام پذیر تھے۔ اس کٹھن وقت میں آپ نے بہت سے انگریز مردوں، عورتوں اور بچوں کی جانیں بچائیں۔

1857ء میں آپ کو ترقی دے کر صدر الصدور بنا دیا گیا اور آپ کی تعیناتی مراد آباد کردی گئی۔ 1859ء میں وہ اپنے بیٹے سید محمود کے ساتھ انگلستان گیے تو وہاں انھیں دو مشہور رسالوں Tatler اور Spectator کے مطالعے کا موقع ملا۔ یہ دونوں رسالے اخلاق اور مزاح کے خوبصورت امتزاج سے اصلاح معاشرہ کے علم بردار تھے۔ 1862ء میں آپ کا تبادلہ ''غازی پور'' ہوگیا۔ 1867ء میں آپ بنارس میں تعینات ہوئے۔ 1877ء میں آپ کو امپریل کونسل کا رکن نامزد کیا گیا۔

دو متوازی نظام:

1888ء میں آپ کو ''سر'' کا خطاب دیا گیا۔ 1889ء میں انگلستان کی یونیورسٹی اڈنبرا نے آپ کو ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری دی۔ 1862ء میں غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کی۔ علی گڑھ گئے تو علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ نکالا۔ انگلستان سے واپسی پر 1870ء میں رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' جاری کیا۔ 24 مئی 1975ء میں علی گڑھ کالج کی بنیاد رکھی۔ سر سید احمد خان نے 81 سال کی عمر میں 1898ء میں وفات پائی۔

سر سید کی تمام زندگی قوم و ادب کی خدمت میں گزری۔ سر سید احمد کی معروف تصانیف میں ''آثار الصنادید''۔ ''خطبات احمدیہ''۔ ''الکلام''۔ ''سفر نامہ لندن''۔ ''تاریخ بجنور''۔ ''اسباب بغاوت ہند''۔ 24 مئی 1975ء میں سر سید احمد خان کے قائم کردہ ''علی گڑھ کالج'' کو جسے بعد

ازاں 1920ء میں ''مسلم یونیوسٹی علی گڑھ'' بنادیا گیا۔ یوں دو تعلیمی نظام اور سلسلے چل نکلے۔ دینی تعلیم اور عصری علوم کے دو متوازی نظام وجود میں آئے۔

مدرسے میں دینی علوم حاصل کرنے والے ''ملا'' کہلائے تو اسکول میں عصری فنون پڑھنے والا ''مسٹر'' ہوگیا۔ ''لارڈ میکالے'' کے نصاب و نظام تعلیم وضع کرنے سے قبل پورے برصغیر میں بلکہ پوری اسلامی دنیا میں دینی وعصری تعلیم کا کوئی فرق نہیں تھا البتہ علوم آلیہ اور علوم عالیہ کی ایک درجہ بندی ضرور تھی جس کے تحت قرآن وحدیث اور فقہ کے علوم کو علوم عالیہ اور دیگر فنون کو علوم آلیہ کہا جاتا تھا کیونکہ یہ علوم بنیادی طور پر علوم عالیہ کو سمجھنے اور ان کی علمی وعملی تطبیق کے لیے آلہ بنتے تھے۔ ایک مسلمان بچہ جب شعور کی آنکھ کھول لیتا تھا تو اسے سب سے پہلے قرآن وحدیث کی بنیادی تعلیم دی جاتی تھی۔

اس کے بعد ہر طالب علم اپنے ذوق کے مطابق دیگر علوم وفنون کے حصول پر توجہ دیتا تھا۔ اس کے نتیجے میں معاشرے کا ہر تعلیم یافتہ شخص قرآن وسنت کی تعلیمات سے بھی کافی حد تک واقف ہوتا تھا۔ یوں معاشرے میں قدیم وجدید اور دینی وعصری تعلیم کی بنیاد پر کوئی طبقاتی تفریق نہیں تھی۔

ادھورے خواب:

یہ دونوں متوازی نظام چلتے رہے۔ دونوں ہی اپنے مقاصد میں کامیاب رہے لیکن ''ملا مسٹر'' میں خلیج دن بدن بڑھتی ہی چلی گئی۔ باوجود اس کے کہ اس کو پاٹنے کی ہزار کوششیں کی گئیں۔

اسی سلسلے میں شیخ الہند مولانا محمود حسن ایک دفعہ ''علی گڑھ'' تشریف لے گئے تھے۔ کئی مسٹر بھی ''دیوبند'' آئے۔ بہرحال! اس سلسلے میں تو کسی حد تک کہا جاسکتا ہے کہ یہ ایک عبوری دور تھا۔ ہر ممکن طریقے سے اپنا تحفظ کیا جائے لیکن 1947ء میں برطانیہ کے اقتدار کے ختم ہوجانے کے بعد جب برصغیر تقسیم ہوا اور پاکستان کا قیام وجود میں آگیا تو اس وقت ضروری تھا اسلام کے نام پر وجود میں آنے والی ریاست ''پاکستان'' کے لیے نیا نظام تعلیم بنایا جائے۔ مدرسے اور اسکول کی تفریق کو مٹا کر دینی وعصری علوم کے امتزاج پر مشتمل ایک یکساں نصاب تعلیم مرتب کیا جاتا جو ایک مسلمان معاشرے کی دینی ضروریات اور جدید عصری تقاضوں کو یکساں طور پر پورا کرتا۔ مولانا شبیر احمد

حقیقت سے کوسوں دور ٹھنڈے کمروں میں بیٹھ کر مرتب کردہ رپورٹیں مشاہدے کے مساوی ہرگز نہیں ہو سکتیں۔ کراچی کے دو بڑے جامعات کا دورہ کرنے کے بعد ''ایجی'' نے اپنا مرتب کردہ مقالہ نظر ثانی کے لیے علیحدہ کر دیا اور دینی مدارس کے بارے میں اس کا نظریہ بھی بدل چکا تھا۔

یہ تو ایک مثال ہے ورنہ آج کل اکثر حضرات کا دینی مدارس کے بارے میں وہی تصور ہے جو سالوں پرانا بلکہ سالوں پرانے حقائق کے بھی خلاف ہے اور موجودہ زمینی حقائق تو اس کی یکسر نفی کرتے نظر آتے ہیں۔ آج مدارس میں جدید ترین سہولتوں سے لے کر اعلیٰ ترین تعلیم کے ڈپارٹمنٹ موجود ہیں۔ تمام مدارس میں میٹرک تک عصری تعلیم لازمی ہے۔ اس کے بعد ''معہد اللغۃ العربیۃ'' ہے۔

آٹھ سالہ نصاب جو کہ عالم بنانے کے لیے ہے، اس میں میٹرک کے بعد تفسیر، اُصول تفسیر، اُصول حدیث، فقہ، اُصول فقہ، علم کلام، منطق، فلسفہ، عربی ادب وانشا، لغت، صرف نحو، بلاغت وبیان، تاریخ سیرت اور فارسی زبان سمیت ایک درجن سے زائد علوم وفنون کی تقریباً پچاس قدیم وجدید کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔ قارئین کو حیرت ہوگی کہ حنفی دیوبندی مسلک سے تعلق رکھنے والے مدارس کے اس نصاب میں نصف کے قریب کتابیں غیر حنفی علما کی ہیں۔

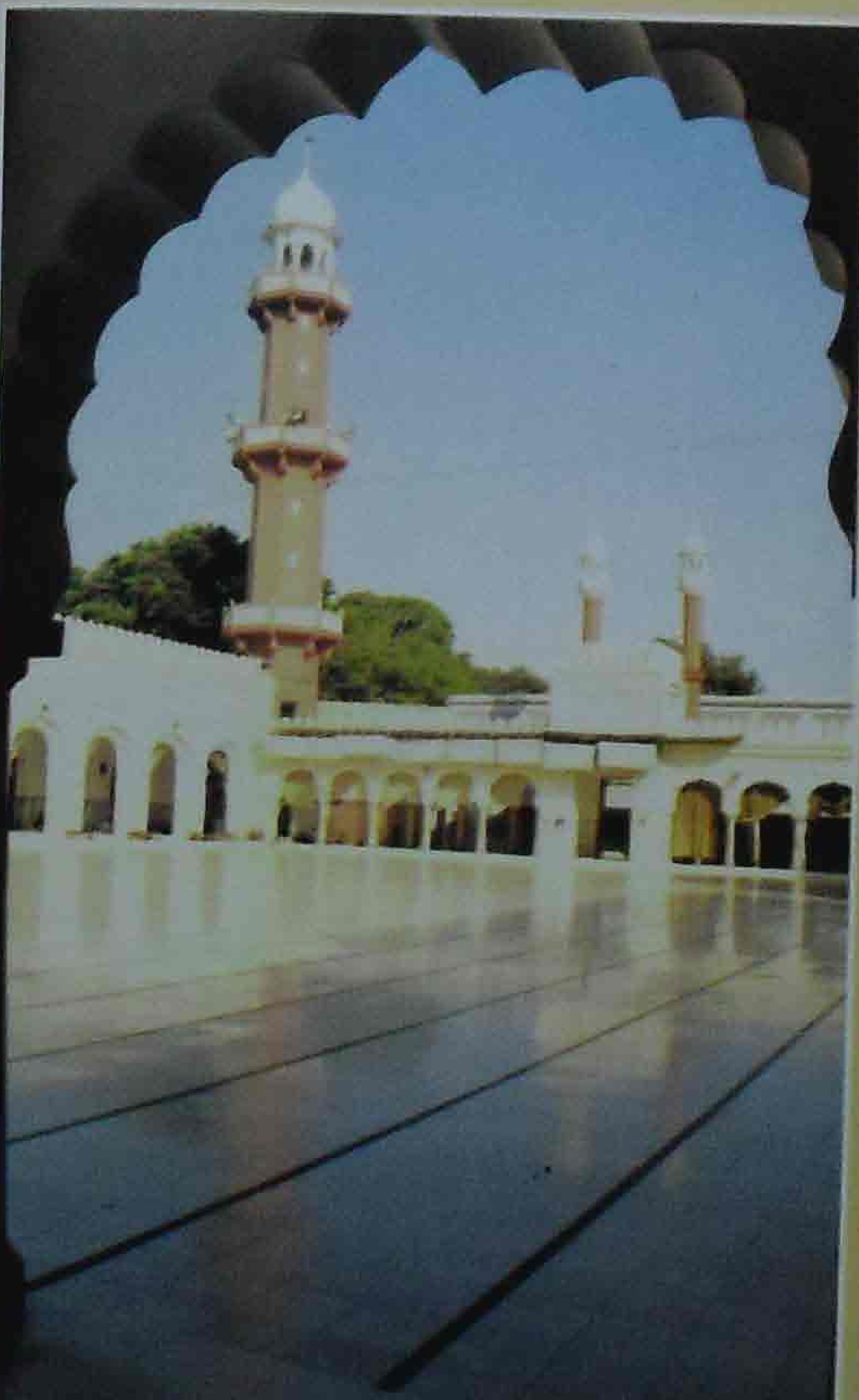
سولہ مختلف علوم وفنون:

مجموعی طور پر 16 مختلف علوم وفنون پڑھائے جاتے ہیں۔ اگر اس اجمال کی تفصیل میں جایا جائے تو یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ اس نصاب میں کہیں بھی ایسا مواد نہیں ہے جس سے فرقہ واریت، انتہا پسندی، مختلف فرقوں کو قتل کرنے کی ترغیب دی جاتی ہو بلکہ جوں جوں اس میں غور وفکر کے غوطے لگاتے جائیں گے توں توں یہ بات مترشح ہوتی جائے گی کہ دینی مدارس کے اس آٹھ سالہ نصاب میں تو اپنائیت، خدمتِ انسانی، اعلیٰ اخلاقی اقدار، رحماء بینھم کا درس بلکہ غیر مسلموں کے ساتھ بھی رواداری کا درس دیا جاتا ہے۔ دینی مدارس کا دامن تو ان تمام الزامات اور دہشت گردیوں سے پاک ہے جو مغربی میڈیا کی بے بنیاد رپورٹوں کے ذریعے ان کے اجلے دامن پر لگائے جاتے ہیں۔





جامعہ دارالعلوم کراچی کی وسیع اور خوبصورت مسجد کا اندرونی و بیرونی منظر۔



جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی کی مسجد





جامعة العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی کی عمارت۔ شہر کے قلب میں واقع اس جامعہ کو وفاق المدارس کے سب سے بڑے مدرسے ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ اس کی بیسیوں شاخوں میں ہزاروں طلبہ وطالبات علم دین کے حصول کے لیے کوشاں ہیں۔



رقبہ کے لحاظ سے پاکستان کی سب سے بڑی دینی درسگاہ ''جامعہ دار العلوم کورنگی'' کی پرشکوہ عمارت۔

جن دنوں پرویز مشرف کا طوطی بولا کرتا تھا۔ وہ بزعم خود پاکستان کے سیاہ وسفید کا مالک بن بیٹھا تھا تو دینی مدارس کو نکیل ڈالنے کی کوشش کی۔ ایک تقریر کے دوران دینی مدارس کو دسمبر 2005ء تک لازمی رجسٹریشن کروانے اور نصاب میں تبدیلی کا کہا گیا۔ اس پر ہمارے دوست محمد شفیع چترالی نے ''دینی مدارس اور انتہا پسندی'' کے عنوان مدارس کے تعلیمی نصاب کا ایک جائزہ بڑے خوبصورت انداز سے لیا تھا اور پرویز مشرف کو بتانے کی کوشش کی تھی کہ اصل انتہا پسند کون ہے؟ انہوں نے لکھا تھا: ''جنرل پرویز مشرف کی جانب سے دینی مدارس کو دسمبر 2005ء تک لازمی رجسٹریشن کرانے کا حکم دیے جانے کے بعد دینی مدارس کے نظام ونصاب کا معاملہ ایک بار پھر ملکی وبین الاقوامی سطح پر بحث ومباحثے کا محور بن گیا ہے اور مغربی میڈیا کے تجزیہ نگاروں، ہمارے حکمرانوں اور بہت سے دانشوروں کی تان یہاں آ کر ٹوٹ جاتی ہے کہ دینی مدارس میں انتہا پسندی اور فرقہ واریت کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس بحث سے قطع نظر موجودہ عالمی حالات کے تناظر میں اس موضوع کو چھیڑنے کی اصل وجہ کیا ہے اور دینی مدارس کا لندن اور مصر میں ہونے والے دو حالیہ دھماکوں سے تعلق جوڑنے کا کیا جواز ہے؟ اس سوال کا جواب دینا بہرحال ضروری ہے کیا دینی مدارس میں واقعی تنگ نظری، تعصب اور انتہا پسندی کی تعلیم دی جاتی ہے؟

اس حوالے سے مختلف حلقے مختلف زاویوں سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں لیکن تعجب کی بات ہے کہ دینی مدارس کے نصاب کو سامنے رکھ کر انصاف کے مطابق تجزیہ کرنے اور رائے قائم کرنے کی زحمت کوئی نہیں کرتا۔ حالانکہ اگر اس پہلو سے جائزہ لیا جائے تو دینی مدارس کے نصاب سے متعلق بعض ایسے حقائق بھی سامنے آتے ہیں جو بہت سے حقیقت پسند لوگوں کے لیے خوشگوار انکشافات سے کم نہیں ہوں گے۔ کیا منفی پروپیگنڈے کے موجودہ طوفانی ماحول میں ایک عام مبصر کے لیے یہ بات باعث حیرت نہیں ہوگی کہ دیوبندی حنفی مسلک کے آٹھ ہزار کے قریب مدارس کے مشترکہ بورڈ وفاق المدارس العربیہ کے نصاب میں ایک برطانوی نژاد امریکی عیسائی مصنف کی کتاب بھی کئی عشروں سے پڑھائی جاتی ہے اور فرقہ واریت کے تمام تر الزامات کے باوجود اسی نصاب میں ایک شیعہ مصنف کی کتاب سے بھی استفادہ کیا جاتا ہے۔

ایک خوبصورت جائزہ:

نصاب تعلیم کا ایک سرسری جائزہ پیش کیا جاتا ہے، جس سے دینی مدارس پر انتہا پسندی اور تعصب کا درس دینے کے الزام کی حقیقت سامنے آجاتی ہے۔ اس سلسلے میں دینی مدارس میں پڑھائے جانے والے مختلف علوم پر الگ الگ نظر ڈالنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ علم تفسیر۔ قرآن مجید تمام اسلامی علوم کے لیے اصل الاصول کی حیثیت رکھتا ہے، اس لیے قرآن مجید کی تفسیر لکھنے اور بیان کرنے کا کام نہایت ہی حساس اور نازک سمجھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علماء نے عجمی لوگوں کے لیے قرآن مجید کی تفسیر بیان کرنے اور لکھنے کے لیے 15 ایسے علوم وفنون کی تحصیل لازمی قرار دی ہے جن کے بغیر کوئی عجمی شخص قرآن مجید کی صحیح تفسیر بیان نہیں کرسکتا۔ مدارس اسلامیہ میں قرآن مجید کی تفسیر کے لیے سلف صالحین کی تفسیروں کے اتباع کو ضروری سمجھا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود دوسرے مکاتب فکر کے اکابر کی تفسیروں کو بھی قطعی نظر انداز نہیں کیا جاتا۔ اس کی واضح مثال یہ ہے تفسیر ''کشاف'' جو کہ مشہور معتزلی مفسر علامہ زمخشری کی تفسیر ہے، اس سے نہ صرف تفسیر کے درس میں استفادہ کیا جاتا ہے بلکہ قرآن مجید کے اعجاز اور فصاحت وبلاغت کے بیان میں اس کی رائے کو بطور سند کے پیش کیا جاتا ہے حالانکہ معتزلہ کے بہت سے عقائد اہلسنت کے کئی اصولی عقائد سے متصادم ہیں اور پھر علامہ زمخشری نے اس تفسیر کے اندر اہلسنت کے خلاف کئی مواقع پر سخت مؤقف بھی اختیار کیا ہے۔ مزید برآں حنفی مسلک سے وابستہ دینی مدارس کے نصاب میں شامل تفسیر کی سب سے اونچی کتاب جلالین کے دونوں مؤلفین شافعی مسلک سے تعلق رکھتے تھے لیکن ہمارے ارباب مدارس نے محض اس اختلاف نظر کی بنیاد پر اس عظیم تفسیر کو اس کے جائز مقام سے محروم نہیں کیا جو ان کی وسعت نظری کی واضح دلیل ہے۔

علم حدیث: جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک اقوال، اعمال اور تقریرات کے تذکروں پر مشتمل وسیع علم علمِ حدیث قیامت تک آنے والی امت کا مشترکہ سرمایہ ہے۔ اس علم پر تمام اسلامی طبقات کے اکابر نے کام کیا ہے۔ اہلسنت کے چاروں فقہی مسالک کے ائمہ نے اس موضوع پر گرانقدر خدمات سرانجام دی ہیں۔ ہمارے مدارس میں جو کہ اکثر مسلک امام ابوحنیفہ

رحمہ اللہ سے تعلق رکھتے ہیں بلا تفریق مسلک، احادیث کی تمام مشہور کتابیں پڑھائی جاتی ہیں جن میں سرفہرست بخاری شریف ہے اور امام بخاری رحمہ اللہ سے بعض مسائل میں اختلاف کے باوجود انہیں امیر المؤمنین فی الحدیث کہا جاتا ہے، ان کی کتاب کو کتاب اللہ کے بعد سب سے عظیم اور صحیح کتاب سمجھا جاتا ہے۔ طحاوی شریف کے علاوہ احادیث کی تمام کتابیں جو ہمارے نصاب میں شامل ہیں غیر حنفی ائمہ کی ہیں اور ان کتابوں کو حنفی درس نظامی میں اتنی اہمیت حاصل ہے کہ ان کو پڑھے بغیر کسی طالب علم کو فراغت کی سند نہیں مل سکتی۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ کہ احادیث پڑھانے والے کئی اساتذہ اور طلبہ احادیث تلاش کرنے کے لیے عیسائی مستشرق ''بروکلین'' کی کتاب ''المعجم المفہرس لالفاظ الحدیث'' سے استفادہ کرتے ہوئے کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے۔ علاوہ ازیں اس زمانے میں بیروت سے شائع ہونے والی یہودی مستشرقین کی کئی کتابیں مدارس اسلامیہ کی لائبریریوں میں تحقیق واستفادے کے لیے رکھی جاتی ہیں۔

علم فقہ: ہر مسلک ومکتب فکر سے وابستہ ادارے میں وہی فقہی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں جو اسی مسلک کے علماء نے لکھی ہوں۔ ہمارے مدارس میں علم فقہ کی سب سے اونچی کتاب ''ہدایہ'' ہے جس میں اختلافی مسائل میں ائمہ احناف کے نقطہ نظر کی ترجمانی کی گئی ہے لیکن اسی ہدایہ کے حاشیہ پر مشہور شافعی محدث اور فقیہ علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ کی کتاب ''الدرایہ'' بھی لگائی گئی ہے جس میں انہوں نے کئی مقامات پر احناف کے دلائل کو کمزور ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے علاوہ اصول فقہ میں علامہ تفتازانی کی ''التوضیح والتلویح'' بھی شامل نصاب ہے جن کے بارے میں علماء نے لکھا ہے وہ حنفی مسلک کی کئی کتابوں کی شرح لکھنے کے باوجود شافعی المسلک تھے۔

الزامات سے پاک دامن:

علم کلام: اسلامی عقائد کی تعلیم اور عقائد میں اختلافی مسائل پر بحث ومباحثہ کے علم کو ''علم کلام'' کہا جاتا ہے۔ یہ علم درس نظامی کے مشکل ترین علوم میں سے ہے اور وفاق المدارس العربیہ کے نصاب میں درجہ عالیہ...... جو مساوی بی اے ہے...... میں پڑھایا جاتا ہے۔ کلامی ابحاث کے حوالے سے علمائے اہلسنت کے دو مشہور مکاتب فکر ہیں: ماتریدی اور اشعری۔ ہمارے اکثر ائمہ

احناف ماتریدی مکتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں لیکن یہ جان کر آپ کو تعجب ہوگا کہ اس اہم اور حساس فن میں پڑھائی جانے والی واحد کتاب ''شرح عقائد'' اشعری مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے محقق علامہ سعد الدین تفتازانی کی ہے۔ عقائد کے معاملے میں خصوصیت کے ساتھ اس قدر وسعت ظرفی کا مظاہرہ شاید ہی کسی مکتب فکر نے کیا ہو۔

علم لغت: علم لغت میں مدارس اسلامیہ میں تاج العروس، مصباح اللغات اور دیگر شاہکار کتابوں کے ہوتے ہوئے عیسائی مرتب لوئس معلوف کی شہرہ آفاق کتاب ''المنجد'' سے بھی استفادہ کیا جاتا ہے اور یہ کتاب تقریباً ہر بڑے عالم اور مدرسے کے کتب خانے میں لازماً موجود ہوتی ہے حالانکہ اہل علم جانتے ہیں کہ اس کے مرتب نے لغات کے بیان میں عیسائیت کے پرچار کی کوشش بھی کی ہے اور کئی اسلامی اصطلاحات کو بگاڑ کر بیان کیا ہے۔

علم ادب: علم ادب میں اپنے زمانے میں نبوت کا دعویٰ کرنے والے ادیب و شاعر متنبی کی کتاب پڑھائی جاتی ہے۔ جس کی دینی اور اخلاقی حالت تذکرہ نویسوں کے بقول نہایت ہی قابل رحم تھی لیکن چونکہ ان کی کتاب فن ادب کا شاہکار ہے، اس لیے علماء نے اس کے عقائد اور خیالات سے قطع نظر کر کے طلبہ کو ان کے ادب سے مستفید ہونے کا موقع دیا ہے۔ جاہلیت کے زمانے کی شاہکار عربی نظموں کا مجموعہ ''السبع المعلقات'' بھی بہت سے مدارس میں داخل نصاب ہے۔ جس کے مندرجات میں جاہلیت کے عقائد اور نظریات بھی شامل ہیں۔ علماء نے ان مندرجات سے صرف نظر کر کے ان کی ادبی حیثیت کا اعتراف کیا ہے اور اسے اپنے نصاب میں ممتاز مقام عطا کیا ہے۔

علم عروض وقوافی: علم عروض وقوافی وہ علم ہے۔ جس کے ذریعے ہر زبان میں شعر و شاعری کے قواعد اور قوانین بیان کیے جاتے ہیں۔ چونکہ عربی زبان میں فن عروض وقوافی کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے، اس لیے مدارس اسلامیہ کے نصاب میں اس فن کو بھی جگہ دی جاتی ہے۔ اس فن میں عالم اسلام کے کئی ائمہ فن نے کئی چھوٹی بڑی کتابیں تصنیف کی ہیں لیکن مدارس اسلامیہ کی وسعت ظرفی کا اندازہ لگائیے کہ اس فن سے متعلق نصاب میں شامل واحد کتاب کسی عربی عالم یا اسلامی ادیب کی نہیں بلکہ امریکا کے شہر نیویارک سے تعلق رکھنے والے برطانوی نژاد عیسائی مصنف

''ڈاکٹر نیلسس فنڈ یک'' کی ہے جو ''محیط الدائرہ'' کے نام سے وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے نصابی نقشے میں موجود ہے اور اہتمام کے ساتھ پڑھائی جاتی ہے۔ کیا اس کے بعد بھی یہ کہنے کی گنجائش موجود ہے کہ دینی مدارس میں انتہا پسندانہ رجحانات کا درس دیا جاتا ہے؟

علم منطق: دینی مدارس پر انتہا پسندی کے حوالے سے سب سے زیادہ الزامات شیعہ سنی اختلافات کے حوالے سے لگائے جاتے ہیں۔ یہ پروپیگنڈا کیا جاتا ہے کہ مدارس میں مخالف فرقے کو قتل کرنے کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس پروپیگنڈے کی حقیقت کا اندازہ اس بات سے لگا لیجیے کہ دینی مدارس کے نصاب میں ابتدائی درجات کے طلبہ کے لیے علم منطق کی اہم ترین کتابوں میں سے ایک ''شرح تہذیب'' بھی ہے جو کسی سنی عالم کی نہیں بلکہ ایران سے تعلق رکھنے والے شیعہ مصنف علامہ عبداللہ بن الحسین اصفہانی کی ہے۔ آج تک اس کتاب کے شامل نصاب ہونے پر کسی مدرسے یا کسی عالم نے کوئی احتجاج نہیں کیا ہے بلکہ اس سے خوشدلی کے ساتھ استفادہ کیا جاتا ہے۔'' یہ چند مثالیں پیش کی گئیں ورنہ نصاب میں شامل تمام کتابوں اور ان کی شروحات وتعلیقات کو سامنے رکھ کر دینی مدارس کے نصاب کا تفصیلی جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہوتی ہے کہ مدارس اسلامیہ نے اپنے طرز تعلیم میں کبھی فرقہ وارانہ سوچ نہیں اپنائی اور ان کا دامن ان تمام الزامات سے پاک ہے جو مغربی میڈیا کے ذریعے ان پر لگائے جاتے ہیں۔

پروٹوکولز اور دینی تعلیم:

دینی مدارس کے نصاب تعلیم و نظام تعلیم کو ختم یا مسخ کرنے کے حوالے سے یہودی پروٹوکول میں بھی ذکر ملتا ہے۔ صہیونی داناؤں کی مرتب کردہ دستاویز نمبر 16 میں ہے:

''تمام اجتماعی قوتوں کا استعمال کرنے کے لیے ہم سب سے پہلے اجتماعیت کے پہلے مرحلے میں دینی تعلیمی درسگاہوں کو کمزور کریں گے۔ ان درسگاہوں میں اب ایک نئی جہت میں دوبارہ تعلیم دی جائے گی۔ ان کے عہدیداروں اور معلموں کو ایک تفصیلی خفیہ لائحہ عمل کے ذریعے ان کے منصب کے لیے تیار کیا جائے گا جس سے وہ بلا استثنیٰ سر مو بھی اختلاف نہیں کر سکیں گے۔

ان کا خصوصی احتیاط کے ساتھ تقرر کیا جائے گا اور ایسی جگہ رکھا جائے گا جہاں وہ مکمل طور پر حکومت کی نظر میں رہیں گے۔ ہم تعلیمی نصاب سے ملک کے قانون کا مضمون خارج کر دیں گے۔ اس کے علاوہ اور تمام مضامین بھی جن کا تعلق امور مملکت سے ہو سکتا ہے، نصاب سے خارج کر دیے جائیں گے۔ یہ مضامین صرف ان چند درجن افراد کو پڑھائے جائیں گے جنہیں داخلہ لینے والوں میں سے ان کی غیر معمولی صلاحیت کی بنیاد پر منتخب کیا جائے گا۔ تعلیمی اداروں کو ایسے کم حوصلہ لوگ پیدا کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی جو آئین کے بارے میں ایسے منصوبے گھڑیں جیسے کوئی طربیہ یا المیہ ڈرامہ لکھ رہے ہیں یا سیاسی حکمت عمل کے بارے میں اپنا دماغ کھپانا شروع کر دیں گے جس کے بارے میں ان کے باپ بھی سوچنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔ امور مملکت کے بارے میں اکثر لوگوں کی گمراہ کن قلیل واقفیت شیخ چلیوں اور برے شہریوں کو جنم دیتی ہے۔

غیر یہودیوں کی مثال آپ سامنے موجود ہے۔ انہوں نے ہر ایرے غیرے کو اس قسم کی تعلیم کو حاصل کرنے کی اجازت دے کر کیا تیر مارا؟ انہیں تعلیم دینے میں ہمیں وہ تمام اصول مدنظر رکھنے چاہییں جنہوں نے اتنے شاندار طریقے سے ان کے سارے نظام کا تار و پود بکھیر کر رکھ دیا ہے لیکن جب ہم اقتدار حاصل کر لیں گے تو نصاب سے ہر قسم کے انتشار پھیلانے والے مضامین نکال دیں گے۔ نوجوانوں کو اقتدار کی اطاعت اور حکمران سے محبت کرنے کی تعلیم دیں گے اور ان کو اچھی طرح ذہن نشین کروا دیں گے کہ حکمران ہی ان کا واحد سہارا اور امن و امان قائم کرنے کا ضامن ہے۔ قدیم ادبیات عالیہ اور عہد عتیق کی تاریخ جیسے مضامین کے بجائے جن سے اچھے کے مقابلے میں برے سبق زیادہ ملتے ہیں، نصاب میں مستقبل کا لائحہ عمل شامل کیا جائے گا۔

پچھلی صدیوں کے وہ تمام واقعات جو ہمارے لیے نا مرغوب ہیں انسانی یادداشت سے محو کر دیے جائیں گے اور صرف وہ واقعات باقی رکھے جائیں گے جن سے غیر یہودی حکومت کی لغزشوں کی عکاسی ہوتی ہو۔ عملی زندگی کا مطالعہ، مروّجہ نظام کی پابندی اور فرائض، عوام کے باہمی تعلقات، برائی اور خود غرضی کی مثالوں سے اجتناب، جن سے برائی کے جراثیم پھیلتے ہیں، تعلیمی نصاب میں سرفہرست ہوں گے۔ ہر شعبہ زندگی کے لیے ایک علیحدہ منصوبہ ترتیب دیا جائے گا اور

ہر ایک کو یکساں تعلیم نہیں دی جائے گی۔ اس مسئلے کا ہر پہلو غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ ہر شعبہ زندگی کی تربیت ان قیود کی پابند ہوگی جو اس کی مقصدیت اور عملی زندگی کے مطابق ہوگی۔ کبھی کبھی اتفاقیہ طور پر کوئی ذہین آدمی ایک شعبہ زندگی سے دوسرے شعبہ زندگی میں جانے میں کامیاب ہوتا رہا ہے اور آئندہ بھی ایسا ہوتا رہے گا، لیکن اس اتفاقیہ ذہین آدمی کی خاطر غبی الذہن افراد کو اس شعبہ تعلیم میں داخلہ دینے کا اذن عام دینا شدید حماقت ہوگی۔

ظاہر ہے وہ اس شعبے میں بالکل نامناسب ہوں گے اور اس طرح انہیں ان لوگوں کی جگہ ہتھیانے کا موقع مل جائے گا جو بربنائے پیدائش یا ملازمت اس شعبے سے تعلق رکھتے ہوں گے اور اس کے اہل ہوں گے۔ آپ کو خود معلوم ہے غیر یہودیوں نے.... جنہوں نے اس حماقت کو روا رکھا...... اپنے آپ کو کس حال تک پہنچادیا؟ حکمران کو عوام کے دل و دماغ پر اپنا سکہ جمانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کے دور حکومت میں پوری قوم کو اسکولوں اور بازاروں میں، اس کے مقاصد، عمل، شرافت اور کریم النفسی پر مبنی اقدامات کے بارے میں آگاہ رکھا جائے۔

تعلیم کے شعبے میں ہر قسم کی آزادی ختم کر دیں گے۔ ہر عمر کے طالب علموں کو یہ حق دیا جائے گا کہ تعلیمی اداروں میں اپنے والدین کے ساتھ اس طرح اکٹھے ہوسکیں جیسے کسی کلب میں جمع ہوتے ہیں۔ ان اجتماعات میں تعطیلات کے دوران مدرسین، انسانی تعلقات کے مسائل، غیر شعوری تعلقات سے پیدا ہونے والی قیود اور آخر میں ان نظریات کے فلسفے کے بارے میں جن کا ابھی دنیا کو علم نہیں ہے، اس طرح پڑھائیں گے گویا وہ ان مضامین پر آزادانہ گفتگو کر رہے ہوں۔ ان نظریات کی نشو ونما کر کے ہم انہیں اپنے مذہب کی جانب عبوری مرحلے میں، مذہبی عقیدے کی حد تک لے جائیں گے۔''

زمانہ حال اور مستقبل میں اپنے لائحہ کار کے مکمل بیان کرنے کے بعد میں آپ کو ان نظریات کے اصول پڑھ کر بتاؤں گا۔

یہودی دستاویزات کو دیکھیے:

''صدیوں کے تجربے سے یہ معلوم ہونے کے بعد کہ لوگ نظریات پر زندہ رہتے ہیں اور ان

ہی سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں اور یہ کہ لوگ یہ نظریات اس تعلیم سے اخذ کرتے ہیں جو ہر دور میں یکساں کامیابی سے دی جاتی رہی ہے گو کہ طریقہ تعلیم مختلف رہا ہے، ہم اس آزادی فکر کو آخری قطرے تک اپنے استعمال کے لیے ضبط کر کے پی جائیں گے جس کا رخ مدتوں سے ہم ان مضامین اور نظریات کی طرف موڑے ہوئے تھے جو ہمارے کام آنے والے تھے۔ فکر کو لگام دینے کا طریقہ، معروضی سبق پڑھانے کے نام نہاد طریقے کے ذریعے پہلے ہی سے کام کر رہا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ غیر یہودیوں کو تفکر سے عاری اجڈ اطاعت شعاروں میں تبدیل کر دیا جائے جو صرف اس بات کے منتظر ہوں کہ چیزیں ان کی آنکھوں کے سامنے پیش کی جائیں تو وہ ان پر کوئی رائے قائم کریں۔ فرانس میں ہمارے بہترین گماشتے، بوژوا معروضی سبق پڑھانے کے نئے لائحہ عمل کا پہلے ہی مظاہرہ کر چکے ہیں۔"

ان یہودی دستاویزات کو سامنے رکھ کر دینی مدارس...... جو دین کے قلعے اور محافظ ہیں...... کے بارے میں زہریلے پروپیگنڈے کا جائزہ لیا جائے تو بات بآسانی سمجھ آسکتی ہے۔

ہمیں یاد ہے چند سال پہلے برطانوی وزیر دفاع نے دارالعوام کی دفاعی کمیٹی کے روبرو بیان دیتے ہوئے کہا: "دینی مدارس نہ صرف پاکستان بلکہ برطانوی سلامتی کے لیے بھی خطرہ ہیں۔ ان کے خلاف کارروائی کے لیے پاکستان کی مدد کر رہے ہیں۔ انہوں نے کہا دینی مدارس ایک اسٹریٹجک مسئلہ ہے اور اس کا براہ راست تعلق برطانیہ کی سلامتی سے ہے۔ دینی مدارس سے متعلق برطانوی وزیر دفاع کا یہ شر انگیز بیان نہ صرف پاکستان کے داخلی معاملات میں براہ راست اور کھلی مداخلت ہے بلکہ عام سفارتی آداب کے بھی منافی ہے۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

اگر ہزاروں میل دور پاکستان میں واقع دینی مدارس برطانیہ جیسے ملک کے لیے خطرہ بن چکے ہیں تو برطانیہ کے پورے دفاعی نظام اور اس کی لاتعداد انٹیلی جنس ایجنسیوں کے وجود کا کیا مقصد ہے اور وہ کیا کر رہی ہیں؟ کیا دنیا بھر میں پھیلے ہوئے برطانوی قونصل خانے اس قدر نااہل ہیں کہ وہ برطانیہ کو اس قدر دور کے خطرے سے نہیں بچا سکتے؟ حقیقت یہ ہے کہ دینی مدارس تو خیر کے مراکز ہیں جن کو زہریلے پروپیگنڈے کے ذریعے شر و فساد کے اڈے قرار دیا جا رہا ہے۔

شر انگیز منصوبے:

اس طرح لکھا جا رہا ہے: ”کچھ مدارس دہشت گردی اور بنیاد پرستی کی تعلیم دے رہے ہیں۔ دہشت گردی کے اصل اڈے دینی مدارس ہیں۔ مدارس برائی کی جڑ ہیں۔ مدارس کی سرگرمیوں سے ملک بدنام ہو رہا ہے۔ مدارس دہشت گردی کے اڈے اور فحاشی و عریانی کی آماجگاہیں ہیں۔ افغان ائمہ ملک چھوڑ دیں۔ مدارس رجسٹرڈ نہ ہوئے تو ان کے خلاف کارروائی ہوگی۔“ یہ اور اس طرح کے دیگر جملے نشتر بن کر مدارس اور اہلِ مدارس کو نشانہ بناتے رہتے ہیں۔

اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں کہ ملک میں سیکڑوں نہیں ہزاروں مدارس اور ان میں پڑھنے والے لاکھوں طلبہ مذہبی، سیاسی، تاریخی اور تہذیبی حوالے سے انتہائی اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ مدارس ہی ہیں جنہیں بلا مبالغہ ملک کی سب سے بڑی غیر سرکاری تعلیمی این جی او ہونے کا شرف حاصل ہے۔

مملکت خداداد پاکستان میں مدارس کی یہ تعداد اور ان میں پڑھنے والے ملکی اور غیر ملکی لاکھوں طلبہ کی موجودگی اس بات کی شاہد ہے کہ اس ملک کی شناخت مذہب ہے۔ ہزاروں مدارس بغیر حکومتی فنڈز اور بغیر کسی قابل ذکر غیر ملکی کے لاکھوں طلبہ کو مفت تعلیم، رہائش اور کھانا فراہم کرتے ہیں۔ یہ پاکستانی عوام کی طرف سے اہل مدارس کی وہ پشت پناہی ہے جسے حکومت ختم کرنے کے لیے پابندیاں لگانے کی کوشش کر رہی ہے تاکہ مدارس کو حکومتی فنڈز لینے پر مجبور کر کے اپنی تحویل میں لے لیا جائے اور پھر جس طرح کالجوں اور یونیورسٹیوں میں جو من مانیاں، بے ضابطگیاں، خون خرابے اور مار دھاڑ والا ماحول ہے اسے مدارس میں منتقل کیا جائے، لیکن قابل ستائش ہیں اہل مدارس، علمائے کرام اور دینی مدارس کے بورڈز جنہوں نے ان حکومتی عزائم کو حسب سابق مکڑی کا جالا ثابت کر دیا ہے۔ مدارس پر فرقہ پرستی کا الزام خود بخود دم توڑ رہا ہے۔ دشمن اور ان کے ایجنٹوں نے ٹارگٹ کلنگ کے ذریعے چن چن کر علماء کو شہید کیا کہ کسی طرح ملک میں فرقہ واریت کا زہر پھیلا کر علمائے کرام اور دینی اداروں کو آپس میں لڑایا جائے۔ اس پر وفاق المدارس کے ناظم اعلیٰ جناب قاری حنیف جالندھری صاحب نے کچھ یوں تبصرہ کیا تھا: ”گزشتہ دنوں فرقہ وارانہ

اختلافات کو ہوا دیے اور مسلمانوں کے مختلف مکاتب فکر کو باہم دست و گریبان کرنے کے لیے ملک کے مختلف حصوں میں جو واقعات پیش آئے، ان پر جس قدر افسوس کیا جائے وہ کم ہے۔ اگر چہ ملک کے باقی حصوں میں ان چنگاریوں کو زیادہ ہوا نہ دی جا سکی جبکہ فیصل آباد میں جو حادثہ ہوا وہ اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ ہے جس میں قرآن کریم کی بے حرمتی اور مقدس کتب کی بے ادبی کی گئی، تاریخی لائبریری کو نذر آتش کیا گیا، غلاف کعبہ اور مسجد نبوی کے دروازے کے ٹکڑے کو بھی نہیں بخشا گیا۔ چادر اور چار دیواری کا تقدس پامال ہوا۔ بچیوں کے مدرسہ میں توڑ پھوڑ کی گئی۔ گھروں میں لوٹ مار کی گئی۔ مسجد کا تقدس پامال ہوا۔

فرقہ واریت کی آگ:

مولانا ضیاء القاسمی کی قبر تک کو معاف نہیں کیا گیا۔ یقین جانیے! اس واقعے نے میرے سمیت تمام اہل ایمان کے دلوں کو زخمی کر کے رکھ دیا، چنانچہ میں شدید علالت کے باوجود اس آگ کو بجھانے کے لیے نکل کھڑا ہوا کیونکہ ظاہری بات ہے کہ یہ واقعہ بارود کے ڈھیر میں آگ کی تیلی پھینکنے کے مترادف تھا۔ ایک ہفتے کی محنت کے بعد حکومتی رویے اور بعض شر پسند عناصر کی حرکتوں سے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے آگ بجھانے کے لیے ہماری کوششیں زیادہ بار آور ثابت نہیں ہو رہیں۔ موجودہ صورت حال کے تدارک کے لیے اصل واقعہ اور اس کا پس منظر ذہن میں رہنا ضروری ہے۔ ہوا یوں 12 ربیع الاول سے تین روز قبل مولانا زاہد محمود قاسمی نے انتظامیہ کو تحریراً اور زبانی بار بار خبردار کیا کہ گزشتہ سال ربیع الاول کے جلوس کے موقع پر کچھ تلخی ہوگئی تھی، اس لیے اس سال بھی اس قسم کی صورتِ حال پیدا ہونے سے قبل پیش بندی کے طور پر یا تو جلوس کا روٹ تبدیل کر دیا جائے یا سیکورٹی کا مناسب انتظام کیا جائے، لیکن افسوس ناک امر یہ ہے کہ سیکورٹی کا کوئی معقول انتظام نہ کیا گیا بلکہ بعض حضرات اس واقعے کی کڑیاں کچھ عرصہ قبل غلام محمد آباد کے قریبی علاقے میں سیدنا فاروق اعظمؓ اور سیدنا امیر معاویہؓ کے پتلے نذر آتش کرنے کے واقعات کے ساتھ بھی جوڑ رہے ہیں کیونکہ اس دل آزار کارروائی پر دیگر اہل ایمان کی طرح مولانا زاہد محمود قاسمی نے بھی بھرپور احتجاج کیا تھا اور تھانے کے سامنے دھرنا بھی دیا تھا۔

اس بات کا خدشہ بھی ظاہر کیا جا رہا تھا کہیں پتلے نذر آتش کرنے والے شریر لوگ جلوس کی آڑ میں مولانا زاہد قاسمی کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کریں لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شود...... انتظامیہ نے مولانا کی حفاظت کا بندوبست کرنے کے بجائے الٹا انہیں تھانے کے سامنے دھرنا دینے کی وجہ سے انتقام کا نشانہ بنا ڈالا۔ 12 ربیع الاول کو مولانا زاہد قاسمی کسی پروگرام میں شرکت کے لیے گھر سے روانہ ہو رہے تھے اور ابتدا وقوعہ کے وقت وہ گھر یا مسجد و مدرسہ میں موجود ہی نہ تھے۔ ان کی عدم موجودگی میں جب جلوس غلام محمد آباد میں مولانا ضیاء القاسمی کی مسجد کے سامنے پہنچا اور مخالفانہ نعرہ بازی اور اکابر علمائے دیوبند پر سب و شتم کا سلسلہ شروع ہوا تو جواباً جلوس پر پتھراؤ ہوا۔ جب معاملہ ذرا زیادہ بڑھا تو پولیس کو ایکشن لینا پڑا۔ قوی امکان یہ ہے کہ مظاہرین میں سے بعض لوگ پولیس کے لاٹھی چارج اور شیلنگ وغیرہ کی وجہ سے زخمی ہوئے۔ بعد ازاں ان زخمیوں کا ڈھنڈورا پیٹ کر شہر بھر کے جلوسوں کا رخ مولانا قاسمی کی مسجد کی طرف موڑ دیا گیا اور پھر جس سفاکیت کا مظاہرہ ہوا اس سے زمین بھی کانپ اٹھی اور آسمان بھی لرز گیا۔

اطلاع ملتے ہی مجھے فون کر کے ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا گیا۔ میں نے ہوم سیکرٹری، آئی جی پنجاب اور ضلعی انتظامیہ سے رابطے کی کوشش کی اور انہیں اس صورتِ حال پر قابو پانے کو کہا لیکن وعدے کے باوجود پولیس خاموش تماشائی بنی رہی اور ''بلوائیوں'' کو کھلی چھٹی دے دی گئی۔ اس واقعہ کے بعد ملک بھر میں شدید غم و غصہ اور محاذ آرائی کی فضا پیدا ہوگئی۔ مشتعل نوجوانوں کے فون آنے لگے اور کسی بڑے خطرے اور تصادم کے آثار واضح ہونے لگے تو میں نے صاحب فراش ہونے کے باوجود سفر کا قصد کیا۔ پہلے ملتان سے لاہور پہنچا جہاں صوبائی انتظامیہ سے ملاقاتوں اور مذاکرات کے علاوہ جامعہ منظور الاسلامیہ میں پیر سیف اللہ خالد کی دعوت پر علمائے کرام کے ایک اہم اجلاس میں شرکت کی۔

دم توڑتی سازشیں:

اجلاس کے بعد میں نے ایک پر ہجوم پریس کانفرنس میں اس واقعہ کی پرزور مذمت کی اور اپنے مطالبات پیش کیے۔ بعد ازاں وہاں سے اسلام آباد کا سفر کیا اور وفاقی وزیر داخلہ سے میٹنگ

ہوئی۔ ہم نے وزیر داخلہ کے سامنے ساری صورتِ حال رکھی اور انہیں عوامی غم و غصہ اور علما و طلبہ میں موجود اضطراب سے آگاہ کیا۔ اسلام آباد سے ہم فیصل آباد کے لیے روانہ ہوئے۔ محترم ڈاکٹر عادل خان نائب مہتمم جامعہ فاروقیہ کراچی اور مولانا قاضی عبدالرشید ڈپٹی سیکرٹری جنرل وفاق المدارس العربیہ پاکستان بھی میرے ہمراہ تھے۔ فیصل آباد جامعہ اسلامیہ امدادیہ کے مہتمم مفتی محمد طیب صاحب، جامعہ فاروق اعظم کے سید نذیر شاہ صاحب اور جامعہ دارالقرآن کے محترم قاری محمد یٰسین صاحب کی قیادت میں علمائے کرام اور عوام الناس کی ایک بہت بڑی تعداد نے جلوس کی شکل میں ہمارا استقبال کیا۔ اس جلوس میں بیسیوں موٹر سائیکل اور درجنوں گاڑیاں شامل تھیں۔

ہم پہلے جامعہ قاسمیہ گئے، پھر مولانا قاسمی کے گھر گئے، جلی ہوئی لائبریری، اجڑا ہو گھر، لٹا پٹا خانوادہ قاسمی، غم و غصے سے بھرے ہوئے نوجوان، آنسو بہاتے معصوم بچے اور اداسی کی کہانیاں سناتی بچیاں، عجیب منظر تھا اور عجیب سوگوار ماحول تھا۔ ہم نے سب کو صبر و تحمل کی تلقین کی۔ پرامن رہنے کی ترغیب دی۔ بعدازاں جامعہ دارالقرآن میں علماء کا اجلاس ہوا۔ اطمینان کی بات یہ ہے کہ اس افسوس ناک حادثے کے باوجود علمائے کرام نے حکمت و بصیرت اور صبر و تحمل کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ اس اجلاس کے دوران سب علماء اس بات پر متفق دکھائی دے رہے تھے کہ یہ حادثہ بریلوی دیوبندی اختلاف کا شاخسانہ نہیں بلکہ چند شرپسند عناصر کی کارستانی ہے۔

ہم ایک عرصے سے خبردار کر رہے تھے اور میں نے چند ماہ قبل وزیر اعلیٰ پنجاب کے سامنے علماء کے ایک وفد کی نمائندگی کرتے ہوئے یہ واضح بھی کیا تھا کہ ہمارے اکابر کے خلاف جس قسم کی زبان استعمال کی جارہی ہے اور مسلسل دیوبندی بریلوی تنازع کو آپ لوگوں کا نام، آپ کی جماعت کا پلیٹ فارم اور پنجاب حکومت کے سرکاری عہدے اور سرکاری وسائل کو استعمال کر کے ہوا دی جارہی ہے اگر اس کا فوری تدارک نہ ہوا تو کوئی بھی حادثہ رونما ہو سکتا ہے اور بالآخر وہی ہوا۔ تمام علمائے کرام اس بات پر بھی متفق تھے کہ ہم انتظامیہ کو بار بار خبردار کرتے رہے کہ مسلم لیگ کے ایک ایم این اے ایک عرصے سے کسی کی شہ پر مسلکی تنازعات کو ہوا دے رہے ہیں اور اپنے ذاتی مفادات اور مقامی تنازعات کو ملکی سطح کے تنازعات میں تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے

بارے میں یہ بھی کہا جارہا ہے کہ وہ مسلح افراد کی معیت میں بلوے کے دوران جائے وقوعہ پر آئے، اپنا جھنڈا لہرایا، نعرے بازی کر کے بلوائیوں کو بلہ شیری دی جو انتہائی افسوس ناک ہے۔

بریلوی دیوبندی اختلافات کوئی آج کی بات نہیں بلکہ یہ سلسلہ گزشتہ ڈیڑھ صدی سے جاری ہے لیکن اب اچانک اس معاملے میں تشدد، قتل وغارت، جلاؤ گھیراؤ کا جو عنصر داخل ہوا ہے، یہ اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ ہے جس کی غیر جانبدارانہ تحقیق از حد ضروری ہے۔ یاد رہے کہ اب بھی اگر ''مٹی پاؤ اور ڈنگ ٹپاؤ'' قسم کی حکمت عملی اپنائی گئی اور اس واقعہ کی غیر جانبدارانہ تحقیقات نہ ہوئیں تو خاکم بدہن یہ کوئی آخری حادثہ نہیں ہوگا۔ ہم نے بار بار یہ مطالبہ کیا کہ ہائی کورٹ کے ججوں پر مشتمل ایک کمیشن تشکیل دیا جائے لیکن انتظامیہ مسلسل لیت ولعل سے کام لے رہی ہے۔ اسی طرح قرآن کریم کی بے حرمتی کرنے والوں، لوٹ مار اور جلاؤ گھیراؤ کرنے والوں کو اگر عبرتناک سزا نہ دی گئی تو ان کے حوصلے مزید بڑھ جائیں گے اور ملک کے کسی بھی حصے میں اس قسم کے مزید واقعات رونما ہو سکتے ہیں لیکن عوام کے شعور اور علماء کی حکمت ودانش اور اہل مدارس کے صبر نے اس سازش کو آپ ہی مردہ کر دیا۔''

غور وفکر کی ضرورت:

مدارس پر سب سے بڑا الزام دہشت گردی کا لگایا جارہا ہے۔ بلا جواز چھاپے مار کر مدارس کو بدنام کرنے کی کوشش کی گئی۔ قرآن وسنت پڑھنے والے غیر ملکی طلبہ کو گرفتار کر کے ان کا تعلق القاعدہ سے جوڑنے کی ناکام کوشش کی گئی لیکن حکومت کی ساری مشینریاں بھی اس بات کو ثابت نہ کر سکیں کہ ہزاروں مدارس میں کسی ایک کا تعلق بھی القاعدہ سے ہے۔ امریکی وزیر خارجہ ہیلری کلنٹن کے دورۂ پاکستان کے موقع پر اسلام آباد سمیت کراچی کے دینی مدرسے کے تقریباً 150 طلبہ کو گرفتار کیا گیا جن میں 3 تاجک طلبہ بھی قابل ذکر ہیں۔ یہ گرفتاریاں دراصل ہیلری کلنٹن کو سلامی تھی ورنہ ان تمام طلبہ میں سے کسی ایک کا تعلق بھی القاعدہ سے ثابت نہیں کیا جاسکا۔ اسی موضوع پر شیخ الاسلام اور جسٹس (ر) مفتی محمد تقی عثمانی نے یوں تبصرہ فرمایا ہے: ''ملک کے دینی مدارس آج کل چاروں طرف سے نہ صرف تنقید کا نشانہ بنے ہوئے ہیں بلکہ ان کے خلاف یکطرفہ

اعلانات اور کارروائیوں میں روز بروز شدت آرہی ہے۔ کسی بھی ادارے پر تنقید کوئی بری بات نہیں۔ اگر اس ادارے کو اچھی طرح دیکھ بھال کر اور اس کے نظام اور اغراض ومقاصد کا حقیقت پسندانہ جائزہ لے کر اس پر تنقید کی جائے تو ایسی تنقید خیر مقدم کی مستحق ہوتی ہے۔ اگر کوئی تنقید دور دور سے محض بدگمانیوں کی بنیاد پر کی جائے تو نہ صرف یہ کہ اس سے اصلاح حال میں کوئی مدد نہیں ملتی بلکہ وہ بسا اوقات محاذ آرائی کی شرانگیز فضا پیدا کر دیتی ہے۔ اگر یہ تنقید ان سرکاری ذرائع کی طرف سے ہو جن کے ہاتھ میں اقتدار کی باگ ڈور ہے اور وہ اسے عملی کارروائیوں کی بنیاد بنانے لگیں تو ایسی تنقید ظلم وستم میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ دینی مدارس کی مظلومیت یہ ہے کہ آج کل وہ اسی دوسری قسم کی تنقید کا نشانہ بنے ہوئے ہیں۔ ان کے بارے میں جو ٹکسالی فقرے آج ہر نقاد کی زبان پر ہیں، ان میں اکثر وہ ہیں جو ان مدارس کے مشاہدے اور معروضی تجزیے پر نہیں بلکہ ان مفروضوں پر مبنی ہیں جو دور دور سے ذہن میں قائم کر لیے گئے ہیں اور انہیں ایک مسلّم حقیقت سمجھ کر دن رات ان کی تشہیر کی جارہی ہے۔

اس بات کی تصدیق بآسانی اس طرح کی جاسکتی ہے جو حضرات دینی مدارس کے بارے میں یہ چلتے ہوئے فقرے تکیہ کلام کی طرح بولتے رہتے ہیں: "ان مدرسوں میں دہشت گردی کی تربیت دی جاتی ہے۔" "دینی مدرسوں میں عصری مضامین بھی پڑھانے چاہییں۔" "کیا وجہ ہے کہ ان مدرسوں سے سائنس دان پیدا نہیں ہوتے؟" وغیرہ وغیرہ۔ ان سے پوچھ لیجیے کہ "کیا آپ نے کوئی مدرسہ خود جاکر دیکھا ہے؟" "کیا آپ نے ان کا نصاب اور نظام کا جائزہ لیا ہے؟" "کیا آپ کو معلوم ہے وہ کیا کیا مضامین کن مرحلوں میں پڑھاتے ہیں؟" مجھے یقین ہے ان میں سے اکثریت کا جواب نفی ہوگا۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے یہ تنقید کتنی منصفانہ اور کتنی وزن دار ہے؟ پروپیگنڈے کے اس نقار خانے میں جہاں فضا ایسی بنادی گئی ہے کہ ان دینی مدارس کی حمایت میں کچھ بولنا اپنے سر پر دقیانوسیت، رجعت پسندی، بلکہ دہشت گردی تک کا الزام لینے کے مترادف بن گیا ہے۔ آج میں آپ کو انصاف کے نام پر دعوت دیتا ہوں برائے کرم ایک مرتبہ خود ان دینی مدارس کے نمایندوں کی بات بھی ٹھنڈے دل ودماغ سے سن لیجیے اور ان مدارس کی صحیح صورت

حال ان کی زبانی معلوم کر کے اپنے ذاتی مشاہدے سے اس کی تصدیق کر لیجیے۔ اس کے بعد بے شک آپ جو تنقید کریں یا جو اصلاحی تجاویز پیش کریں وہ خیر مقدم کی مستحق ہوں گی۔ پہلے تو یہ سمجھنے کی ضرورت ہے دینی مدارس کیا ہیں؟

معیشت وتجارت سے تقابلِ ادیان تک:

ہمارے ملک میں بڑی بھاری تعداد ایسے حضرات کی ہے جو دینی مدارس سے واقف ہی نہیں ہیں اور وہ ''دینی مدرسہ'' بس ان مکتبوں کو سمجھتے ہیں جو اکثر محلوں کی مسجدوں میں قرآن کریم ناظرہ یا حفظ پڑھانے کے لیے قائم ہیں۔ اگرچہ ہمارے ملک میں ان مکتبوں نے قرآن کریم کی تعلیم عام کرنے اور خواندگی کی شرح بڑھانے میں بڑی عظیم الشان خدمت انجام دی ہے اور یہ ''دینی مدارس'' کے نظام کا ایک حصہ بھی ہیں لیکن ''دینی مدارس'' کے نام سے جو ادارے اس وقت موضوع بحث ہیں وہ یہ مکتب نہیں بلکہ وہ تعلیمی ادارے ہیں جو ''عالم دین'' کی ڈگری دینے کے لیے سولہ سال نصاب پڑھاتے ہیں۔ یہ دینی مدارس کسی نہ کسی ''وفاق'' یا ''تنظیم المدارس'' سے ملحق اور منسلک ہیں جو ان کے لیے نصاب متعین کرتا اور مختلف مرحلوں کا اجتماعی امتحان لے کر انہیں سند جاری کرتا ہے۔

''وفاق المدارس'' کی طرف سے ان مدارس کا جو نصاب مقرر ہے اس کے تحت مکتب کی تعلیم یعنی قرآن کریم ناظرہ یا حفظ اور معمولی نوشت وخواند کے بعد تعلیم کے بعد کا پہلا مرحلہ ''متوسطہ'' کہلاتا ہے جو میٹرک کے مساوی ہے۔ اس مرحلے میں طلبہ کو وہ تمام مضامین پڑھائے جاتے ہیں جو سرکاری اسکولوں میں رائج ہیں۔ ان میں اردو، انگریزی، حساب، جغرافیہ، تاریخ، مطالعہ پاکستان اور سائنس وغیرہ تمام مروجہ مضامین شامل ہیں۔ البتہ اس میں ان دینی معلومات کا اضافہ ہے جو ایک مسلمان کے لیے ضروری ہیں۔ عام سرکاری اسکولوں یا پرائیویٹ اداروں میں اسلامیات کا جو برائے نام حصہ ہوتا ہے اس کے بجائے یہاں اچھے معیار کی دینی معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔ نیز فارسی زبان سے بھی مناسبت پیدا کی جاتی ہے تاکہ طالب علم فارسی کے علمی اور ادبی ذخیرے سے استفادہ کی صلاحیت حاصل کر سکے۔ اس کے علاوہ بہت سے دینی مدارس اسی

مرحلے میں کمپیوٹر کی تعلیم بھی دیتے ہیں۔ اس طرح جب طالب علم مرحلۂ متوسطہ سے فارغ ہوتا ہے تو وہ میٹرک کی سطح تک کے تمام عصری مضامین پڑھ چکا ہوتا ہے جو سیکولر تعلیمی اداروں میں میٹرک تک پڑھائے جاتے ہیں بلکہ ان کے ساتھ وہ اسلامیات اور فارسی زبان کی اضافی تعلیم بھی حاصل کر چکا ہوتا ہے۔

اس مرحلۂ متوسطہ کے بعد ثانویہ عالیہ اور عالیہ کے تین مراحل ہیں جن کا بنیادی مقصد اسلامی علوم کی تعلیم ہے۔ ان میں عربی زبان، اس کے قواعد، عربی اور ادب، عربی بلاغت، ترجمہ وتفسیر، حدیث، اصول حدیث، فقہ، اصول فقہ، عقائد اور قدید وجدید علم کلام کی مکمل تعلیم دی جاتی ہے۔ چونکہ خاص طور پر اصول فقہ اور کلام کے دقیق مسائل سمجھنے کے لیے منطق اور فلسفہ کو سمجھنے کی بھی ضرورت پڑتی ہے، اس لیے منطق اور قدیم وجدید فلسفہ کا تعارف بھی نصاب کا حصہ ہے۔ نیز بعض مضامین جن سے ایک عالم کو بحیثیت عالم اپنے فرائض ادا کرنے کے لیے واقف ہونا ضروری یا مفید ہے ان کو بھی تعارفی حیثیت میں داخل نصاب کیا گیا ہے۔ ان میں جدید فلکیات (Astomony) معیشت وتجارت اور تقابلِ ادیان کے مضامین شامل ہیں۔ یہ مختصراً وہ نصاب ہے جو عالیہ کے مرحلے تک تمام دینی مدارس میں پڑھایا جاتا ہے اور جس کو سرکاری طور پر ایم اے عربی واسلامیات کے مساوی تسلیم کیا گیا ہے۔ اس کے بعد بڑے دینی مدارس نے مختلف مضامین میں تخصص (Specialization) کے درجات بھی قائم کیے ہوئے ہیں۔ بعض مدارس میں فقہ کا تخصص، بعض میں حدیث کا تخصص، بعض میں دعوت وارشاد کا تخصص کرایا جاتا ہے۔ جس کی مدتیں مختلف مدارس میں ایک سال سے تین سال تک ہوتی ہیں اور بعض مدارس میں اس تخصص کے ساتھ مختلف غیر ملکی زبانیں، مثلاً: انگریزی، فرانسیسی، جرمنی وغیرہ بھی پڑھائی جاتی ہیں تاکہ یہاں کے فارغ التحصیل دوسرے ملکوں میں خدمات سرانجام دے سکیں لیکن تخصص کا یہ نظام ابھی وفاق کے تحت نہیں ہے بلکہ ہر مدرسہ اپنے طور پر اس کا انتظام کرتا ہے اس لیے یہ نظام ابھی معیار بندی (Standarization) کا محتاج ہے۔ وفاق کی طرف سے ایک مستقل نصاب کمیٹی مقرر ہے جو وقتاً فوقتاً نصاب کا جائزہ لے کر اس میں ترمیم واضافہ کرتی رہتی ہے۔



مفتی رشید احمد رحمہ اللہ کا قائم کردہ ادارہ ''دارالافتاء والارشاد'' ناظم آباد کراچی۔



مفتی رشید احمد رحمہ اللہ کے کمرے میں تصنیف وتالیف کے لیے مختص کونہ جس میں حضرت کی نشست، قرآن مجید، قلم اور خوشبو نمایاں ہے۔ آخری ایام تک حضرت یہیں تصنیف وتالیف کا کام کرتے رہے۔


جامعۃ الرشید


جامعة الرشيد



جامعۃ الرشید کے شعبہ ''کلیۃ الشریعۃ'' کا دفتر۔ کلیۃ الشریعہ میں گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ کو چار سال میں عالم دین بنایا جاتا ہے۔



جامعۃ الرشید کے شعبہ تخصص فی الافتاء کی درس گاہ۔

دوسرا بڑا اعتراض:

تمام دینی مدارس میں نہ صرف تعلیم بالکل مفت ہے بلکہ دوسرے شہروں کے طلبہ کے لیے رہائش بھی مفت ہے۔ مستحق طلبہ سے خوراک کی بھی کوئی قیمت نہیں لی جاتی اور پڑھنے کے لیے کتابیں بھی بلا معاوضہ مستعار دی جاتی ہیں۔ یہ ہے دینی مدارس کا مختصر نظام! اس کو مدنظر رکھتے ہوئے ان اعتراضات اور تبصروں پر غور فرمائیے جو عام طور پر ان مدارس پر کیے جا رہے ہیں۔ سب سے اہم تبصرہ جو دینی مدارس کے تقریباً تمام ناقدین ان پر کرتے ہیں یہ ہے ان مدارس میں مروجہ عصری علوم پڑھانے کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ یہ صرف دینی تعلیم دیتے ہیں اور طلبہ کو دنیوی علوم سے بالکل بے بہرہ رکھتے ہیں۔ بعض حضرات یہ بھی فرماتے ہیں ان مدارس سے ڈاکٹر، انجینئر وغیرہ کیوں پیدا نہیں ہوتے؟ اس تنقید پر غور کرتے ہوئے پہلے یہ اصولی بات پیش نظر رکھنی چاہیے اس وقت دنیا میں بہت سے علوم پھیلے ہوئے ہیں اور ایک شخص کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ بیک وقت ان تمام علوم کا ماہر ہو۔ یہ اختصاص (Specialization) کا دور ہے اور بہت سے ادارے صرف کسی ایک علم میں مہارت پیدا کرنے کے لیے قائم ہوتے ہیں۔ ان پر یہ اعتراض درست نہیں ہے کہ وہ دوسرے علوم میں مہارت کیوں پیدا نہیں کرتے؟ ایک میڈیکل کالج طب کی خصوصی تعلیم دیتا ہے تو اس پر یہ اعتراض نہیں کیا جا سکتا وہ انجینئرنگ کیوں نہیں سکھاتا؟ ایک لا کالج میں اگر قانون کی خصوصی تعلیم ہوتی ہے تو اس پر کوئی معقول شخص یہ اعتراض نہیں اٹھاتا اس کالج سے ڈاکٹر کیوں نہیں پیدا ہو رہے؟ اسی طرح اگر دینی مدارس صرف اسلامی علوم کی خصوصی تعلیم دیتے ہیں تو ان پر اس اعتراض میں کوئی معقولیت نہیں ہے کہ یہاں سے ڈاکٹر اور انجینئر کیوں پیدا نہیں ہوتے؟

صحیح بات یہ ہے ایک حد تک تمام وہ مضامین پڑھانے کے بعد جن کی ہر پڑھے لکھے آدمی کو ضرورت ہوتی ہے اس کے سوا چارہ نہیں کہ طالب علم اپنی ایک خصوصی لائن مقرر کر کے اس لائن میں مہارت پیدا کرے۔ دنیا بھر میں یہی ہو رہا ہے میٹرک یا او لیول کی سطح تک ضروری مضامین سب مشترک طور پر پڑھتے ہیں۔ اس کے بعد آرٹس، سائنس، کامرس، میڈیکل یا انجینئرنگ وغیرہ میں سے کسی ایک کو اختیار کر کے اس کی خصوصی تعلیم حاصل کی جاتی ہے لہٰذا اگر دینی مدارس میٹرک

کی سطح کے بعد صرف اسلامی علوم کی خصوصی تعلیم دیتے ہیں تو اس حد تک کسی اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اگر معقولیت کے ساتھ کوئی اعتراض ہو سکتا تھا، تو وہ یہ تھا یہ مدارس میٹرک کی سطح تک بھی وہ ضروری مضامین نہ پڑھائیں جو آج ہر پڑھے لکھے انسان کی ضرورت ہیں۔ یہ اعتراض بلاشبہ صحیح ہوتا، اگر ان دینی مدارس کی اس طرف توجہ نہ ہوتی لیکن جب سے مدارس میں وفاقوں کا نظام جاری ہوا ہے یہ صورت حال تبدیل ہو چکی ہے۔ اب وفاق نے تمام مدارس کے لیے جو نصاب اور نظام لازمی قرار دیا ہے۔ اس کی تفصیل میں اوپر بیان کر چکا ہوں۔ اس کی رُو سے اسلامی علوم کی خصوصی تعلیم شروع کرنے سے پہلے مدرسہ پر لازم ہے وہ میٹرک کی سطح تک تمام مروّجہ مضامین پڑھائے جن میں ریاضی، سائنس، جغرافیہ، تاریخ اور انگریزی زبان وغیرہ سب داخل ہیں اور اب بیشتر مدارس میں یہ نظام سالہا سال سے جاری ہے بلکہ ان مضامین میں بہت سے مدارس کا معیار تعلیم اگر مثالی نہیں تو عام سرکاری اسکولوں کے معیار سے یقیناً بدرجہا بہتر ہے۔ دینی مدارس کے اپنے اجتماعی نظام کے ذریعے جسے وفاق المدارس یا تنظیم المدارس کہا جاتا ہے اس رخ پر مسلسل پیش رفت ہو رہی ہے اور اس نظام میں جو بھی کمزوریاں پائی جاتی ہیں انہیں دور کرنے پر مسلسل کام ہو رہا ہے۔

ایک اور بڑا اعتراض جسے مغربی پروپیگنڈے نے عالمگیر بنا دیا ہے یہ کہا جاتا ہے ہے ان مدارس میں دہشت گردی کی تربیت دی جاتی ہے۔ یہ دہشت گردوں کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔ دینی مدارس کے ذمہ داروں کی طرف سے بار بار یہ پیشکش کی گئی ہے جس کسی کو مدارس کے بارے میں اس قسم کا شبہ ہو، اسے کھلی دعوت ہے وہ مدرسوں میں آکر خود دیکھے اور چاہے تو سراغ رسانی کے حساس ترین آلات استعمال کر کے پتا لگائے آیا کہیں ناجائز ہتھیاروں یا ان کی خفیہ تربیت گاہ کا کوئی نشان ملتا ہے؟ اگر کسی مدرسے کے بارے میں یہ ثابت ہو جائے وہاں دہشت گردی کی تربیت دی جا رہی ہے یا اس قسم کی کوئی کارروائی ہو رہی ہے تو اس کے خلاف مناسب کارروائی کا نہ صرف خیر مقدم کیا جائے گا بلکہ وفاقوں کے ذمہ دار حضرات بارہا یہ اعلان کر چکے ہیں ہم خود بھی اس کارروائی میں تعاون کریں گے لیکن تین سال سے مدارس کے خلاف دہشت گردی کا پروپیگنڈا جاری ہے اور سرکاری حلقوں سے بھی یہ مجمل بات کہی جاتی ہے بعض مدرسوں میں دہشت گردی کی تربیت دی جا رہی ہے۔

شجر سایہ دار:

سوال یہ ہے اگر کسی مدرسے کے خلاف یہ بات ثابت ہوئی ہے تو اس کا نام اور اس کی شناخت کیوں منظر عام پر نہیں لائی جاتی؟ اور بعض مدرسوں کا لفظ استعمال کر کے تمام دینی مدارس کو آخر کیوں مشکوک اور مطعون قرار دیا جارہا ہے؟ صورتِ حال یہ ہے اول تو ابھی تک دینی مدرسے کے خلاف اس قسم کا کوئی الزام میری معلومات کی حد تک ثابت نہیں ہو سکا۔ چوہدری شجاعت حسین صاحب کا یہ بیان ریکارڈ پر ہے۔ انہوں نے اپنی وزارتِ عظمیٰ کے دوران مدارس میں دہشت گردی کے الزام کی مکمل تحقیق کی اور کہا مجھے کسی مدرسے میں دہشت گردی کی تربیت کا کوئی سراغ نہیں ملا لیکن اگر فرض کریں ہزارہا دینی مدارس میں سے ایک دو مدرسوں کے بارے میں یہ الزام ثابت ہو جاتا ہے تو یہ کہاں کا انصاف ہے کہ اس کی بنیاد پر تمام دینی مدارس کو دہشت گرد قرار دے دیا جائے؟ کیا دنیا بھر کے تعلیمی اداروں میں بعض اوقات کچھ جرائم پیشہ افراد داخل نہیں ہو جاتے؟ کیا اس کی بنا پر تمام تعلیمی اداروں کو جرائم پیشہ قرار دے دینا عقل و انصاف کے کسی خانے میں فٹ ہو سکتا ہے؟

دینی مدارس کو دہشت گردی کی وارداتوں سے ہر قیمت پر منسلک کرنے کی تازہ ترین مثال لندن کے دھماکے ہیں۔ جن لوگوں کو اس دھماکے کا ذمہ دار قرار دیا جارہا ہے، انہوں نے کسی دینی مدرسے میں تعلیم نہیں پائی تھی۔ وہ برطانیہ میں پلے بڑھے اور وہیں کے ماڈرن اداروں میں تعلیم پائی۔ ان میں سے صرف ایک کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے وہ کسی وقت مختصر عرصے کے لیے لاہور آیا تھا۔ اگر یہ بات درست ہو تب بھی یہ عجیب معاملہ ہے جہاں اس نے پوری زندگی گزاری اسے چھوڑ کر پاکستان کے دینی مدارس کو اس لیے مطعون کیا جائے کہ وہ ایک مختصر وقت کے لیے یہاں آیا تھا۔ اسی واقعے کے پس منظر میں ہماری حکومت نے دینی مدارس میں باقاعدہ ویزا پر آئے ہوئے تمام غیر ملکی طلبہ کے لیے یہ اعلان کر دیا ہے انہیں فوراً ملک چھوڑنا ہوگا۔ ان میں سے بہت سے طلبہ وہ ہیں جو سالہا سال یہاں کے مدارس میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد اس مہینے اپنا آخری سال مکمل کر کے امتحان دینے والے ہیں جس پر انہیں ڈگری ملتی ہے لیکن فی الحال احکام یہ ہیں کہ انہیں اتنی بھی مہلت نہیں دی جائے گی کہ وہ اپنا امتحان دے سکیں اور اس طرح ان کی سالہا سال کی

محنت اکارت کی جارہی ہے۔ یہ سراسر ظلم نہیں تو کیا ہے؟

حقیقت یہ ہے ان غیر ملکی طلبہ کا تعلیم کے لیے پاکستان آنا ملک کے لیے ایک اعزاز ہے۔ یہ اپنے اپنے ملکوں میں واپس جا کر قومی مسائل میں ہمارے ملک کے لیے غم خواری میں کسر نہیں چھوڑتے۔ ان کے لیے پاکستان کے دروازے بند کرنے کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا وہ اب پاکستان کے بجائے ہندوستان کا رُخ کریں گے اور ایسی اطلاعات مل رہی ہیں جو والدین اپنی اولاد کو دینی تعلیم وتربیت دلانا چاہتے ہیں وہ اب انہیں بھارت بھیجنے کے انتظامات سوچ رہے ہیں۔ ان حالات میں سوال یہ ہے کیا یہ ناگہانی فیصلہ ملک کے مفاد میں ہے؟ اگر کسی خاص شخص کے بارے میں کوئی الزام ہے تو اس کے خلاف قانونی کارروائی کی کوئی مخالفت نہیں کرسکتا، وہ کارروائی ضرور کیجیے اور مدارس پہلے ہی کہہ چکے ہیں وہ اس میں حکومت کے ساتھ پورا تعاون کریں گے لیکن سارے مدارس کے تمام غیر ملکی طلبہ کو ایک سانس میں دیس سے نکالا دے دینا معقولیت اور انصاف کے کسی معیار پر پورا نہیں اُترتا۔"

یہ بات سب جانتے ہیں پوری دنیا کے مسلمان پاکستان کو اسلام کے حوالے سے شجر سایہ دار سمجھتے ہیں۔ اسی لیے وہ دینی تعلیم کے لیے پاکستان سے رجوع کرتے ہیں جس سے ملک کے سیکولر ولادین طبقے کو تکلیف ہوتی ہے۔ طرفہ تماشا ہے اسلام کے نام پر حاصل کیے گئے ملک کے لادین طبقے کو تو یہ آزادی حاصل ہے کہ وہ عیاشی کرنے کے لیے مغرب اور یورپ چلے جائیں اور ثقافتی طائفہ کو لے کر جائیں لیکن جب اسلامی ممالک کے طلبہ قرآن وسنت کا علم حاصل کرنے سرزمین پاک آئیں تو انہیں طرح طرح سے تنگ کیا جائے۔ حصول علم دین کی راہ میں روڑے اٹکائے جائیں۔ اگر ان پر القاعدہ سے تعلق کا کوئی الزام ثابت نہ کیا جاسکے تو انہیں انوسٹی گیشن یا ملک کے لیے ناپسندیدہ سرگرمیوں میں ملوث ہونے کا الزام لگا کر اُٹھالیا جاتا ہے۔ شاید ان کے نزدیک ناپسندیدہ سرگرمی "حصول علم دین" ہے۔ دینی مدارس پر الزام لگانے والے یہ بتائیں کیا کالجوں اور یونیورسٹیوں کی طرح مدارس میں بھی لڑائی جھگڑے اور اس طرح قتل عام ہوئے؟

قائد ہم شرمندہ ہیں:

مدارس پر دہشت گردی کا الزام لگانے والوں کی اطلاع کے لیے عرض ہے مدارس کے

پانچوں بورڈز کے کسی بھی نصاب میں اسلحہ سکھانے اور چلانے کا کوئی مضمون شامل نصاب نہیں؟ ہاں! اگر قرآن وسنت میں جہاد وقتال کی آیات موجود ہیں تو ان کی تعلیم دیتے ہیں۔ حکومت میں اگر جرات ہے تو قرآن سے وہ آیتیں نکال دے جن میں جہاد وقتال کا ذکر ہے۔ ہمارا مطالبہ تو یہ ہے جس طرح اسرائیل کے ہر شہری اور نوجوان کو اپنی اور ملک کی حفاظت کے لیے اسلحہ چلانا سکھایا جاتا ہے بلکہ ان پر لازم ہے، اسی طرح یہاں نوجوانوں کو بھی اجازت ملنی چاہیے اور حکومت انہیں نیم فوجی ٹریننگ دے تاکہ وہ اپنے ملک اور دین کے کسی بھی مشکل وقت میں کام آسکیں۔ جہاں تک دینی مدارس کے طلبہ کا تعلق ہے تو دینی مدارس میں پڑھنے والے طلبہ کا اپنی تعلیم میں مصروف رہنے کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ پورے دن انہیں کھیل وتفریح کے لیے صرف چند گھنٹے ملتے ہیں۔ آخر ان چند گھنٹوں میں وہ کیا دہشت گردی کی پلاننگ کریں گے؟ وہ کون سی سرگرمیاں انجام دے سکتے ہیں جن سے ملکی اور قومی مفاد کو خطرات لاحق ہوسکتے ہیں؟ اس پر ٹھنڈے دل ودماغ سے سوچنے اور غور وفکر کی پہلے بھی ضرورت تھی لیکن اس وقت اشد ضرورت ہے۔

افسوس! مسلم دنیا کے کئی دانشور بھی دینی مدارس کے راہنماؤں پر پھبتیاں کستے ہیں۔ علماء پر ایک سنگین الزام یہ ہے انہوں نے قیام پاکستان کی مخالفت کی تھی۔ اس وقت کے علمائے کرام کا موقف اصولی تھا۔ وہ کہتے تھے آپ تو کشور حسین میں بیٹھ کر عیش کریں گے جو کروڑوں مظلوم مسلمان ہندوستان میں رہ جائیں گے ان کا والی وارث کون ہوگا؟ وہ تاقیامت بے بسی کی دلدل میں اُترتے چلے جائیں گے۔ ان کی زندگی میں کبھی صبح اُمید نہیں آئے گی۔ ان علمائے کرام کو یہ اندیشہ تھا تحریک پاکستان میں شامل ہوجانے والے ہزاروں کھوٹے سکے ناقابل اعتبار ہیں۔ ان سکوں سے خیر کی کوئی اُمید نہیں، یہی ہوا۔ قائداعظم اور لیاقت علی خان کی وفات کے بعد انہوں نے کھل کھیلنا شروع کردیا۔ ملک میں سازشیں اور چھینا جھپٹی شروع ہوگئی۔

اول تو ملک میں آئین بننے نہیں دیا گیا اور جب آئین بن گیا تو اسے جلد ہی قتل کردیا گیا۔ جو لوگ حکمران بنے، وہ نہ تو اللہ کا قانون (قرآن) ماننے کے روادار تھے نہ انسان کا بنایا ہوا قانون (آئین) ماننے کے لیے تیار تھے۔ ان طالع آزماؤں کی حماقتوں کے نتیجے میں قائداعظم کا

پاکستان دو نیم ہو گیا۔ لاکھوں انسان قتل ہوئے۔ کروڑوں بے گھر اور ایک لاکھ افراد دشمن کی قید میں چلے گئے۔ قائداعظم کی روح پر قیامت گزر گئی ہوگی۔

اس وقت وطن عزیز کی کیا حالت ہے؟ غربت و مہنگائی آسمان سے باتیں کر رہی ہے۔ بھوک کی وجہ سے پورے پورے خاندان اجتماعی طور پر خودکشیاں کر رہے ہیں۔ امن و امان عنقا ہے۔ صبح کو نکلنے والا یہ سوچ کر گھر سے نکلتا ہے کہ شام کو زندہ سلامت لوٹے گا بھی یا نہیں؟ قتل و غارت کا بازار گرم ہے۔ لینڈ مافیا نے غریبوں سے چھت تک چھین لی ہے۔ ہر طاقتور کمزور کو کھانے اور مارتے چلے جا رہا ہے۔ قائداعظم نے ایسے پاکستان کا خواب تو نہیں دیکھا تھا اور ایسا پاکستان تو نہیں دیا تھا۔ کاش! ملک کے ٹھیکیدار مدارس کے پیچھے پڑنے کے بجائے ذرا اس پر سنجیدگی سے غور و فکر کریں تو بات بنے۔

ساون کے اندھے:

ایک معاصر میں "جہاندیدہ" کے عنوان سے کالم لکھنے والے نام نہاد کالم نگار "میک لودھی" نے دانشوری بکھیری ہے کہ دہشت گردی کی اصل جڑیں دینی مدارس میں ہیں۔ لہٰذا حکومت کو چاہیے وہ فوری طور پر ان کو بند کرے یا پھر ان کو مکمل طور پر اپنی تحویل میں لے لے۔ انہوں نے اپنے کالم میں زہر افشانی کرتے ہوئے مزید لکھا ہے: "مدارس وہ نرسریاں ہیں جہاں اَن پڑھ اور بے سہارا بچوں کو جہاد کی تعلیم کے بہانے دہشت گردی کی ترغیب دی جاتی ہے۔ بچوں کا ذہن ماؤف کر دیا جاتا ہے اور پھر انہیں دہشت گردی کی تربیت کے لیے بھجوا دیا جاتا ہے۔ آج پاکستان کے عوام ان مدرسوں میں ہی بوئی ہوئی فصل کا کڑوا پھل کھا رہے ہیں۔ ملک بھر میں اصلی تدریسی ادارے بند کرنے پڑ گئے ہیں اور دوبارہ کھلنے پر دیکھیں یہ دہشت گرد مزید کیا گل کھلاتے ہیں؟ یہ ہر جگہ موجود ہیں۔ پاکستان میں تقریباً چودہ ہزار رجسٹرڈ اور چھ ہزار بے قاعدہ مدرسے ہیں۔ ان کے علاوہ ملک کی ہزاروں مسجدوں پر جو مولوی قابض ہیں۔ وہ نماز جمعہ کے بعد یہ دُعا کراتے ہیں اے اللہ! پاکستان میں اسلامی حکومت قائم فرما اور نئی دہلی کے لال قلعے پر مسلمانوں کا جھنڈا گاڑ دے۔"

اسی طرح ایک مشہور ٹی وی پروگرام کے "چوراہے" پر بیٹھے "دانشورانِ قوم" وفاق المدارس

کے سیکرٹری جنرل پر اس طرح کی پھبتیاں کس رہے تھے۔ ''جالندھری صاحب! لکھ نہیں جانتے یہ مدرسے والے۔ آپ انہیں بند کیوں نہیں کر دیتے؟ اس معاشرے میں ان کا کیا کردار ہے؟ کیا کسی مدرسے نے آج تک کوئی پروفیسر، ڈاکٹر، انجینئر یا آرٹسٹ پیدا کیا ہے؟ کیا کنٹری بیوشن ہے اس ملک کی معیشت میں مدرسے کا؟ کوئی جوتا تک تو بنا نہیں سکا۔ آج تک کوئی ڈھنگ کا بندہ تو سوسائٹی کو دے نہیں سکا۔ اتنے جوتے کھانے کے بعد اب تو سمجھ آجانی چاہیے ناں۔''

سوال یہ ہے کیا ایسا ہی ہے؟ واقعی مدرسے نے آج تک کوئی ڈھنگ کا بندہ اس معاشرے کو نہیں دیا؟ واقعتاً اہل مدرسہ ایسی مخلوق ہے کہ اسے معاشرے سے باہر نکال پھینکا جائے؟ کیا ملک کو اس حال تک پہنچانے کا سہرا مدرسہ اور اہلِ مدرسہ کے سر ہی ہے؟ اور اس اعتراض میں کتنا وزن ہے کہ مدارس نے آج تک کوئی انجینئر، ڈاکٹر یا آرٹسٹ پیدا نہیں کیا۔ حقیقت میں ان سوالات کے جوابات تلاش کرنے کے لیے کسی طویل ریاضت کی حاجت نہیں لیکن ''صم بکم عمی'' کی عملی تصویر بنے والوں کو ایسے کسی جواب کی تلاش ہوتی ہے نہ ہی وہ کسی دلیل کے محتاج ہوتے ہیں۔

دلیل تو وہاں کارگر ہوتی ہے جہاں دل کے نہاں خانوں میں اخلاص کی رمق موجود ہو ورنہ اس سے بڑی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے۔ جس دن یہ پروگرام نشر ہو رہا تھا اس کے چند ہی دن بعد ایک ایسی خبر کراچی کے اخبارات کی زینت بن رہی تھی جس سے یہ پروپیگنڈا ریت کی دیوار ثابت ہو جاتا ہے۔ اس خبر کا تذکرہ بعد میں۔ پہلے ایک نظر پاکستان کی تاریخ پر ڈالیں اور تجزیہ کریں جو لوگ اس ملک کی معیشت، صنعت وتجارت اور ترقی میں حصہ نہ ڈالنے پر اہلِ مدرسہ کو طعنے دیتے ہیں، انہوں نے وطنِ عزیز کو کہاں پہنچایا؟ پاکستان کو بنے 62 سال سے زائد ہو چکے ہیں، لیکن ترقی کے بجائے زوال ہی زوال ہے۔ پہلے اسکولوں کی جو کارکردگی آج سے دس سال پہلے تھی، آج وہ اس سے بھی بدتر ہے۔ یونیورسٹیاں اور کالج جو افراد آج سے ایک دہائی قبل فراہم کرتے تھے، وقت کے ساتھ ساتھ اس کی شرح میں کوئی ایسا اضافہ نہیں ہو سکا جس پر فخر کیا جائے۔

سوال گندم، جواب چنا:

آج ملک بھر میں 125 نجی وسرکاری یونیورسٹیاں ہیں لیکن دنیا کی 500 بہترین

یونیورسٹیوں میں اب تک کوئی ایک بھی اپنا نام نہیں لکھوا سکی۔ مانا کہ مدرسہ اور اہلِ مدرسہ نے اس ملک کی معیشت اور صنعت وتجارت میں کوئی کردار ادا نہیں کیا لیکن ''اکابرینِ پاکستان'' کو بھی ایک نظر ملاحظہ فرمایئے۔ 62 سالوں میں چند ایک کے استثناء کے ساتھ مقتدر طبقے کے اعلیٰ ترین افراد کی فہرست تقریباً 40 کی بنتی ہے۔ 4 گورنر جنرل آئے، صدارت کی کرسی پر 10 حضرات براجمان ہوئے۔

ایک نائب صدر بنے۔ وزارتِ عظمیٰ کی مسند پر کل 19 وزیراعظم بیٹھے۔ 5 نگران وزیراعظم اور ذوالفقار علی بھٹو کی شکل میں ایک نائب وزیراعظم کا عہدہ دیکھا گیا۔ ان افراد کو آپ پاکستانی تاریخ کی ''کریم'' کہہ سکتے ہیں۔ صدر زرداری اور وزیراعظم گیلانی کو ملا کر یہ تعداد 42 تک جا پہنچتی ہے۔ ان میں سے کوئی ایک بھی مدرسے کا فارغ التحصیل نہیں۔ پھر آخر کیا وجہ ہے یہ ملک ترقی نہیں کر سکا؟ کیوں ہم روز بروز زوال کی طرف جا رہے ہیں؟ اس ملک کے دو ٹکڑے کرنے میں بھی کون ملوث تھا؟ بتانے کی ضرورت نہیں۔

آج دنیا بھر میں پاکستان کرپشن، لوٹ مار اور لاقانونیت کا استعارہ بن چکا ہے، کیا اس کا الزام بھی مدرسے کو دیا جائے گا؟ حقیقت یہ ہے کہ ملک کو یہاں تک پہنچانے میں انہی لوگوں کا ہاتھ رہا جو مغرب کی یونیورسٹیوں سے نکلے۔ جو ان کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔

اگر مدرسہ نے ملک کی معیشت یا صنعت وتجارت میں کوئی حصہ نہیں ڈالا تو کم از کم اس کی بربادی میں بھی شریک نہیں رہا۔ جہاں تک کالج یونیورسٹی کی تعلیم ہے تو اس سے کسی کو انکار نہیں لیکن اربابِ مدرسہ کو اس لیے مطعون کرنا کہ ملک کی معیشت میں کوئی کردار ادا نہیں کیا۔ وہ ایک جوتا تک نہیں بنا سکے۔ کوئی مدرسہ ڈاکٹر، انجینئر نہیں بنا سکا۔ ماہر معاشیات اور آرٹسٹ نہیں دے سکا۔

یہ سوچ دانشوری کا جنازہ نکالنے کے مترادف ہے۔ فرض کریں اسی کو دلیل بنایا جائے تو پھر یہ سوال میڈیکل اور انجینئرنگ کالجز سے بھی ہو سکتا ہے۔ کوئی عقل مند آدمی ایسا نہیں کرے گا کہ میڈیکل ڈاکٹر کو اس لیے قصوروار قرار دے کہ اس نے زندگی بھر پڑھا، لیکن ایک سوئی نہیں بنا سکتا۔ کسی مکان کا نقشہ نہیں بنا سکتا۔ کوئی کسی انجینئر پر اس لیے افسوس کا اظہار نہیں کر سکتا کہ سالہا سال

پڑھا، لیکن سرجری نہیں کرسکتا۔ نزلہ زکام کا علاج تک اسے نہیں آتا۔

کوئی ہم سا ہو تو سامنے آئے:

میڈیکل کالج سے یہ توقع ضرور رکھی جائے گی اس نے کوئی اچھا ڈاکٹر کیوں نہ دیا؟ انجینئرنگ کالج سے یہ گلہ ضرور کیا جانا چاہیے کہ بہترین انجینئر کیوں پیدا نہیں کیے؟ دانشوروں کی بات میں وزن تب ہوتا جب مدرسہ سے یہ شکوہ کیا جاتا اچھی استعداد والا عالم کیوں پیدا نہیں کیا؟ قرآن وحدیث پر نظر رکھنے والا بہترین فرد معاشرے کو کیوں نہ دیا؟ اچھا حافظِ قرآن کیوں نہیں بنا سکا؟ اہلِ مدارس نے جو بیڑا اٹھایا تھا، اس میں تو وہ کافی حد تک کامیاب رہے۔

ایک ایسے وقت میں جبکہ چاروں طرف سے دینی مدارس کے خلاف پروپیگنڈا مہم زوروں پر ہے اور ان کا شاندار تعلیمی کردار نظر انداز کر کے انہیں دہشت گردی کے واقعات سے جوڑنے کی سوچی سمجھی کوششیں جاری ہیں۔ کراچی کے ایک دینی مدارسے ادارہ معارف القرآن گلشن اقبال کے طلبہ نے اپنی تعلیمی کارکردگی سے مدارس کا میڈیا ٹرائل کرنے والوں کو بڑا مسکت جواب دے دیا ہے۔ اس ادارے کی پوری کلاس نے میٹرک بورڈ کے تحت کمپیوٹر سائنس اور بیالوجی کے مضامین میں اے ون گریڈ حاصل کر کے تعلیمی میدان میں ریکارڈ قائم کر دیا ہے۔ یہ طلبہ 18 جولائی سے شروع ہونے والے وفاق المدارس العربیہ کے امتحانات میں بھی شریک ہوں گے۔

دوسری طرف ادارہ معارف القرآن کے 8 سالہ طالب علم سعید مجیب نے رابطہ عالم اسلامی کے تحت ہونے والے مقابلہ حفظ قرآن میں پاکستان کی سطح پر پہلی پوزیشن حاصل کر کے مکہ مکرمہ میں ہونے والے عالمی مقابلے کے لیے کوالیفائی کر لیا ہے۔ یوں اس ادارے نے بیک وقت دینی اور عصری دونوں نظامہائے تعلیم میں شاندار کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے۔ دینی مدارس کی کردار کشی کرنے والوں اور ان پر دہشت گردی کی تربیت دینے کا الزام لگانے والوں کو دینی مدارس کی یہ بے مثال تعلیمی خدمات بھی نظر آنی چاہییں۔ اس ایک ادارے کی یہ کارکردگی محض ایک مثال ہے۔ پاکستان کے تمام دینی مدارس اپنی اپنی جگہ اپنے اپنے وسائل اور حالات کے مطابق اسی طرح کی نمایاں خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تمام تر مخاصمانہ پروپیگنڈے اور ہر قسم کی مخالفانہ

سازشوں کے باوجود دینی مدارس کی خدمات پر عوام کا اعتماد کم ہونے کے بجائے بڑھتا ہی جا رہا ہے۔

مدارس پر بے جا اعتراض:

مدارس پر ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ مدرسے ڈاکٹر، انجینئر تیار کیوں نہیں کرتے؟ تو عرض ہے مدرسے نے عالم، حافظ اور دین کا علم رکھنے والے افراد تیار کرنے تھے نہ کہ ڈاکٹر، انجینئر اور پروفیسر۔ ناکامی تو ''روشن خیال'' طبقے کی ہے جو کام اس کے کرنے کا تھا اسے پورا نہ کرسکا۔ اہلِ مدارس نے تو عصری علوم کا بیڑا اُٹھایا ہی نہیں۔ اگر کوئی ادارہ اس طرف گیا بھی تو وہاں بھی اپنا لوہا منوایا ہے۔ بیسیوں مثالیں ہیں لیکن یہاں صرف دو مثالیں دوں گا۔ ایک وفاقی دارالحکومت کی اور دوسری خبر کراچی کی جس کا تذکرہ کر چکا ہوں۔

اسلام آباد میں ''ادارہ علوم اسلامی'' کے نام سے ایک مدرسہ ہے۔ 1990ء میں قائم ہونے والے اس مدرسے نے اپنے قیام سے اب تک فیڈرل بورڈ کے نتائج کو ''ہائی جیک'' کیا ہے۔ اس ادارے کے عصری علوم کا نتیجہ ہمیشہ 100 فیصد رہا۔ 17 سالہ تاریخ میں کوئی ایک طالب علم بھی میٹرک یا انٹر میں ناکام نہیں ہوا۔ صرف گزشتہ پانچ سالوں کا ریکارڈ ملاحظہ کیجیے: 2004ء میں میٹرک کے امتحان میں بورڈ کی پہلی اور دوسری پوزیشنیں اس مدرسے کے بوریہ نشینوں نے حاصل کیں۔ 2005ء کے میٹرک امتحان میں دوسری پوزیشن حاصل کی۔

2006ء کے میٹرک بورڈ میں پہلی اور ایف اے کی دوسری پوزیشن اس ادارے کے طلبہ لے اُڑے۔ 2007ء کے میٹرک امتحان میں فیڈرل بورڈ سے دوسری پوزیشن حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔ اسی طرح وہ خبر بھی ملاحظہ کیجیے جو چند دن قبل اخبارات کی زینت بنی۔ خبر ہے: ''انٹر بورڈ کراچی کے تحت انٹر سال دوم آرٹس کے سالانہ امتحانات 2009ء کا نتیجہ آگیا ہے۔ پہلی تینوں پوزیشنیں طالبات نے حاصل کرلیں۔ خاص بات یہ ہے کہ پوزیشنیں حاصل کرنے والی تینوں طالبات کا تعلق دینی مدارس سے ہے۔

نئی صبح کی اُمید:

حافظہ عائشہ ناز نے پہلی، طوبیٰ احمد نے دوسری اور قذافیہ مہین نے تیسری پوزیشن لی ہے۔

واضح رہے ''جامعۃ المحصنات'' کی طالبہ طوبیٰ احمد نے 12 پرچوں کا کمبائن امتحان دیا تھا۔'' یہ مثالیں تو دینی مدارس کے ان طلبہ اوران طالبات کی ہیں جنہوں نے دینی علوم کے ساتھ ساتھ عصری علوم کے میدان میں کامیابی کے جھنڈے گاڑے لیکن اس کے مقابلے میں کیا کوئی ایک بھی ایسی مثال پیش کی جاسکتی ہے کہ اولیول، اے لیول کے کسی طالب علم نے مدارس کے نظام کے تحت امتحان میں پوزیشن...... پوزیشن تو درکنار کامیابی بھی ...... حاصل کی ہو۔

اگر مدارس کے طلبہ سے یہ توقع رکھی جاتی ہے کہ وہ ڈاکٹر، انجینئر اور آرٹسٹ کیوں نہیں بنتے تو پھر کالج اور یونیورسٹی سے بھی یہ شکوہ کرنا چاہیے کہ وہاں سے کوئی عالمِ دین، حافظ قرآن کیوں نہیں بنتا؟ اگر مدارس پر دقیانوسیت کی پھبتی کسی جاتی ہے تو پھر ''چالیس پاروں والے وزیرِ تعلیم'' کی دینی استعداد پر بھی بات کرنی چاہیے۔ اگر ''چوراہے'' پر بیٹھے دانشور اے، اولیول کے دینی ماہر نہیں لاسکتے تو پھر چاہیے کہ کراچی بورڈ میں پوزیشن حاصل کرنے والی دینی مدارس کی طالبات کو داد دی جائے۔ کم از کم طوبیٰ احمد تو ضرور اس داد کی مستحق ہے، جنہوں نے مدرسے کے کڑے امتحانات کے ساتھ انٹر میں کمبائن پرچے دے کر پوزیشن حاصل کی۔

نام نہاد دانشور، مغربی اسکالر اور مستشرقین میڈیا کے ذریعے کبھی پگڑیوں کے خلاف بولتے اور لکھتے ہیں، کبھی پردے کو تضحیک کا نشانہ بناتے ہیں۔ کبھی موسیقی کو جائز قرار دیتے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں دس پندرہ احادیث صحیح ہیں باقی سب ضعیف ہیں۔ کبھی کہتے ہیں بچوں کو شروع سے دینی تعلیم نہیں دینی چاہیے۔ کبھی جہاد کو دین سے نکالتے ہیں تو کبھی دیگر غلط سلط قسم کی باتیں پھیلا کر سمجھتے ہیں کہ نئی نسل کو امریکی اور یورپی نظریات کے مطابق ڈھال لیں گے۔

یہ ہزاروں دینی مدارس سے متعلقہ افراد ہی تو ہیں جو ان کے اس قسم کے گمراہ کن نظریات کا تسلی بخش، مسکت اور ٹھوس علمی جواب دیتے ہیں۔ مجھے یاد آیا ایک دن میں ایک مدرسے کے چمن سے گزرتے ہوئے جب پھولوں کے پاس پہنچا تو خوشبو کا ایک تیز جھونکا ہوا کے دوش پر چلتا ہوا میرے وجود کو چھو کر گزر گیا اور ایک نئی صبح کی اُمید میرے گوش گزار کر گیا۔ میں دھیمے دھیمے چلتا ہوا لائبریری میں داخل ہوا۔ میرے ساتھی مطالعے میں مصروف تھے۔

زہریلے مضامین:

میز پر مختلف قسم کے انگلش اخبار بکھرے پڑے تھے۔ میں ایک انگریزی اخبار اُٹھا کر اس کا سرسری جائزہ لینے لگا۔ اندرونی صفحات کو پڑھتے ہوئے میری نظر ایک کالم پر پڑی اور میں نے اس کو غور سے پڑھنا شروع کیا۔ دراصل کالم پر لکھے عنوان نے مجھے اس کو پڑھنے پر مجبور کیا تھا۔ میں نے کالم پڑھا اور حیرت سے فضاؤں میں گھورنے لگا۔ آپ بھی حیران ہوں گے اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟

یہ کالم ایک خاتون کا تھا جس کا عنوان انہوں نے رکھا تھا: ''Pampering the Mullah'' جس کا مطلب ہے لاڈ اور پیار سے مُلّا کو بگاڑ دینا۔ محترمہ نے اس کالم میں وفاق المدارس اور علمائے دیوبند کے خلاف اپنی بھڑاس نکالنے کی کوشش کی ہے۔ محترمہ نے وفاق المدارس کے اس بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے انتہائی جانبداری سے کام لیا ہے جو وفاق المدارس نے حکومت کے مدارس پر چھاپے مارنے کے بعد دیا تھا کہ حکومت خواہ مخواہ مدارس کو تنگ نہ کرے اور حکومت نے بعد میں معذرت خواہانہ انداز میں کہا تھا: ''ہم مدارس کے خلاف ایکشن نہیں لے رہے بلکہ افغان ائمہ کو ڈھونڈنا چاہتے ہیں۔''

انہوں نے زبان درازی کرتے ہوئے کہا حکومت ہمیشہ مدارس کے بارے میں ایسا معذرت خواہانہ رویہ کیوں اختیار کرتی ہے؟ مدارس اتنے مقدس نہیں کہ ان کو قانون سے بالاتر سمجھا جائے۔ اس ضمن میں انہوں نے شہدائے لال مسجد پر تنقید کی کہ وہ لوگ غیر قانونی کام کر رہے تھے۔ اس کے بعد محترمہ کی کم علمی کہیں یا کچھ اور؟ انہوں نے کہا جب پاکستان بن رہا تھا تو تمام علمائے دیوبند نے ابتدا سے انتہا تک اس کی مخالفت کی اور جب پاکستان بن گیا تو یہ لوگ آکر ہمارے سروں پر سوار ہو گئے۔

مزید کہا ذوالفقار علی بھٹو سے لے کر نواز شریف تک اور جنرل ضیاء الحق سے لے کر پرویز مشرف تک تمام حکمرانوں اور ڈکٹیٹروں نے ان ملاؤں کو اپنے کارڈ کے طور پر استعمال کیا جس کی وجہ سے انتہا پسندی بڑھی ہے۔ محترمہ نے ایسے الفاظ استعمال کیے جسے بیان کرتے ہوئے شرم آتی

ہے۔ دراصل محترمہ نے شاید اپنے آقاؤں کو خوش کرنے کے لیے یہ باتیں کی ہیں۔ عرض کرنا چاہتا ہوں محترمہ نے کہا حکومت مدارس کے خلاف ایکشن کیوں نہیں لیتی؟

تنقید کے بے رحم تیر:

شاید انہیں نظر نہیں آرہا تھا یہ علم کے وہ واحد مراکز ہیں جو ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں فرزندانِ اسلام کو علم کی دولت سے مالا مال کررہے ہیں۔ جو ہمارے ملک کا عظیم سرمایہ ہیں۔ یہ ملا ہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے انگریز کو برصغیر چھوڑنے پر مجبور کیا۔ اگر آپ تاریخ کا مطالعہ غور سے کرتیں تو علماء کی وہ قربانیاں ضرور سامنے آتیں جو انہوں نے انگریز کو برصغیر سے نکالنے پر دیں اور جس کے نتیجے میں پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔ تحریک ریشمی رومال اور مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی قربانیاں شاید بھول گئی ہیں۔

1857ء کی جنگ آزادی جس کی ناکامی کے بعد دہلی کے ہر درخت پر ایک عالم کی لاش لٹک رہی تھی۔ یہ وہی کوششیں تھیں جن کے نتیجے میں پاکستان بنا۔ یہ تاریخ کو یکسر نظر انداز کرنے والی بات ہے۔ یہ علمائے دیوبند کے ہی ہیرے تھے جنہوں نے دن رات ایک کرکے لوگوں کو پاکستان کے لیے قائل کیا تھا۔

مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ دیوبند کے ہی ہیرے تھے جنہیں خود قائداعظم نے سرحد کے لوگوں کو پاکستان کے حق میں ووٹ ڈالنے کے لیے قائل کرنے کو کہا تھا اور سب سے بڑی بات حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ علمائے دیوبند کے وہ عظیم الشان ہیرے تھے جنہوں نے اس مملکت خداداد اسلامی جمہوریہ پاکستان کا پرچم پہلی مرتبہ بلند کیا۔ یہ سعادت، اللہ نے علمائے دیوبند کے حصے میں لکھی تھی۔

شاید تاریخ کا مطالعہ کرتے ہوئے ان صفحات کو پڑھنا بھول گئیں۔ محترمہ نے شہدائے لال مسجد پر تنقید کی کہ وہ لوگ غیر قانونی کام کررہے تھے۔ عبدالرشید غازی شہید تو آخری وقت تک کہتے رہے ہم امن چاہتے ہیں۔ آپ لوگ میڈیا کو اندر آنے دیں تاکہ وہ لوگوں کو اصل حقائق سے آگاہ کرسکے لیکن طاقت اور اقتدار کے نشے میں مست فرعون ان معصوم جانوں کو قتل کرنے پر آمادہ ہوچکے تھے اور پھر انہوں نے وہ کارنامہ سرانجام دیا جو تاریخ اسلام میں سیاہ باب بن کر ہمیشہ یاد

رہے گا۔ انہوں نے مولانا فضل الرحمٰن کے سیاست میں آنے اور کامیابی حاصل کرنے پر بھی تنقید کی اور اس ضمن میں آپ نے پھر وفاق المدارس کے خلاف نازیبا الفاظ استعمال کیے۔

سیاست میں حصہ لینا جرم ہے؟

کیا علمائے دیوبند سیاست میں حصہ نہیں لے سکتے اور ان کی کامیابی آپ کو کیوں نہیں بھاتی؟ محترمہ نے کہا یہ لوگ ہمارے سروں پر سوار ہو گئے۔ یہ بات رکھیں! ملا ہیں تو پاکستان کا وجود ہے۔ اگر آج امریکا کو کسی سے خطرہ ہے تو ان ملاؤں سے خطرہ ہے۔ جو ہماری جغرافیائی اور نظریاتی دونوں سرحدوں کی حفاظت کرتے ہیں۔

اسی لیے علامہ اقبالؒ نے کہا تھا: ''ان ملاؤں کو اپنے حال پر رہنے دو...... اگر یہ نہ ہوتے تو جانتے ہو پھر کیا ہوتا؟ پھر وہ ہوگا جو اندلس میں ہوا جہاں مسلمانوں کی سوسالہ شاندار حکومت کے بعد آج وہاں کھنڈرات کے علاوہ کسی تہذیب اور مذہب کا نام ونشان نہیں ملتا۔'' اس لیے تنقید برائے تنقید اچھی نہیں ہوتی۔ لوگوں کو اصل حقائق سے آگاہ کرنا دانش مندی کہلاتا ہے۔ یہ کام بغیر ضمیر کے اور بغیر ہمت اور جرأت کے کافی مشکل ہے۔ گزشتہ دنوں ایک دفعہ پھر ایک معروف دانشور نے ''ملا'' پر شدید تنقید کی۔ اس کا جواب ہمارے ایک محترم دوست نے بڑے اچھے انداز میں دیا ہے۔ وہ میں یہاں نقل کرنا چاہتا ہوں۔ مخصوص انداز میں لکھتے ہیں: ''پاکستان میں دانشوروں اور کالم نگاروں کے لیے سب سے آسان کام ''ملا'' پر تنقید کرنا اور علمائے دین کی کردار کشی کرنا ہے۔ آپ کسی بھی دن کا اخبار اٹھا کر دیکھیں، آپ کو علماء دشمنی کا کوئی نہ کوئی شاہکار ضرور نظر آئے گا۔ ٹھیک ہے علماء بھی اسی معاشرے کا حصہ ہیں۔ ان سے بھی غلطیاں ہو سکتی ہیں اور ہو جاتی ہیں۔ اسلام میں ویسے بھی کوئی پاپائیت نہیں ہے کہ علماء کو تنقید سے بالاتر قرار دیا جائے۔ ''ملاوں'' کا طبقہ ویسے بھی ہمیشہ ''فرقہ ملامتیہ'' سمجھا جاتا ہے۔ حکمرانوں، سیاستدانوں اور گزشتہ تین سو سالوں سے ترقی ترقی کی رٹ لگانے والے مغرب زدہ دانشوروں سمیت جو بھی طبقہ اپنے شعبے میں ناکام ہے وہ اپنی اس ناکامی کی ذمہ داری ''ملا'' پر ڈال دیتا ہے۔

''الا بلا بر گردن ملا'' ایک مجرب نسخہ ہے۔ تنقید اور اختلاف بھی کچھ سلیقے، قرینے، دلائل اور

زبان و بیان کے آداب کا تقاضا کرتا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں اس کا لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ ہمارے بعض کالم نگاروں نے تو علماء اور بعض دینی رہنماؤں پر الزام تراشی اور دشنام طرازی کو گویا اپنا وظیفہ بنالیا ہے۔ یہاں سیکولر اور لادین دانشوروں کی بات نہیں کی جارہی کہ ان کا ''ملا'' پر غصہ قابل فہم ہے۔ گلہ ان دانشوروں اور کالم نگاروں سے ہے جو اسلام کی بات کرتے، قرآن وحدیث کے حوالے دیتے اور اپنے زعم کے مطابق تصوف کے اسرار ورموز کی تشریح بھی کررہے ہوتے ہیں اور ساتھ ہی ''ملا'' کو جس کی صدیوں کی ریاضت، جفاکشی اور دینی تصلب کے طفیل قرآن وحدیث، سلوک وطریقت اور جہاد وعزیمت کا ورثہ محفوظ شکل میں ان تک پہنچا ہے، ہمیشہ بے رحمانہ تنقید کے نشتر کی نوک پر رکھنا ضروری سمجھتے ہیں۔

ایک آسان ترین کام:

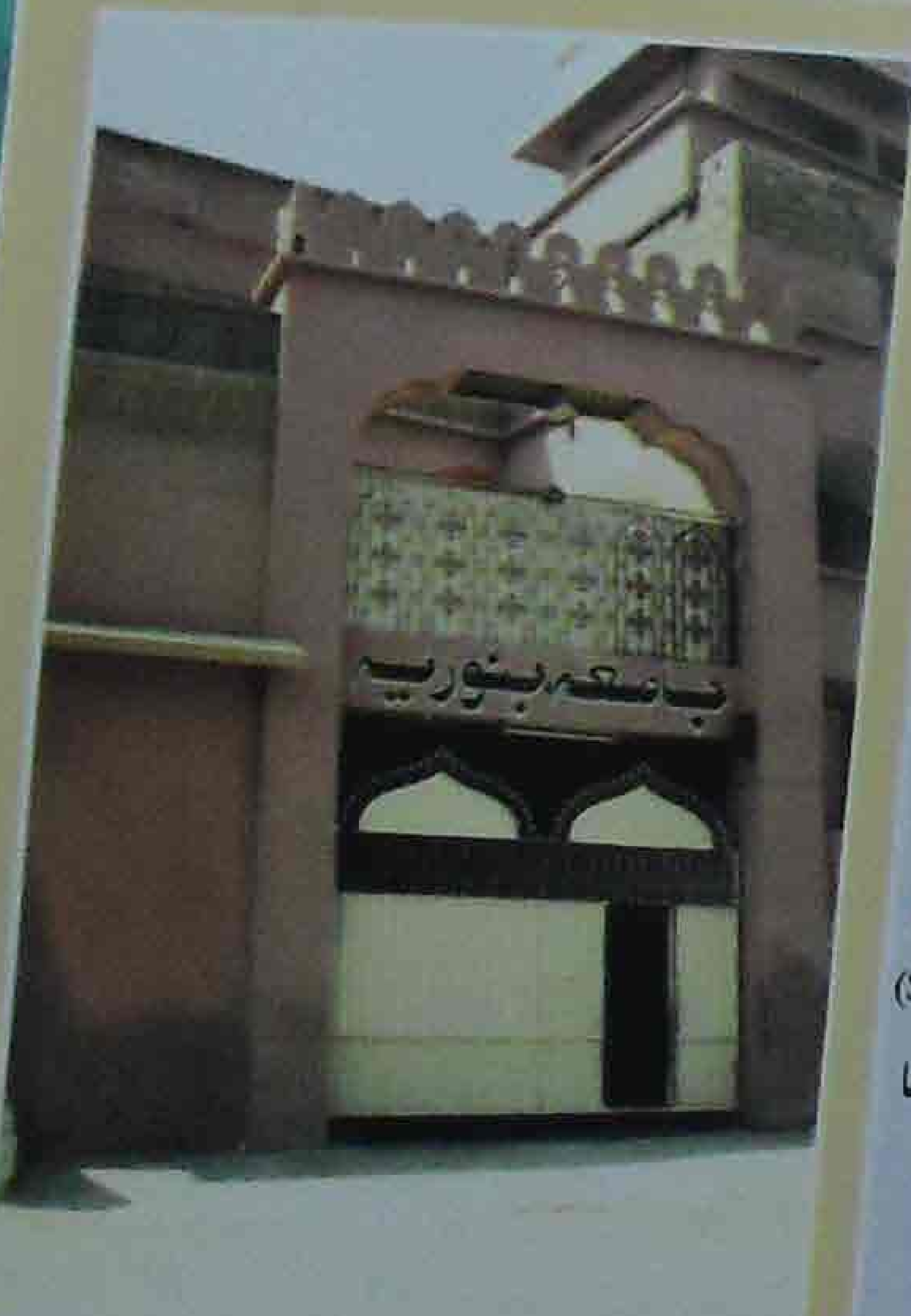
''ناتمام'' کالموں کا ایک طرح سے مستقل موضوع ہی ''ملا'' کو بنا رکھا ہے حالانکہ انہوں نے خود لکھا ہے کہ ان کے والد قطب وقت مولانا احمد علی لاہوریؒ سے بیعت تھے، یعنی خود ہارون صاحب کی خمیر میں ایک ''ملا'' کے علمی وروحانی فیض کی آمیزش موجود ہے۔ یہ احادیث کے بہت حوالے دیتے ہیں۔ انہیں وہ حدیث بھی پیش نظر رکھی جانی چاہیے جس میں پچھلے زمانے کے دینی بزرگوں اور روحانی آباؤ اجداد کو برا بھلا کہنے کو قیامت کی نشانیوں میں شمار کیا گیا ہے۔ انہوں نے اپنے سابقہ کالم ''ملا وملحد'' میں مسئلہ قادیانیت کے حوالے سے علماء کے موقف کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا ہے اور الزام عائد کیا ہے علماء پاکستان میں ہونے والی دہشت گردی کی کارروائیوں کی کھل کر مذمت نہیں کرتے۔ پہلے قادیانیت کے مسئلے کو ہی لے لیتے ہیں۔ لاہور میں قادیانی مراکز پر حملہ ہوا تو اس پر تحفظ ختم نبوت کے محاذ پر کام کرنے والی علماء کی سب سے بڑی تنظیم عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کا بیان جن تمام اخبارات اور چینلوں سے شائع اور نشر ہوا جس میں اس واقعے کی بالکل واضح اور دوٹوک الفاظ میں مذمت کی گئی اور یہ وضاحت بھی کی گئی ان واقعات کا اسلام کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ تحفظ ختم نبوت کے علماء کی سوسالہ پرامن جدوجہد کو نقصان پہنچانے کی سازش ہے۔ علماء نے گرفتار ملزمان سے تفتیش کرکے اصل حقائق قوم کے سامنے لانے کا مطالبہ بھی کیا۔ انہوں نے میاں نواز شریف

کے بیان پر علماء کے ردعمل کو غلط قرار دیا اور الزام لگایا مذہب کو سیاست کے لیے استعمال کرنے والے ملاؤں نے سیاسی مقاصد کی خاطر نواز شریف پر فتوے لگائے۔

دلچسپ امر یہ ہے خود اسی کالم میں انہوں نے قرار دیا کہ اس بیان کو میاں نواز شریف کی جانب سے زبان وبیان کے استعمال میں ان کی روایتی کمزوری پر محمول کیا جانا چاہیے۔ یہ اگر انصاف کی نظر سے دیکھیں تو علماء نے کا بھی یہی موقف ہے میاں صاحب نے ایک انتہائی اہم اور حساس مسئلے پر غیر محتاط انداز تعبیر اختیار کیا ہے۔ انہیں اس کی وضاحت کرنی چاہیے۔ اب اگر میاں نواز شریف اپنے اس بیان کی وضاحت نہیں کرتے اور اپنی غلطی تسلیم نہیں کرتے تو علماء ان کی غلطی کی نشاندہی کرتے رہیں گے۔ ان جیسے دانشوروں کو یہ بتلانے کی تو ضرورت نہیں ہوسکتی جس طبقے کو مصور پاکستان علامہ اقبال نے اسلام اور وطن کا باغی قرار دیا تھا، اس کو علی الاطلاق ''بھائی'' قرار دینا کتنی بڑی غلطی ہے؟ رہا فتوے لگانے کا معاملہ تو یقیناً ان فتوے کی اصطلاح سے واقف ہوں گے۔ پاکستان میں کسی مفتی یا عالم دین نے نواز شریف پر کوئی فتوی نہیں لگایا۔ ہندوستان کے کچھ علماء نے میاں صاحب کو اپنے بیان کی وضاحت نہ کرنے پر فتویٰ دینے کا انتباہ ضرور کیا تھا۔ ظاہر ہے ان علماء کا پاکستان کی سیاست سے کوئی لینا دینا نہیں ہے کہ ان پر ''سیاسی فتوے'' لگانے کا الزام عائد کردیں۔

کیا یہ فرقہ واریت نہیں ہے؟:

پاکستان کے سیاسی علماء نے سیاسی بیانات ضرور دیے ہیں، فتوی کسی نے نہیں دیا۔ کالم نگار نے الزام لگایا ہے جامعہ اشرفیہ کے اجلاس میں علمائے دیوبند نے پاکستان میں تخریب کاری کے واقعات کی کھل کر مخالفت نہیں کی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے ان کے اس دعوے کا ماخذ مخصوص ذہنیت کے حامل ایک انگریزی اخبار کی وہ بے بنیاد رپورٹ ہے جو جامعہ اشرفیہ میں ہونے والے اجلاس کے تقریباً دو ہفتے بعد شائع ہوئی تھی جس میں دعوی کیا گیا تھا کہ اجلاس میں دیوبندی علماء نے خودکش حملوں کی مخالفت سے گریز کیا۔ حالانکہ خود اس اجلاس کا اعلامیہ اس وقت بھی میڈیا کے ریکارڈ میں موجود ہے: جس میں جہاں حکمرانوں کی غلط پالیسیوں کو حالات کی خرابی کا ذمے دار قرار دیا گیا ہے، وہاں اس کی شق نمبر 4 یہ بھی واضح کرتی ہے لیکن یہ بھی اپنی جگہ حقیقت ہے کہ حکومت کی غلط پالیسیوں کا مطلب یہ نہیں ہے



کراچی کی ایک
اور معروف درسگاہ
''جامعہ بنوریہ'
سائٹ کراچی''
جہاں کمپیوٹر کورس
اور انگریزی کے
لیے مستقل تخصص
(Specialization)
کا ایک سال رکھا
گیا ہے۔

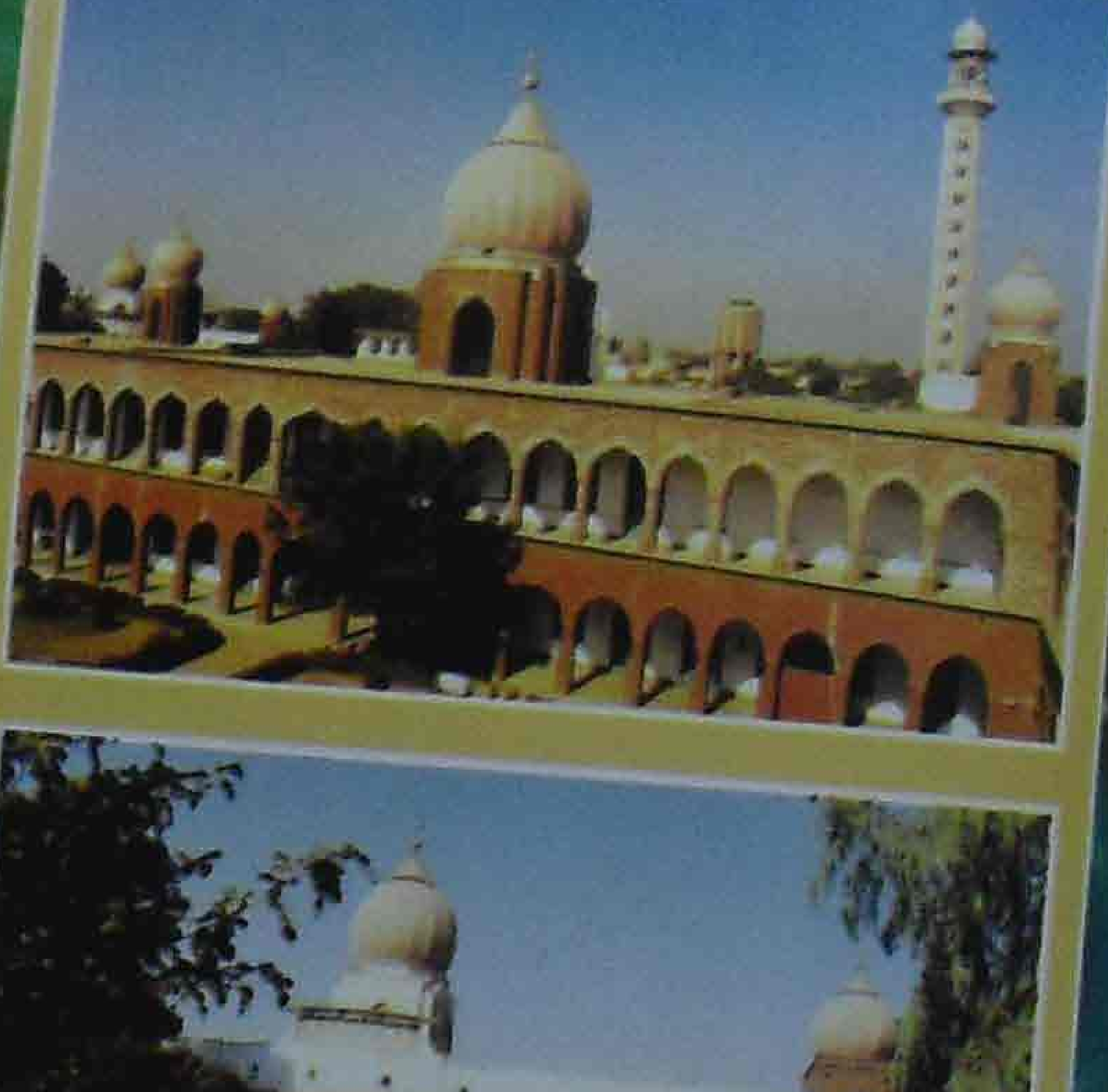


جامعہ بنوریہ سائٹ ایریا کراچی کی جدید عمارت۔





صدر وفاق المدارس جناب مولانا سلیم اللہ خان صاحب دامت برکاتہم کا اپنے ہاتھوں سینچا ہوا پودا "جامعہ فاروقیہ" جو اَب ایک مضبوط تنآور درخت کا روپ دھار چکا ہے۔ یہاں کے طلبہ کے علمی ذوق کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ جس سال جامعہ کے قیمتی اساتذہ مولانا عنایت اللہ اور مفتی اقبال صاحب وغیرہ دہشت گردی کا نشانہ بنا کر شہید کر دیے گئے اور سارا تعلیمی نظام بری طرح متاثر ہوا، اس سال جامعہ کے ایک طالب علم نے 100 فیصد نمبروں کے ساتھ وفاق میں اول پوزیشن لے کر دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا۔





جامعہ اشرفیہ لاہور کی وسیع درسگاہوں اور کشادہ دارالاقامہ کا پرشکوہ منظر: یہ قدیم عمارتیں دینی مدارس کی قدامت اور مملکتِ پاکستان میں ان کی گہری جڑوں کی آئینہ دار ہیں۔ جامعہ اشرفیہ جدید وقدیم علوم کے لیے کشادہ روی میں مشہور ہے اور یہاں کے طلبہ کے لیے مذہبی علوم کے ساتھ انگریزی اور کمپیوٹر کی تعلیم کے لیے مستقل ایک سال رکھا گیا ہے تاکہ جدید تقاضوں کے مطابق علم نبوی کی میراث لوگوں تک منتقل کی جاسکے۔





1947ء سے قائم ''جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک''۔ اس کی بنیاد دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کرنے والے مولانا عبدالحق رحمہ اللہ نے رکھی۔ یہ مدرسہ اس علاقے میں سب سے بڑا دینی ادارہ شمار ہوتا ہے۔ اب تک سینکڑوں علماء یہاں سے فارغ التحصیل ہو چکے ہیں۔

ہم خود اپنے گھر کو آگ لگا بیٹھیں، لہٰذا ہم پورے اعتماد اور دیانت کے ساتھ اس بات پر یقین رکھتے ہیں پاکستان کے موجودہ حالات میں نفاذ شریعت اور ملک کو غیر ملکی تسلط سے نجات حاصل کرنے کے لیے پُرامن جدوجہد ہی بہترین حکمت عملی ہے اور مسلح جدوجہد شرعی اعتبار سے غلط ہونے کے علاوہ مقاصد کے لیے بھی سخت مضر ہے۔ اس کا براہِ راست فائدہ ہمارے دشمنوں کو پہنچ رہا ہے۔ امریکا اُسے اس علاقے میں اپنے اثر و رسوخ کو دوام بخشنے کے لیے استعمال کر رہا ہے۔"

یوں علماء نے پاکستان میں تخریب کاری کے واقعات کو واضح الفاظ میں شرعی لحاظ سے غلط اور دشمنوں کے لیے فائدہ مند قرار دیا ہے۔ کیا اس کے بعد بھی یہ کہنے کی گنجائش موجود ہے علماء پاکستان میں تخریب کاری کی مخالفت نہیں کرتے؟ اس سے قبل بھی کم از کم تین بار پاکستان کے جید ترین علماء اپنی مشترکہ تحریروں کے ذریعے پاکستان کے اندر تخریب کاری کے واقعات کو شرعاً ناجائز قرار دے چکے ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے علماء اس کے ساتھ حکمرانوں کو اپنی ان پالیسیوں میں تبدیلی کے مشورے بھی دیتے رہے ہیں جو تخریب کاری کے ان واقعات کے جنم لینے کا بنیادی سبب ہیں۔ پاکستان کا کون سا باشعور شہری ایسا ہے جو ان اسباب کے خاتمے کی ضرورت کا قائل نہ ہو؟ یا اپنے کالموں میں علماء پر فرقہ پرستی کا الزام بھی عائد کرتے رہتے ہیں لیکن ایسا کرتے وقت ان کا روئے سخن بالعموم ایک ہی مکتبِ فکر کے علماء اور اکابر کی طرف ہوتا ہے۔ وہ اپنے کالموں میں تقلید جیسے حساس مسلکی مسائل پر رائے زنی بھی کر رہے ہوتے ہیں، کیا یہ فرقہ واریت نہیں ہے؟ حسن نثار نے بالکل درست لکھا ہے پاکستان میں جو جس چیز کے خلاف سب سے زیادہ لیکچر دے رہا ہوتا ہے، وہی سب سے زیادہ اس میں ملوث بھی ہوتا ہے۔

تجھے ہم ولی سمجھتے جو......:

ایسا معلوم ہوتا ہے ان کو علماء دشمنی کا عارضہ لاحق ہو چکا ہے۔ ورنہ وہ تین مسلسل کالم "ملا" کے خلاف نہ لکھتے۔ غالب نے کہا تھا

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

ان کا بھی مشاہدہ حق اور تصوف کی بات کرتے کرتے اچانک ملا پرسب وشتم کرنے لگتے ہیں۔ اسی لیے کہنے والے کہتے ہیں تصوف اور ''بادہ وساغر'' کا بڑا گہرا تعلق ہے!''تصوف''، بادہ و ساغراور غالبؔ کی بات چلی ہے تو چلتے چلتے غالب کا یہ شعر بھی ان کی نذر ہے کہ

یہ مسائل تصوف اور یہ ترا بیان غالبؔ

تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ ''بادہ خوار'' ہوتا!''

بات دینی مدارس اور علماء وطلبہ پر تنقید کی چل رہی ہے تو اسی حوالے سے ہمارے کالم نگار دوست مولانا محمد اظہر صاحب نے احمد جاوید کے تنقیدی سوالوں کا بڑے خوبصورت انداز میں جواب دیا ہے۔ وہ میں ان کے شکریے کے ساتھ بلفظہ لگا رہا ہوں۔ مولانا کہتے ہیں:''غالب نے کہا تھا

حضرت ناصح گر آئیں، دیدہ و دل فرشِ راہ

کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا؟

کچھ اسی طرح کی صورت حال دینی مدارس کے ناصحین کی ہے جو ساحل پر کھڑے ہو کر اہل مدارس کو اپنی نصیحتوں اور قیمتی مشوروں سے نوازتے رہتے ہیں۔ ان میں جو کرم فرما خلوص دل سے تجاویز اور مشورے دیتے ہیں اور اصلاح اور خیر خواہی کے تحت تنقید کرتے ہیں، وہ اہل مدارس کے شکریے کے مستحق ہیں البتہ جو حضرات رسمِ دنیا اور موقع دیکھ کر مدارس کو نشانہ تنقید بناتے ہیں، ان کی خدمت میں گزارش ہے ساحلِ عافیت پر کھڑے ہو کر طوفانوں سے نبرد آزما لوگوں پر سنگ زنی اور تیر آزمائی شیوہ مردانگی نہیں۔ اگر آپ کی تنقید میں وزن اور نیت میں اخلاص ہے تو کچھ وقت کے لیے اپنے راحت کدوں کو چھوڑ کر ان بوریہ نشینوں کے ساتھ مدارس میں وقت گزاریے۔ ان شاءاللہ آپ کو حقائق کو قریب سے دیکھنے کی وجہ سے مدارس کے مسائل و مشکلات کا اندازہ بھی ہوگا اور یہ احساس بھی ہوگا کہ تجاویز پیش کرنے اور انہیں عملی جامہ پہنانے میں کتنے صبر آزما مراحل حائل ہیں؟

''خاص حلیہ'' کی زد کہاں پڑتی ہے؟:

12 تا 15 اکتوبر 2009ء کو بھوربن مری میں "Research for Common

"grounds" نامی تنظیم نے دینی جرائد کے مدیر حضرات کے لیے ایک ورکشاپ کا اہتمام کیا تھا جس کے روح رواں ''انٹرنیشنل سینٹر فار ریلیجن اینڈ ڈپلومیسی'' کے نائب صدر جناب اظہر حسین اور ''کامن گراؤنڈز نیوز پاکستان'' کے ایڈیٹر جناب راشد بخاری تھے۔ اس ورکشاپ میں میزبانوں کے نکتہ نظر سے آگاہی کے علاوہ دینی جرائد کے نمائندوں کو بھی باہمی طور پر تبادلۂ خیال کا موقع ملا اور اختلافِ مسالک کے باوجود موجودہ ملکی اور عالمی حالات کے تناظر میں کچھ ایسے مشترکہ اہداف سامنے آئے جن کے لیے تمام دینی حلقوں اور جرائد کو آواز بلند کرنی چاہیے۔

اس سہ روزہ ورکشاپ میں معروف دانشور ڈاکٹر محمد امین کی تالیف ''ہمارا دینی نظام تعلیم'' پر سولہ صفحات کا مقدمہ بھی شرکاء میں تقسیم کر کے ان کی رائے دریافت کی گئی تھی۔ یہ مقدمہ جناب احمد جاوید کے قلم سے ہے جن کے تعارف کے طور پر محقق، صوفی، مربی، ادیب اور دانشور کے الفاظ لکھے گئے تھے۔ ہمیں موصوف سے ذاتی تعارف حاصل نہیں مگر مدارس پر ان کی کڑی تنقید سے اندازہ ہوتا ہے وہ مدارس کے نصاب، نظام تعلیم، مسائل، حقائق اور تازہ ترین صورت حال سے کما حقہ واقفیت نہیں رکھتے، اس لیے ان کی تنقیدوں میں ''مخلصانہ'' کے بجائے ''معاندانہ'' رنگ زیادہ ہے اور بعض جملے تو انتہائی دلخراش اور تکلیف دہ ہیں۔ ذیل میں اس ''مقدمہ''...... جو درحقیقت مدارس پر دائر کیا گیا ہے...... کے چیدہ چیدہ نکات کے متعلق اہل مدارس کا موقف واضح کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

جناب احمد جاوید لکھتے ہیں: ''اہل مدارس، خواہ وہ کسی بھی مکتبہ فکر سے متعلق ہوں، ان کا مزاج یکساں ہے اور اس مزاج کی تشکیل میں اصل دین یعنی قرآن وسنت کا کردار بہت کم ہے۔''

جواب: قرآن وسنت، اجماع امت اور قیاس شرعی، شریعت اسلامیہ کے بنیادی مآخذ ہیں، مدارس میں جو مزاج تشکیل پاتا ہے وہ انہی مآخذ کا مرہون منت ہے۔ اجماع کبھی قرآن وسنت کے خلاف کسی مسئلے پر منعقد نہیں ہوا اور نصوص کے خلاف قیاس مردود ہے۔ اس لیے اہل مدارس کے مزاج کی تشکیل میں اصل کردار کتاب وسنت ہی کا ہے۔ البتہ اہل مدارس جدیدیت پسندوں کی طرح اہل مغرب سے مرعوب ہو کر کتاب وسنت، اجماع امت اور قیاس شرعی سے ثابت شدہ

مسائل میں تحریف و تنسیخ نہیں کرتے۔

احمد جاوید: ''یہ کافی سمجھ لیا گیا ہے ایک خاص حلیہ اختیار کر کے بعض مسائل اور چند مقامات، جن کی غالب حیثیت عموماً مناظرانہ ہوتی ہے، رٹوا دیے جائیں تو طالب علم، عالم کی مسند پر بیٹھنے کا استحقاق حاصل کر لیتا ہے، یہ تصور ہر پہلو سے مخالفِ دین ہے۔''

جواب: دینی و دنیوی تمام درسگاہوں سے نکلنے والوں کی استعداد یکساں نہیں ہوتی۔ اگر مدارس کے بعض فضلاء امتیازی صلاحیتوں کے حامل نہیں ہوتے تو یہ صورت حال دوسری جگہوں پر بھی ہے۔ ان مدارس نے ناکافی وسائل اور اپنوں اور غیروں کے طعن و تشنیع کے باوجود ایسے رجال کار دیے جو کسی بھی قوم اور معاشرے کے لیے قابل فخر ہیں۔ برصغیر کے اکابر علماء کو چھوڑ دیجیے، صرف پاکستان ہی میں ان ٹوٹے پھوٹے مدارس نے علامہ محمد یوسف بنوریؒ، مفتی محمد شفیعؒ، مولانا ظفر احمد عثمانیؒ، مولانا مفتی محمودؒ، مولانا عبدالرشید نعمانیؒ، خواجہ قمر الدین سیالویؒ، مفتی غلام رسول سعیدیؒ، علامہ احسان الٰہی ظہیرؒ، مولانا غلام اللہ خانؒ اور مولانا مفتی محمد تقی عثمانی جیسے جلیل القدر علماء پیدا کیے۔ جہاں تک ایک خاص حلیے کی بات ہے تو کیا شلوار قمیص پہننے اور داڑھی رکھنے سے انسان پر ''خاص حلیہ'' کا فتویٰ لگ جاتا ہے، یہ بھی سوچ لیجیے کہ اس ''خاص حلیہ'' کی زد کہاں کہاں پڑتی ہے؟

کمتری اور برتری کا معیار کیا ہے؟:

احمد جاوید: ''اہل مدارس معاشرے کے طبقات بالا سے طلبہ کو اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کریں۔ اس طرح ایسی بہت سی خرابیوں کا ازالہ ہو جائے گا جو دینی مدرسوں کے طالب علموں میں عام نظر آتی ہیں۔ مثلاً: احساس کمتری، دوسروں کے لیے نفرت، کم ذہنی، حب دنیا وغیرہ، ہمارے خیال میں مدارس کا بڑا المیہ یہ ہے کہ ان میں وہی بچے اور بچیاں داخل ہوتے ہیں جن کے والدین یا تو ان کی کفالت کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے یا پھر وہ ذہنی سطح کے اعتبار سے اتنے پست ہوتے ہیں کہ جدید تعلیم کا حصول ان کے لیے ممکن نہیں ہوتا، جو کسی کام کا نہ ہوا سے مدرسے بھیج دیا جاتا ہے۔''

جواب: معلوم ہوتا ہے احمد جاوید صاحب مدارس کی گزشتہ دس پندرہ سال کی صورت حال

سے بے خبر ہیں۔ انہیں معلوم ہونا چاہیے اب مدارس میں اچھی خاصی تعداد ان طلبہ کی ہوتی ہے جو مڈل اور اپر مڈل کلاس سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے والدین نہ صرف ان کی کفالت کا بوجھ اٹھاتے ہیں بلکہ ان کی ذہنی سطح بھی عام اسکولوں اور کالجوں میں پڑھنے والوں سے کہیں بلند ہوتی ہے۔ یہ طلبہ ذہانت اور شوق کی وجہ سے 6 ماہ، 9 ماہ، ایک سال اور ڈیڑھ سال کی مدت میں پورا قرآن کریم حفظ کر لیتے ہیں۔ ہمارے پاس ایک طالب علم نے صرف چار ماہ میں پورا قرآن کریم یاد کیا۔ ان طلبہ کے بارے میں یہ تاثر پھیلانا کہ یہ ''ذہنی سطح کے اعتبار سے اتنے پست ہوتے ہیں کہ جدید تعلیم کا حصول ان کے لیے ممکن نہیں ہوتا'' مدارس اور ان کے طلبہ کے ساتھ خیر خواہی نہیں ہے۔ پھر مدارس کے طلبہ کو احساس کمتری، دوسروں کے لیے نفرت، کم ذہنی اور حب دنیا وغیرہ امراض کا شکار بتانا بھی الزام تراشی ہے یا غلط فہمی پر مبنی ہے۔ انسانی کمزوریوں سے کوئی شخص خالی نہیں ہوتا۔

سوال یہ ہے جس نصاب میں آٹھ دس سال تک حمیت اور خودداری، دوسروں کے ساتھ محبت، بلند نظری اور دنیا پر آخرت کی زندگی کو ترجیح دینے کی تعلیم دی جاتی ہو اس نصاب کی بدولت تو بقول آپ کے احساس کمتری، دوسروں سے نفرت، کم ذہنی اور حب دنیا کے مریض پیدا ہوتے ہیں، یہ بھی فرمایئے جن عصری درسگاہوں میں حمیت وخودداری، محبت، انسانیت اور بلند نظری کا ایک سبق بھی نہیں پڑھایا جاتا، وہاں سے کتنے لبرل، سیکولر، سوشلسٹ، ماڈرنسٹ اور پوسٹ ماڈرنسٹ پیدا ہوتے ہیں؟ جنہیں آپ نے حب دنیا کا طعنہ دیا ہے ان میں بطور مثال ایک بھی پیش نہیں کیا جاسکتا جو ملک کو لوٹنے والوں میں شامل ہو، اربوں کھربوں کی کرپشن اور ملک کو تاراج کرنے والوں میں ایچی سن کالج، آکسفورڈ چیفس کالج، جی سی علی گڑھ کیمبرج اور دیگر کے فارغ التحصیل افراد کے نام سرفہرست ہیں۔

جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے:

احمد جاوید: ''مدارس کو اپنی ساری طاقت معاشرے کے ناکارہ طبقے کو اپنی طرف راغب کرنے کے بجائے ایسے لوگوں کی طرف رخ کرنا چاہیے جو دین سے کوئی مفاد عاجلہ نہیں رکھتے اور مدرسے میں داخلہ لینا ان کی معاشی یا ذہنی مجبوری نہیں ہے۔ ہر استاذ کو محض کلاس تک محدود رہ کر

معدودے چند طلبہ کو جن کی اکثریت غبی، بدشوق بلکہ مجرمانہ احساسات کی مالک ہوتی ہے، دین پڑھانے کی لاحاصل کوشش کرنے کے بجائے سوسائٹی کے نسبتاً مفید، موثر اور زیادہ مستحق سطحوں تک خود پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیے۔"

جواب: دینی مدارس کے نظام اور نظم تعلیم و تربیت سے ناواقف احمد جاوید صاحب جن طلبہ وعلماء کو معاشرے کا ناکارہ ترین طبقہ قرار دے رہے ہیں۔ تاریخ کی شہادت یہ ہے اسی طبقہ نے ہر دور میں قوم کی دینی، مذہبی اور معاشرتی رہنمائی اور اصلاح کی خدمات انجام دی ہیں اور ملت پر کوئی آزمائش یا افتاد پڑنے کی صورت میں انہی "ناکارہ لوگوں" نے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر کے حق اور اہل حق کی حفاظت کی ہے۔ 1953ء اور 1974ء میں تحاریک ختم نبوت اور 1977ء میں تحریکِ نظام مصطفیٰ کی قیادت انہی ناکارہ اور دینی مدارس کے فارغ التحصیل لوگوں کے ہاتھ میں تھی۔ مدارس کے علماء و فضلاء کو "مفادِ عاجلہ" کا طعنہ دینے والے اس پروفیشنل یا نان پروفیشنل کالج و یونیورسٹی کا پتا بتائیں، جس کے فضلاء "مفادِ عاجلہ" کے اسیر نہ ہوں۔ مدارس کے فضلاء میں الحمدللہ سیکڑوں ایسے حضرات مل جائیں گے، جو "مفادِ عاجلہ" کے بجائے "اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ" (میرا اجر میرے خدا کے پاس ہے) پر یقین رکھتے ہیں اور اس پر ثابت قدمی سے گامزن ہیں، جبکہ عصری درس گاہوں کا شاید ایک فاضل بھی ایسا نہ ہو، جو حقیقتاً "مفادِ عاجلہ" کا طلب گار نہ ہو۔ اسی طرح مدارس کے طلبہ کی اکثریت کو غبی، بدشوق اور مجرمانہ احساسات کا مالک کہنے والوں کو شاید سرکاری جامعات کے ہاسٹلز کا حال معلوم نہیں، جو مجرمانہ سرگرمیوں، دہشت گردی اور غنڈہ گردی کے ساتھ ساتھ خطرناک مجرموں کی آماجگاہیں بھی ہوتی ہیں۔ یہ ہاسٹلز قبائلی علاقوں کا منظر پیش کرتے ہیں۔ ہر عمارت پر کسی نہ کسی نسلی، لسانی یا سیاسی گروہ کا قبضہ ہوتا ہے اور صرف اسی گروہ سے وابستہ طلبہ کو وہاں رہائش کی اجازت ملتی ہے۔ ان جامعات سے مختلف اداروں کے چھاپوں کے نتیجے میں اب تک بہت بڑی تعداد میں اسلحہ برآمد کیا جا چکا ہے۔ اس کے برعکس کسی مکتب فکر کے کسی مدرسے سے آج تک نہ کوئی عادی مجرم پکڑا گیا، نہ اسلحہ و منشیات برآمد ہوئے۔ پھر بھی "مجرمانہ احساسات کا مالک" دینی مدارس کے طلبہ کو ٹھہرایا گیا ہے۔ جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے۔

احمد جاوید: ''جو آدمی خود اسلام کی مراد پر ڈھلنے سے گریزاں ہو، وہ رازی وغزالی جیسی علمی صلاحیت پیدا کرلے تو بھی اپنے مخاطب کو دین کی طرف سچائی واستقامت سے راغب نہیں کرسکتا۔ ہاں! اپنی طرح کے اداکاروں کی ایک کھیپ تیار کرسکتا ہے۔''

جواب: حق تعالیٰ شانہ قرآن وحدیث پڑھنے پڑھانے والوں کو عمل کی توفیق بھی عطا فرماتے ہیں لیکن ان میں سے کچھ افراد میں بشری کمزوریوں یا عمل میں کوتاہی کی وجہ سے نہیں ''اداکار'' ہونے کی گالی دینا زیبا نہیں ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحی مرحوم نے ایک نیم مذہبی سیاسی جماعت کے ارکان کو ''مذہبی بہروپیے'' اور ''سیاسی چغد'' قرار دیا تھا۔ جناب احمد جاوید صاحب نے وہی گالی اہل مدارس کی طرف لڑھکا دی اور دعوت اور دعویٰ کے فرق کو نظر انداز کر دیا۔ ان سے سوال ہے کہ کیا عمل میں کمزور شخص دوسرے مسلمان کو دین کی دعوت نہیں دے سکتا؟

جدید اصطلاحات سے ناواقف کون؟

احمد جاوید: ''مدارس میں بننے والا مذہبی ذہن جدید دنیا کے معاملات اور مسائل سے قریب قریب ناواقف ہے۔ اگر کہیں دخل دیتا بھی ہے تو اس کے نتائج ہمیشہ مضحکہ خیز برآمد ہوتے ہیں۔''

جواب: اسلام زندگی کے تمام شعبوں کے لیے ایک مکمل دین اور دستور العمل ہے۔ موجودہ دور کے جدید معاملات اور مسائل پر علمائے کرام نے علمی طور پر وقیع اور تحقیقی کام کیا ہے۔ انتقال خون سے لے کر استنساخ (کلوننگ) تک کے موضوعات پر علمی کتب موجود ہیں۔ پاک وہند کے جید مفتیانِ کرام کی جدید فقہی مسائل پر تصنیفات سامنے آچکی ہیں، جن سے اہل علم باخبر ہیں۔ معلوم نہیں احمد جاوید صاحب کو اب تک پتا کیوں نہیں چل سکا؟

احمد جاوید: ''مقامِ افسوس ہے اس وقت عالم اسلام میں مدارس سے نکلا ہوا کوئی عالم جدید افکار ومسائل سے ذرا بھی قابل اعتبار واقفیت نہیں رکھتا۔ اس کے بعد جب ان مسائل پر فقہی اور واعظانہ انداز سے کوئی حکم لگا دیا جاتا ہے تو مسلمانوں کو شرمندگی ہوتی ہے اور دوسرے مذاق اڑاتے ہیں۔''

جواب: یہاں کذب وافترا کی حدوں کو چھوتی ہوئی مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا ہے۔ جدید

مسائل وافکار پر صرف قابل اعتبار نہیں، ماہرانہ رائے رکھنے والے بیسیوں علمائے کرام ایسے موجود ہیں جن کی فقہی آرا پر قوم اعتماد کرتی ہے اور جدید مسائل میں انہیں سند سمجھتی ہے۔ تازہ مثال مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم اور ان کی نگرانی میں کام کرنے والے ان علماء کی ہے جنہوں نے اقتصادیات (Economics) میں اعلیٰ بینکاروں کی تعلیم وتربیت کی ذمہ داری کو اس خوبی سے نبھایا کہ بینکنگ کے ماہرین کو بھی ان کی صلاحیتوں کا اعتراف کرنا پڑا۔ بعض جدید اصطلاحات سے ناواقفیت دوسری بات ہے مگر بحمد اللہ ہمارے علم میں کوئی باعمل عالم دین ایسا نہیں ہے جس کا وعظ سن کر عام مسلمان اس کا مذاق اڑاتے ہوں۔

خیر آمدم بر سر مطلب:

جناب احمد جاوید صاحب نے مدارس کے متعلق مغالطات پر مبنی اس تحریر میں البتہ ایک بات بالکل صحیح لکھی ہے کہ ''جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے خالص دینی تصورات بھی دیگر اہل دین کے مقابلے میں صورتاً ہی نہیں بلکہ حقیقتاً مختلف ہوتے ہیں، ان کا خدا اور ہے، ان کا قرآن اور ہے۔'' جدید تعلیم یافتہ حضرات کے بارے میں یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ اس تعلیم کی وجہ سے ان کے بعض خیالات ونظریات کفر تک پہنچے ہوئے ہوتے ہیں۔ مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم نے بھی اپنی ایک تالیف میں یہ اعتراف کیا ہے کہ کالج کے زمانہ طالب علمی میں میں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جناح اور گاندھی کی طرح کا ایک لیڈر سمجھتا تھا (معاذ اللہ) ظاہر ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو محض لیڈر سمجھنے والا مسلمان نہیں ہو سکتا۔

آخر میں احمد جاوید صاحب کی خدمت میں گزارش ہے دینی مدارس، خواہ وہ کسی مکتب فکر کے ہوں اپنے تمام انحطاط اور زوال کے باوجود اس امت کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ ان مدارس نے ہنگاموں، بحرانوں اور روشنی سے محروم دنوں میں بھی امت کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیا ہے۔ اس لیے ان پر تنقید کرتے وقت ان کی خدمات پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے تا کہ اعتدال وتوازن برقرار رہے۔''

خیر آمدم بر سر مطلب ایک مصدقہ تازہ رپورٹ کے مطابق پاکستان کے طول وعرض میں اس

وقت 16 ہزار رجسٹرڈ مدارس ہیں۔ ان میں مجموعی طور پر 21 سے 26 لاکھ طلبہ وطالبات زیرِ تعلیم ہیں جبکہ صرف خواتین کے 8 ہزار مدارس ہیں جن میں 9 لاکھ لڑکیاں پڑھتی ہیں۔ یہ جان کر حیرت ہوتی ہے اس وقت ان مدارس کو کنٹرول کرنے کے لیے پانچ بورڈز ہیں جن میں سب سے بڑا وفاق المدارس ہے۔ ہر سال لاکھوں طلبہ وطالبات ان پانچ بورڈوں کے تحت امتحانات دیتے ہیں۔

یہ بورڈ اب تک مجموعی طور پر 918788 کو باقاعدہ ڈگریاں جاری کر چکا ہے۔ ان مدارس میں اہم اور قابلِ تحسین بات یہ ہے ان میں سے اکثر مدارس میں طلبہ سے کوئی فیس نہیں لی جاتی۔ طالب علم کو رہائش اور خوراک بھی مفت فراہم کی جاتی ہے۔ مدارس اپنے اساتذہ وانتظامی کارکنان کی تنخواہ، طلبہ کی رہائش وخوراک اور دیگر اخراجات مختلف مدات کے ذریعے پورے کرتے ہیں۔ فری ایجوکیشن، فری بورڈنگ کی سہولتیں فراہم کرنا ایک بہت بڑی خدمت ہے۔ فروغ علم کی خاطر خود تکالیف اُٹھا کر طلبہ کو یہ سہولتیں فراہم کرنے والوں کی تو بہت تحسین وستائش ہونی چاہیے۔

مدارس کے حسن انتظام پر اک تجزیہ:

دینی مدارس کے حسن انتظام کے بارے میں ایک دفعہ مناظر احسن گیلانی نے کہا تھا: ''دینی مدارس کے اساتذہ اور تلامذہ کا بنیادی عقیدہ یہ ہے علوم اسلامیہ کی تعلیم حق تعالٰی کی عبادت اور وراثت انبیاء ہے۔ یہ تعلیم ان کے دین وایمان کی امانت اور دنیا وآخرت میں فلاح وکامرانی کا ذریعہ ہے۔ ان تصورات کا نتیجہ یہ ہے ان مدارس میں تعلیم کے جتنے عنوان ہیں ان میں عبدیت، فروتنی اور سنجیدگی کے آثار نمایاں ہیں۔ استاذ کی بے ادبی یا درسگاہ کی بدنظمی، احتجاج اور ہڑتال کی ناخوشگوار صورتیں وہ کبھی پیدا نہیں کرتے۔ بعض مدارس میں مختلف مکاتب فکر کے طلبہ یکجا تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اکثر اپنے سے مختلف مکتبہ فکر کے اساتذہ کے آگے زانوئے تلمذ تہ کیے ہوئے ہیں لیکن کیا مجال کہ مسلک کا اختلاف کسی نزاع کی صورت اختیار کرلے۔

ہر سبق کی ابتدا بسم اللہ سے ہوتی ہے۔ جب کوئی نئی کتاب شروع ہوتی ہے تو اساتذہ اور طلبہ کی زبان پر یہ دُعائیہ جملہ ہوتے ہیں: ''بسم اللہ الرحمن الرحیم، رب یسر ولا تعسر وتمم بالخیر'' ''اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے۔ اے

پروردگارا یہ میرے لیے آسان فرمادے۔ مشکل نہ فرما اور خیریت سے ختم کرادے۔" اس وقت استاد اور شاگرد دونوں کی کیفیت اور قلبی گداز قابل دید ہوتا ہے۔ "رب اشرح لی صدری ویسرلی امری واحلل عقدة من لسانی" کی دُعا عموماً سبق کی ابتدا میں وردِ زبان ہوتی ہے۔ مدارس عربیہ کا لیکچر سسٹم اسکولوں، کالجوں کے انداز سے مختلف ہوتا ہے۔ یہاں متعلقہ مضمون کی تقریر کے علاوہ متعلقہ کتب کے مشکل اور مغلق مقامات کا حل بھی ضروری ہوتا ہے۔ ان مقامات نحوی بھی ہوتے ہیں اور صرفی بھی۔ اصولی بھی ہوتے ہیں اور فلسفیانہ بھی۔ ادبی اور لغوی بھی۔

روشن پیشانیوں والے:

مدارس میں کتابوں کی کلید اور خلاصہ کے مطالبہ کا رواج قطعاً نہیں، کیونکہ خلاصے صرف رٹنے کے لیے ہوتے ہیں۔ انشراح صدر کے لیے نہیں۔ ان درسگاہوں میں اصل کتابوں کی تدریس ہوتی ہے۔ مزید تشریح و توضیح اور افہام و تفہیم کے لیے کتابوں کی شروح، ان کے حاشیے، تعلیقات، ذیل اور بین السطور تدریس کے لازمی حصے ہوتے ہیں۔ طلبہ کو اساتذہ پر سوال کرنے کی کامل آزادی ہوتی ہے اور یہ امر ادب کے منافی نہیں سمجھا جاتا، بلکہ اس کو طلبہ کی اہمیت اور لیاقت کا ثمرہ سمجھا جاتا ہے۔ آزادانہ سوال و جواب میں بھی احترام ضرور ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ رات کو مطالعہ کا انداز عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ تمام طلبہ ایک جگہ جمع ہوتے ہیں اور ہم سبق ایک دوسرے کو اپنا آموختہ سنتے سناتے ہیں۔ اساتذہ عموماً نگرانی کے لیے موجود ہوتے ہیں۔ اشکالات رفع کرتے ہیں: "قال اللہ وقال الرسول" کی صدائیں دور دور تک سنائی دیتی ہیں۔ چھوٹا موٹا پہنتے ہیں، سادہ خوراک کھاتے ہیں۔ غریبانہ انداز سے رہتے ہیں۔ نہ انہیں پہننے کو شاندار لباس درکار ہے نہ رہنے کو کوٹھی بنگلے۔ ان کا رہن سہن اور رکھ رکھاؤ بھی حد درجہ سادہ ہوتا ہے۔ اساتذہ میں باہم حد درجہ اخوت وعزت واحترام کے جذبات موجود ہیں۔ رقابت کے تصورات عموماً نہیں پائے جاتے۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ محبت سے پیش آتے ہیں۔ ایک دوسرے کی عزت کرتے ہیں۔

ہر چھوٹا اپنے بڑے کا احترام کرتا ہے لیکن بزرگ ادنیٰ و اعلیٰ کی تمیز نمایاں نہیں ہونے دیتے۔ ملازمت میں سینئر اور جونیئر کے جھگڑے نہیں ہوتے۔ اگر ان کے درمیان کوئی وجہ تفوق ہے تو

صرف علم اور تقویٰ کی، مدارس کے ارباب حل وعقد اور اراکین منتظمہ بھی انہیں "حضرت"، "مولانا" اور اس قسم کے دوسرے معزز القاب سے پکارتے ہیں۔ ان کے درمیان آجر واجیر یا خادم ومخدوم کی شان ہرگز نہیں ہوتی۔ اکثر مدارس میں اساتذہ کا احترام اس قدر ملحوظ خاطر ہوتا ہے کہ احتراماً ان کی تنخواہ لفافہ میں بند کر کے دی جاتی ہے۔ مدارس عربیہ کے طلبہ کے دلوں کے اندر اپنے اساتذہ کے بارے میں جو احساسات ہوتے ہیں وہ دوسری درسگاہوں کے طلبہ میں بالکلیہ مفقود ہیں۔ دینی درسگاہوں کے طلبا اپنے اساتذہ کے سامنے مؤدب رہتے ہیں۔ ان کی خدمت کرتے ہیں اور اسے اپنے لیے وجہ سعادت اور علمی فضیلت کے حصول کا ذریعہ تصور کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی کے مطابق استاد کا مقام باپ کے درجہ سے بھی بلند ہے۔

شکوہ کریں تو کس سے کریں:

دینی مدارس نے ناگفتہ بہ حالات، روکھی سوکھی کھا کر جس طرح دین کا تحفظ کیا ہے، ملک کی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کی ہے۔ خواندگی کی شرح میں حیرت ناک اضافہ کیا ہے۔ غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزارنے والوں کو تحفظ دیا ہے۔ الٹرا ماڈرن اور طبقہ اشرافیہ کے نوجوانوں کو دینی تعلیم اور مہذب اخلاق سے آراستہ کیا ہے اور انتہائی شفاف اور محدود مالی وسائل میں محیر العقول کارنامے انجام دیے ہیں اس پر امریکا ومغرب حیرت سے گنگ ہیں مگر ہمارے ہاں کا ایک مرعوب، نیم خواندہ، مغرب کا پروردہ طبقہ بلاوجہ شاہ سے زیادہ شاہ کا وفادار بننے کی سعی لاحاصل میں لگا ہوا ہے اور اسلام کے اصل چہرے کو مسخ کرنے کی ناکام کوشش کر رہا ہے۔

بے شک اسلام ابتدا میں بھی غریب یعنی ناآشنا اور بے یار ومددگار تھا اور آخر میں بھی اسی طرح ناآشنا بن جائے گا۔ حدیث شریف کا مفہوم ہے: "آخر میں کسی شخص کے لیے اسلام اور ایمان پر ثابت قدم رہنا اس طرح مشکل ہوگا جیسا کہ انگارہ ہاتھ میں لینا۔" شروع شروع میں اسلام لوگوں کے لیے غیر معروف اور بیگانہ تھا۔ بہت کم تھے جو اسلام کا ساتھ دینے پر آمادہ تھے۔ آج بھی حالت وہی ہے۔ مسلمان بے یار ومددگار ہیں۔

سامراجی قوتیں اسلام اور مسلمانوں کو دنیا سے ختم کرنے کے لیے متحد ہو چکی ہیں لیکن سوائے

اللہ کے ان کا کوئی غمخوار اور فریاد سننے والا نہیں ہے۔ غیروں سے کیا گلہ، وہ تو ہیں ہی غیر، گلہ اور شکوہ تو اپنوں سے ہے جو دانستہ یا نادانستہ غیروں کے ساتھ مل کر اسلام کو مٹانے پر تلے ہوئے ہیں۔ غیروں کے اتحادی بن کر ان کی بندوقوں کے لیے اپنا کندھا پیش کرنے میں دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش میں ہیں۔

دقیانوسی کے طعنے:

آج ہر طرف مسلمانوں پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے جاتے ہیں اور کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ کوئی ان ظالموں سے پوچھے کہ آخر یہ ظلم وستم کا بازار کیوں گرم کیا ہوا ہے؟ یہ جبر وسر بریت کا سلسلہ کیوں ان سے روا رکھا جاتا ہے۔ اسے بند کیوں نہیں کیا جاتا؟

دنیا میں قیام امن کی دعوے دار اقوام متحدہ اور دوسری تنظیمیں اس ظلم پر خاموش تماشائی بنے بیٹھے ہیں۔ ان کے ہونٹ سلے ہوئے ہیں۔ زبانیں گنگ ہیں۔ اس زمانے میں اسلام کے نام لیواؤں کو سخت گرمی میں صحرا کی تپتی ریت پر لٹا دیا جاتا تھا اور انہیں اس وقت تک لٹائے رکھتے کہ ان کے خون اور چربی سے وہ آگ بجھ جاتی لیکن مشرکین کو ان پر ذرا بھر بھی رحم نہ آتا تھا۔

حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ اور ان جیسے دوسرے غریب، بے کس اور بے یار ومددگار کے ساتھ یہی سلوک روا رکھا جاتا لیکن قربان جائیے ان کے عزم وہمت پر اور داد دیجیے ان کے صبر واستقامت کو اتنی تکالیف کے باوجود پھر بھی ان کی زبان اور احد احد کا ورد اور وظیفہ جاری تھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھی اسلام چھوڑنے کو تیار نہ تھے۔ اسلام کچھ اس طرح ناآشنا اور بیگانہ تھا کہ جو بھی اسلام لاتا یا اسلام قبول کر لیتا، لوگ ان کو "صابی" یعنی بے دین کہا کرتے تھے۔ ان کو دیوانہ، مجنون اور پاگل کہا جاتا تھا۔

آج صدیوں بعد بھی اگر ہم غور سے حالات کا جائزہ لیں تو منظر بالکل وہی نظر آ رہا ہے۔ مسلمانوں کو عصر حاضر کے تقاضوں سے ناآشنا کہا جاتا ہے۔ انہیں شدت پسند اور انتہا پسند سمجھا جاتا ہے۔ ان کو دقیانوسی کا طعنہ دیا جاتا ہے۔

خاک ہو جاتے ہیں......:

ان کو دہشت گرد وغیرہ کے القابات سے نوازا جاتا ہے۔ آج بھی ایمان والوں کو بے دریغ

تنگ کیا جارہا ہے۔ ان پر ظلم و جبر اور سربریت کے پہاڑ ڈھائے جاتے ہیں۔ ان کو بے جا تنگ کیا جاتا ہے۔ دینی مراکز اور مدارس دہشت گردی کے اڈے قرار دیے جاتے ہیں۔ اسلام آباد میں لال مسجد اور اس کے اساتذہ، طلبہ اور مظلوم طالبات شہید کردیے جاتے ہیں۔ سیکڑوں بے گناہ بچے خاک و خون میں نہلا دیے جاتے ہیں۔ جنوبی پنجاب میں دینی مدارس میں عسکریت پسندی کی آڑ میں سرچ آپریشن کیا جاتا ہے۔ جولائی 2009ء میں جنوبی پنجاب کے کئی مدارس کے خلاف سرچ آپریشن کیا گیا۔ ''جہادی لٹریچر'' برآمد کیا گیا۔ قارئین! ''جہادی لٹریچر'' کے بارے میں صراحت نہیں کی گئی کہ وہ کیا تھا؟ ظاہر ہے ہر دینی مدرسہ میں قرآن کریم اور کتب احادیث تو ضرور موجود ہوتی ہیں، سورۂ توبہ اور سورہ انفال کا ترجمہ اور تفسیر بھی طلبہ کو پڑھائی جاتی ہے۔

ان سورتوں میں یہود و نصاریٰ کی سازشوں، ان کے فرنٹ لائن اتحادیوں اور نام نہاد مسلمانوں کے نفاق کا پردہ چاک کیا گیا ہے۔ قرآن کریم جہاد سے بھاگنے والوں اور دنیوی عیش و آرام کے پجاریوں کو خدائی گرفت پر انتباہ کرتا ہے اور اہل ایمان کو اس وقت تک میدان کارزار سے ہٹنے کی اجازت نہیں دیتا جب تک فتنہ مکمل طور پر ختم نہ ہو جائے۔ جہادی لٹریچر کی تعریف میں صحیح بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ اور دیگر کتب حدیث بھی آتی ہیں جن میں فضائل جہاد کے مستقل ابواب ہیں۔ بزدل اور نام نہاد مسلمان ان احادیث کے آئینے میں اپنے ایمان کے خدوخال دیکھ سکتے ہیں۔ ان ہی احادیث میں اس شخص کو نفاق اور جاہلیت کی موت پر مرنے والا قرار دیا گیا ہے جس نے زندگی بھر جہاد کیا نہ کبھی اس کے دل میں اس کی امنگ پیدا ہوئی۔

مترجم قرآن کریم اور احادیث کے اُردو تراجم تقریباً ہر گھر میں موجود ہیں جن میں جہاد کے احکام و فضائل تفصیل سے بیان ہوئے ہیں۔ ہماری کم نصیبی ہے کہ لا الہ الا اللہ کی بنیاد پر وجود میں آنے والے ملک میں اب مترجم قرآن کریم اور مترجم احادیث رکھنا بھی ''جہادی لٹریچر'' ہونے کی وجہ سے قابل سزا ہے۔

''جہادی لٹریچر'' کیا ہے:

حقیقت یہ ہے یہود و نصاریٰ کا بس چلے تو وہ عالم اسلام میں اپنے ٹوڈی حکمرانوں کے

ذریعے قرآن وحدیث سے جہاد کے فضائل ومسائل خارج کرادیں۔ اب بھی نوبت یہاں تک آپہنچی ہے کہ قرآن کریم اور صحاح ستہ کو گھر میں رکھنا جرم بنایا جارہا ہے۔ مناسب ہے حکومت تعزیرات پاکستان کے تحت اس جرم کی سزا مشتہر کردے تاکہ قرآن کریم اور حدیث کی کتابیں اپنے گھروں میں رکھنے والے لاعلمی میں مارے نہ جائیں۔ جہاں تک اہلِ مدارس کا تعلق ہے تو ان کی متاع یہی اللہ کی کتاب اور اس کے رسول امین صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامین ہیں جنہیں وہ سینوں سے لگائے بیٹھے ہیں اور مرتے دم تک یہی آرزو اور عزم رکھتے ہیں۔

طاقتور وزارتوں کے بل بوتے پر اہلِ مدارس کو دہشت گرد قرار دینے اور دنیوی آسائشوں پر ریجھنے والوں کو ان کے مناصب، تمغے اور ستارے مبارک ہوں اور ان صف نشینوں کو ان کے مصلے، سجدہ گاہیں اور آنسوؤں سے تر کرنے والی راتیں مبارک ہوں۔ آج پردہ، ڈاڑھی اور ایمان کو مشکل بنادیا گیا ہے، مگر اہل ایمان کے سامنے صرف آج نہیں ''کل'' بھی ہے۔ مشکلات کو برداشت کرنا، اپنوں اور غیروں کے طعنے سہنا، پردہ، ڈاڑھی، ایمان اور شعائر اسلام کی حفاظت کرنا ''کل'' کو تابناک بنانے کے لیے ضروری ہے۔ ''اے ایمان والو! ڈرتے رہو اللہ سے اور چاہیے کہ دیکھ لے ہر ایک جی کیا بھیجتا ہے کل کے واسطے۔''

غرضیکہ اس وقت ہر طرف افسوس ناک صورتِ حال کا شکار ہے لیکن اسلام تاقیامت زندہ وتابندہ رہے گا کیونکہ اس کی حفاظت اللہ تعالیٰ کرتا ہے۔ اسلام کو مٹانے والے خود بخود مٹ جائیں گے۔ تاریخ میں ان کو فرعون، نمرود، ابوجہل، شداد اور ہامان جیسے القابات سے یاد کیا جائے گا لیکن غور کرنے کی بات ہے ہم میں سے کون ہے جو اس دین کے لیے قربانیاں دے رہا ہے؟

سوال یہ ہے کیا یہ ملک اسلام اور لا الہ الا اللہ کے نام پر نہیں بنا تھا؟ کیا اس وقت یہ نعرے نہیں لگائے جاتے تھے: ''پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ'' کیا یہ نہیں کہا گیا تھا اس ملک میں قرآن اور اسلام کا نظام ہوگا؟ یہ ملک اسلام کا قلعہ ہوگا؟ اس ملک میں مسلمان کے ایمان واسلام اور دین کی حفاظت ہوگی؟ اس ملک کا قانون اور منشور اسلام ہوگا۔ اگر یہ کہا گیا تھا اور یقیناً کہا گیا تھا تو پھر کیوں اس ملک میں 'لا الہ الا اللہ' کی صدا بلند کرنے والوں کو دہشت گرد کہا جاتا ہے؟

مدارس کی خدمات کا دائرہ:

کیوں حکمران مساجد اور مدارس کو ملیا میٹ کرنے پر تلے ہوئے ہیں؟ کیوں اسلام کے نام لیواؤں کو شہید کر دیا جاتا ہے؟ صرف اس لیے ستایا جاتا ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے دین پھیلانے والے ہیں؟ وہ اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شیدائی اور نام لیوا ہیں؟ دینی مدارس کے اساتذہ وطلبہ کو دین کا اتنا کام کرنے کے باوجود ملامت اور عتاب کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔

میں سوچتا ہوں اگر کسی پرائیویٹ ادارے کی طرف سے امریکن یا یورپین معاشرہ میں بچوں بچیوں کو اس طرح خدمات فراہم کی جارہی ہوتیں تو ایسی خدمات فراہم کرنے والوں کو وہاں ہیرو کا درجہ دے دیا جاتا اور قوی امکان ہے ایسے کسی فرد کو نوبل انعام ملتا یا اقوام متحدہ کی طرف سے امن کا سفیر بنا دیا جاتا، مگر بادشاہوں کے جبر اور پھر انگریزوں کی غلامی سہتے ہوئے برصغیر کے مسلمان اپنے کئی معاملات ومفادات کو اپنے آقاؤں کی نظر سے دیکھنے کے عادی ہو گئے تھے۔ اس روش پر چلتے ہوئے بعض حلقوں نے دینی مدارس کو بھی حقارت کا نشانہ بنا کر انہیں بے قدر و بے وقعت قرار دینے کی کوشش کی۔

بعض لوگ اپنی نجی محفلوں میں دینی مدارس پر اس طرح اعتراضات کرتے ہیں جس سے ان مدارس کے اساتذہ اور طالب علموں کی شدید ہتک وتوہین کا پہلو نکلتا ہے۔ لال مسجد آپریشن کے دوران مولانا عبدالعزیز کی ڈرامائی انداز میں گرفتاری اور بعد ازاں ذلت آمیز طریقے سے ٹی وی پر پیشی اور پھر مضحکہ خیز انداز میں سوال وجواب۔ اسی طرح طلبہ اور طالبات کے ساتھ عام معافی کے باوجود توہین آمیز رویے نے پوری دینی مدارس برادری اور ان سے تعلق رکھنے والوں کے ساتھ روا رکھے جانے والے اس طرزِ عمل کو آشکارا کر دیا ہے۔

ایک سوال یہ کیا جاتا ہے دینی مدارس معاشرے کو کیا دے رہے ہیں؟ اس کا مختصر سا جواب میں آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔ دینی مدارس لوگوں کے شرعی مسائل حل کرنے میں مدد فراہم کرتے ہیں۔ ہر بڑے مدرسے میں "دارالافتاء" قائم ہے۔ دنیا بھر کے مسلمان ویب سائٹس اور ای میل کے ذریعے بھی اپنے مطلوبہ سوالات کے جوابات حاصل کرتے ہیں۔ دینی مدارس دنیا بھر

کے مسلمانوں کی ایک اہم دینی ضرورت مسجد کو آباد کرنے کا سبب ہیں۔ حفاظ وقراء نے مسجدیں آباد کررکھی ہیں۔ ملک بھر میں کوئی ایسی مسجد نہیں جو امام مسجد نہ ملنے کی وجہ سے اذان وجماعت سے محروم رہی ہو۔ اکثر مساجد کے ائمہ نے مسجدوں میں قرآنی مکتب قائم کررکھے ہیں جہاں بچوں کو حفظ وناظرہ کی تعلیم دی جاتی ہے جبکہ مدارس میں بچوں کو صحیح تلفظ اور قراءت سکھائی جاتی ہے۔

خیر کے سر چشمے:

دینی مدارس کا یہ فیض ملک کی گلی گلی، نگر نگر میں پھیلا ہوا ہے۔ دینی مدارس پاکستان کی سب سے بڑی این جی اوز ہیں۔ اس اعتراف کی وجہ یہ ہے کہ دینی مدارس میں تعلیم بالکل مفت دی جاتی ہے۔ طلبہ کو رہائش وخوراک بھی بلا قیمت ملتی ہے۔ بیسیوں مدارس ایسے ہیں جہاں نادار طلبہ کو نیا لباس بھی فراہم کیا جاتا ہے۔

دینی مدارس کے قیام کا ایک بڑا مقصد علوم نبوت کی تعلیم وتحفظ ہے۔ قرآن وحدیث مکمل تشریحات کے ساتھ پڑھائے جاتے ہیں۔ صرف اسی پر بس نہیں بلکہ قرآن وحدیث کو سمجھنے کے لیے ان کے معاون علوم یعنی صرف، نحو، منطق، بلاغت، بدیع، بیان، فلسفہ، ادب، فقہ، اصول فقہ، اصول حدیث، اصول تفسیر وغیرہ بھی ایک منظم پروگرام کے تحت پڑھائے جاتے ہیں۔

قرآن وحدیث کی تدریس وتخریج کے مراکز ومکاتب سب سے زیادہ برصغیر پاک وہند میں ہیں۔ باقی دنیا میں جہاں کہیں دینی مدارس قائم ہیں وہ سب برصغیر کے مدارس کے بالواسطہ یا بلاواسطہ خوشہ چیں ہیں۔ دینی مدارس کے فضلا کی ایک بہت بڑی کھیپ نے نمایاں سیاسی ومعاشرتی خدمات سرانجام دیں۔

1857ء کی جنگ آزادی، تحریک سید احمد شہید، تحریک ریشمی رومال، تحریک آزادی، تحریک خلافت ایسی بے شمار تحریکوں میں ہزاروں علماء نے جان ومال کی قربانیاں دیں۔ قید وبند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ تحریک پاکستان میں حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا ظفر احمد عثمانیؒ اور ان کے رفقاء وتلامذہ کا کردار کسی سے مخفی نہیں ہے۔ یہ اعتراف خدمت ہی تھا علامہ عثمانی نے سب سے پہلے پاکستان کا پرچم لہرایا اور محمد علی جناح کے انتقال پر انہوں نے نماز

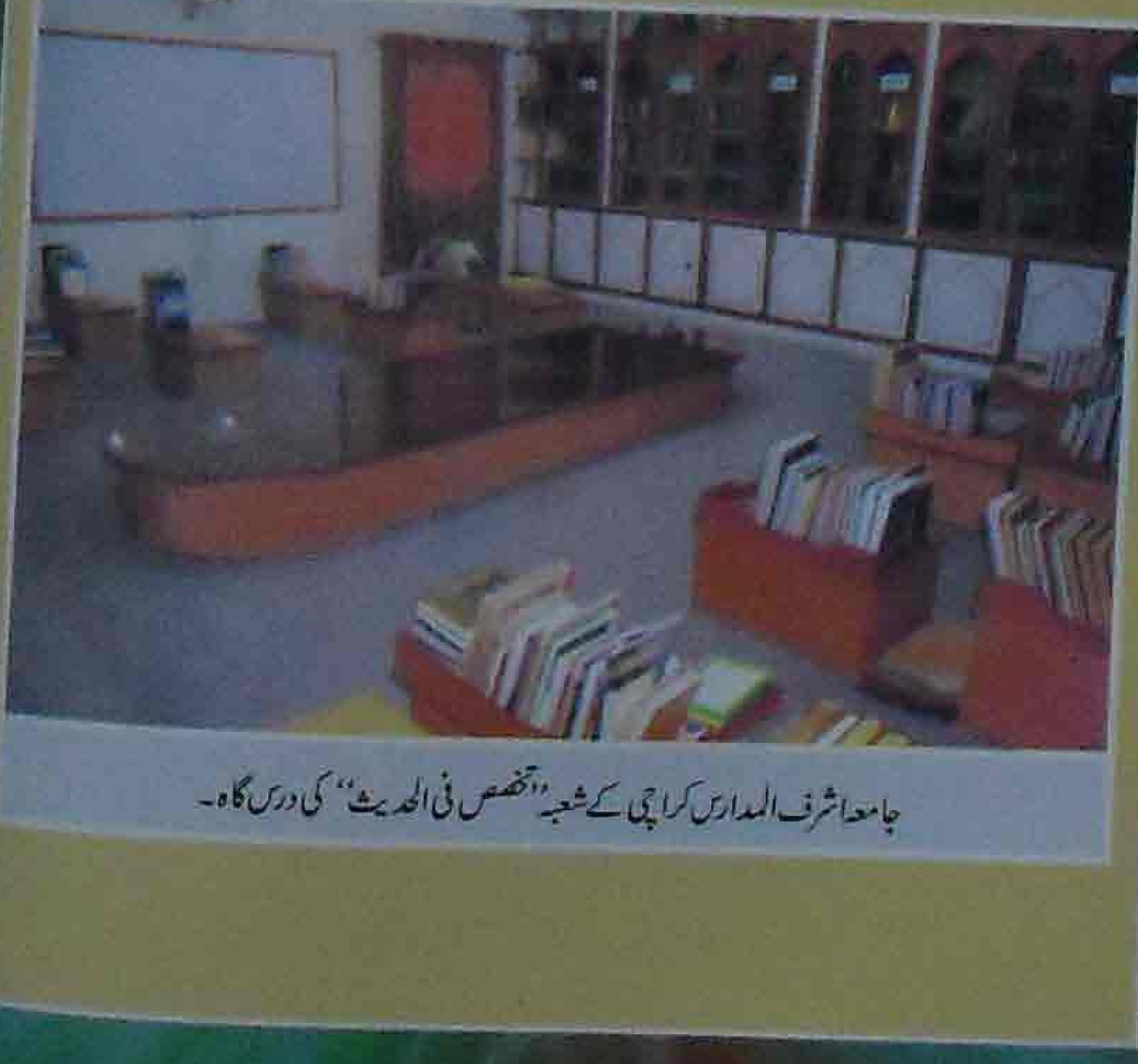




معروف بزرگ عارف باللہ حضرت مولانا شاہ حکیم محمد اختر صاحب کے ہاتھوں مختصر مدت میں بہت زیادہ پھلنے پھولنے والا ادارہ ''اشرف المدارس'' سندھ بلوچ سوسائٹی، کراچی جو مختصر رقبے پر کشادہ تعمیر کا ایک نمونہ ہے۔



جامعہ اشرف المدارس کراچی کا مدرسۃ البنات



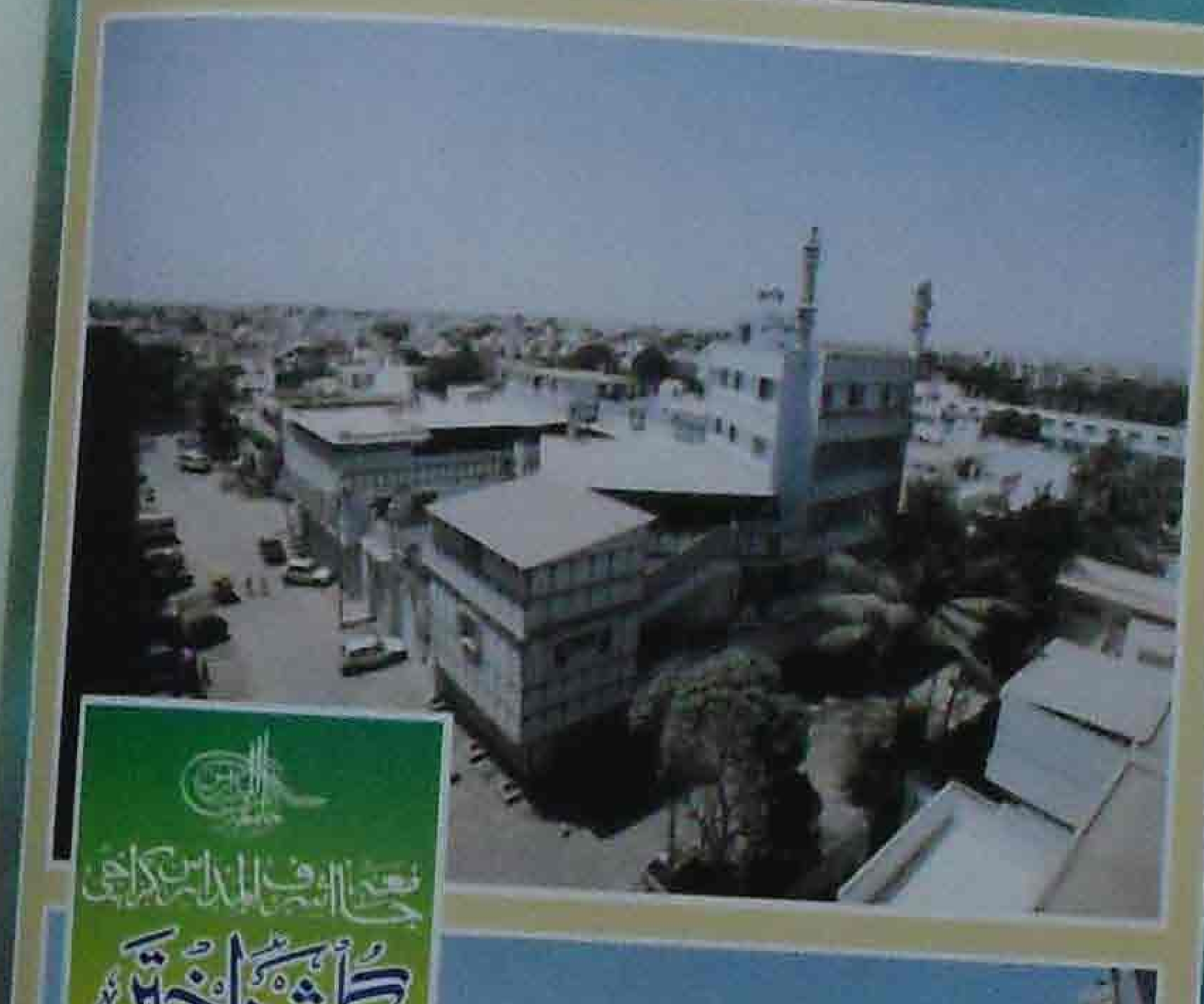
جامعہ اشرف المدارس کراچی کے شعبہ ''تخصص فی الحدیث'' کی درس گاہ۔



جامعہ اشرف المدارس کراچی کا دارالافتاء۔



جامعہ اشرف المدارس کراچی کا کتب خانہ اور لائبریری۔



عارف باللہ حضرت مولانا شاہ حکیم محمد اختر صاحب دامت برکاتہم کی خانقاہ۔ یہ گلشن اقبال نمبر 2 کراچی میں واقع ہے۔

جنازہ پڑھائی۔

تو پھر کیا ہوتا؟

فضلائے دینی مدارس کی ایک بڑی تعداد نے بے شمار طریقوں سے قرآن وحدیث کی علمی خدمت کی۔ قرآن مجید کی تفسیریں لکھیں۔ بعض تفسیریں اُردو دان طبقے میں بے حد مقبول ہوئیں جیسے تفسیر عثمانی، معارف القرآن اور روح القرآن۔ قرآن مجید کے ترجمے مع مختصر حواشی لکھے۔ صحاح ستہ کے اُردو تراجم مختصر و مفصل شروحات، صحاح ستہ کے منتخب ابواب کی شروحات، چہل حدیث کے مجموعے۔

حدیث شریف کی خدمت پر بے شمار پہلوؤں پر علماء نے کام کیا ہے۔ جدید فقہی مسائل پر اُمت کی رہنمائی کے لیے مفتی حضرات خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ بہت سے مفتیان کرام کی اسلامی معیشت، بینکاری اور غیر سودی نظام پر تحقیقات انتہائی قابل قدر ہیں اور ان کا عالمی سطح پر بھی اعتراف کیا جا چکا ہے۔ مذکورہ پہلوؤں کے علاوہ بھی تعلیم، تدریس، تبلیغ تحریر کے ذریعے بے شمار طریقوں سے اُردو اور علاقائی زبانوں میں علمائے کرام کی محنت جاری ہے۔

دینی مدارس نے مسلمانوں کو صحیح عقائد پر برقرار رکھنے اور مسیحیت، ہندومت، انکار حدیث، انکار سنت، بدعات، شرکیہ افعال، انکار ختم نبوت وغیرہ بے شمار فتنوں اور گمراہیوں سے بچانے کے لیے نمایاں کردار ادا کیا۔ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ، مولانا منظور احمد نعمانیؒ اور ان کے فیض یافتہ حضرات کی تحریروں سے آج بھی فضائیں مہک رہی ہیں۔ عربی کتابوں کے اردو اور دیگر زبانوں میں ترجمے کیے۔ اسی طرح دنیا بھر کی زبانوں میں اسلامی علوم کو منتقل کرنے کی بھاری ذمہ داری اٹھائی۔ اگر دینی مدارس یہ تاریخی کردار ادا نہ کرتے تو نہ جانے مسلمان کن کن گمراہیوں کا شکار ہو چکے ہوتے تھے۔

روشن کردار:

اس بات کی تو ایک نہیں کئی انسانی نسلیں، کئی بستیاں اور کئی علاقے گواہ ہیں ملک کی شرح خواندگی کے اضافے میں مدارس کا ناقابلِ تردید، ناقابل فراموش بلکہ قابل تقلید و قابل تحسین کردار

ہے۔ وطن عزیز میں ایک نہیں سیکڑوں ایسے دیہات، گاؤں، گوٹھ اور بستیاں موجود ہیں جہاں اگر کسی کے پاس کچھ تعلیم ہے یا اسے پڑھا لکھا سمجھا جاتا ہے تو وہ کسی مدرسے ہی کا فیض یافتہ ہے۔ کئی علاقے ایسے ہیں جہاں میٹریکولیٹ تو ایک دانہ بھی نہیں البتہ کسی نہ کسی مدرسے سے فارغ التحصیل عالم ایک نہیں، بلکہ دو تین یا اس سے زائد موجود ہیں۔

شوال کے مہینے میں چھوٹی عمر کے بچوں کی ایک کھیپ دینی تعلیم کی غرض سے اپنے گھروں سے نکلتی ہے۔ جن میں ایسے نوجوان بھی اچھی خاصی تعداد میں ہوتے ہیں جو مڈل یا میٹرک پاس کر کے دینی تعلیم کے حصول کی غرض سے مدارس کا رُخ کرتے ہیں۔ انسانوں کے اس سیلاب کو مدارس ہی اپنے دامن میں پناہ دیتے ہیں۔ پھر انہیں تعلیم وتربیت کے زیور سے آراستہ کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی دیگر ضروریات: مثلاً: کھانا پینا، پہننا، رہائش اور علاج معالجے کا بندوبست کرتے ہیں اور اس کے علاوہ بعض مدارس تو ماہانہ جیب خرچ بھی مستحق طلبہ کو دیتے ہیں۔

ملک وقوم کے خادم:

سال کے آخر میں مدارس کے سالانہ امتحانات ہوتے ہیں۔ اس کے بعد مدارس معاشرے کو ہزاروں کی تعداد میں وہ صالح نوجوان فراہم کرتے ہیں جنہوں نے مدارس میں 12 تا 16 سال کا عرصہ لگا کر علوم اسلامیہ کی تکمیل کی ہوتی ہے جو بیک وقت حافظ، قاری ہونے کے ساتھ ساتھ حدیث، تفسیر، فقہ، منطق، بلاغت اور صرف ونحو جیسے علوم اپنے سینے میں لیے ہوتے ہیں۔ فراغت کے بعد معاشرے کی تعمیر اور نئی نسل کی تعلیم وتربیت میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ رمضان آتے ہی جہاں شیاطین قید کر دیے جاتے ہیں۔ لوگ برائی سے بچنے اور نیک اعمال کی طرف راغب ہوتے ہیں تو انہیں راہنمائی کے لیے ایسے افراد کی ضرورت ہوتی ہے جو انہیں دین کی بنیادی باتیں بتا سکیں۔ تراویح کی نماز میں قرآن مجید سنا سکیں۔ وعظ ونصیحت کر سکیں۔ عوام الناس کو اس موقع پر روح کی غذا جو فرشتہ صفت افراد مہیا کرتے ہیں وہ بھی انہی دینی مدارس کے خوشہ چیں ہوتے ہیں۔
کیا رمضان کے مہینے میں نہیں دیکھا گیا مساجد، شادی ہالوں، بلڈنگ کی چھتوں، گھروں، میدانوں اور پارکوں میں تین روزہ، چھ روزہ، دس روزہ، پندرہ روزہ، بیس روزہ، تیس روزہ، پچیس، ستائیس

اور انتیس روزہ قرآن مجید سنائے گئے؟ آخر یہ سنانے والے کون لوگ تھے؟ وہی تو تھے جنہوں نے مدارس سے کسب فیض کیا۔

ذی الحجہ میں قربانی کی عظیم عبادت سرانجام دی جاتی ہے۔ اس فریضے کی ادائیگی میں مدارس و اہلِ مدارس کی عوام الناس سے معاونت کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔ فضائل ومسائلِ قربانی کے کتابچے، پمفلٹ اور بیانات وتقاریر کے ذریعے یہ حضرات عوام کی راہنمائی کرتے ہیں۔ اس موقع پر اجتماعی قربانی کا کامیاب انعقاد مدارس کا انقلابی قدم ہے۔

مدارس کے اس کام کی وجہ سے متوسط طبقے کے افراد بھی بآسانی قربانی کر لیتے ہیں۔ مویشی منڈی میں گھومنے کی خواری، بیوپاریوں سے منہ ماری، گاڑی کے کرائے، پولیس کے دانہ پانی اور گھر کے سامنے یا آس پاس باندھ کر اس کی آٹھ دس دن کی چوکیداری سے یکسر چھٹکارا مل جاتا ہے۔ مدارس کی خدمات کا ایک نمونہ ہے۔ اگر حقیقت کو دیکھا جائے تو مدارس کی ایک ایک خدمت پر کئی کئی کتابیں لکھی جاسکتی ہیں۔ روشن حقیقت یہ ہے مسلمانوں اور ملک وقوم پر جب بھی مشکل وقت آیا تو دینی مدارس کے طلبہ اور علماء نے سب سے زیادہ قربانیاں دیں اور دے رہے ہیں اور ان شاءاللہ تاقیامت دیتے رہیں گے۔

مخالفت، اعتراضات اور طعنے:

دوسری طرف ان کا نظام ایسا منظم ہے کہ لو سے جھلسی ہوئی گرم دوپہر ہو یا یخ بستہ رات، یہ طبقہ اپنا کام جاری رکھے ہوئے ہے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا ہنگاموں کی وجہ سے یا خوشی غمی کے موقع پر انہوں نے اپنی مفوضہ ذمہ داریوں میں غفلت برتی ہو لیکن آج کے ماحول کی بے حسی، معاشرے کی کج ادائی، اپنوں کی بے اعتنائی اور بے گانوں کے پروپیگنڈے نے ان کو نیم مردہ اور افسردہ کر کے رکھ دیا ہے۔

اس وقت دنیا میں 921 نظامِ تعلیم چل رہے ہیں۔ ان میں سرکاری بھی ہیں اور غیر سرکاری بھی۔ وہ بھی ہیں جنہیں اقوامِ متحدہ جیسے عالمی ادارے یا کروڑوں کا بجٹ رکھنے والی این جی اوز چلا رہی ہیں اور وہ بھی ہیں جن کے پیچھے ترقی یافتہ ترین ممالک کے بے تحاشا وسائل ہیں یا عالمی

طاقتوں کی انہیں پشت پناہی حاصل ہے لیکن دینی مدارس جیسی اتنی بڑی این جی او کو نہ تو کوئی عالمی سرپرستی حاصل ہے نہ ہی سرکاری سطح پر ان کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے بلکہ 16 ہزار رجسٹرڈ مدارس صرف مخیر حضرات کے تعاون ہی سے چلتے ہیں۔ یہ دنیا کا واحد تعلیمی ادارہ ہے جو کسی حکومت یا عالمی طاقت کے تعاون کے بغیر بلکہ مخالفت کے باوجود چل رہا ہے۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا حکومت ان کو بھی ان کی ہر قسم کی سرپرستی کرتی۔ ان کو اعزازات سے نوازتی لیکن یہاں عالم یہ ہے اپنے بھی خفا ہیں اور بیگانے بھی ناخوش۔ غیروں کی جفا کاری بھی پورے جوبن پر ہے اور اپنوں کی بے اعتنائی بھی۔ ہر طرف سے مخالفت، اعتراضات اور طعنوں کی بوچھاڑ ہے۔ جتنے منہ اتنی باتیں، جتنی باتیں اتنے طعنے ہیں۔ ''یہ زمانے کی رفتار کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ یہ بسم اللہ کے گنبد میں بند۔ ان کی دوڑ مسجد تک۔ ان کی باتیں ہماری عقل سے ماورا۔ ان کا طرز زندگی معاشرے سے میل نہیں کھاتا۔ یہ نیم خواندہ ملا، کٹ حجتی ان کی عادت، کج بحثی ان کا وطیرہ، کنفیوژن پیدا کرنا ان کا مشغلہ ہے۔

زمانے بھر کے الزام و دشنام کی توپوں کا رخ ان فاقہ مستوں کی طرف موڑ دیا مگر انہوں نے پیٹھ نہ دکھائی۔ اپنوں کے ستم خوردہ اور غیروں کے زخم رسیدہ یہ مہمانان رسول اپنے قافلے سے جدا نہیں ہوئے۔ دنیا خفا ہوئی مگر انہوں نے سب کے لیے دامن دل وسیع رکھا۔ لوگوں نے ان کے حلیے پر پھبتیاں کسیں مگر جواب میں کبھی دشنام نہیں پایا۔ لکھنے والوں نے کنویں کا مینڈک لکھا۔ شلیو واٹر کے تیراک کی پھبتی کسی مگر ان کی پیشانی پر بل نہیں پڑے۔ نام نہاد دانشوروں نے سطحیت اور جاہلیت کا طعنہ دیا مگر انہیں مطالعے سے فرصت نہیں کہ تہمتوں کا جواب دے سکیں۔ وہ ہر دور میں زمانے کے قدم سے قدم ملا کر چلے مگر کج رفتاری کا ساتھ نہ دیا۔ وہ بسم اللہ کے گنبد میں بند رہے مگر کسی کوٹھے کی زینت کبھی نہ بنے۔ ان کی باتیں عقل سے ماورا نہیں، بلکہ مادیت پرست عقلوں پر ردائے تیرگی پڑی ہوئی ہے۔

زہریلے پروپیگنڈے کا عروج:

ان کا طرز زندگی معاشرے سے میل کھاتا ہے لیکن وہ اپنے رہن سہن پر مغربی چھاپ نہیں

لگانا چاہتے۔ نیم خواندہ اس لیے کہا گیا کیونکہ ان کی اسناد گوروں کے دستخطوں سے پاک ہیں۔ وہ اپنے پاکیزہ علم کی سند کسی ٹام اور ہیری سے نہیں لینا چاہتے۔ کم علمی کا طعنہ ان پر لگایا جارہا ہے جنہوں نے بچپن اور لڑکپن کتابوں کی چار دیواری میں گزار دیا۔ قطرے سے گہر اور ننھی کونپل سے شجر سایہ دار بننے تک غموں کے سیکڑوں موسم آئے، دکھوں کے سیلابوں نے تباہی مچائی مگر ان کے پائے استقلال میں ذرا سی لرزش بھی نہیں آنے پائی۔ وہ اس قبیلے کے جواں مرد ہیں جو حریف سیل بلا رہا۔ ان کے حلیے پر بحث ہوئی لیکن ان درویشان خدامست نے کبھی کسی انگریز کی اترن نہیں پہنی۔ اپنے رہنما فاتح بیت المقدس کی تقلید میں پیوند زدہ کپڑے تو پہنے مگر کسی لارڈ سے پھوٹی کوڑی تک لینا گوارا نہ کی۔

ان کی جیب گل زر کامل عیار سے خالی سہی مگر وہ کسی جمشید کے ساغر نہیں بنے۔ انہوں نے مدرسے کی کچی پکی کھائی مگر باطل کے خلاف ہراول دستے میں وہی نظر آئے۔ پیٹ بھر کے کھانے والے انگریز کے گھوڑوں کے خرخرے کرتے رہے۔ پھبتیاں ان کے قدم روکنے کے بجائے شوق کو مہمیز دیتی ہیں۔ شیلو واٹر کا تیراک انہیں کہا گیا جو جہنم کے کھولتے پانی میں ڈبکیاں کھاتے لوگوں کو بچانے کی تگ و دو کر رہے ہیں۔ ان کے نصاب تعلیم پر وہ بات کرتے ہیں جو خود لارڈ میکالے کے یبوست زدہ دماغ سے خیرات مانگتے ہیں۔ مدرسوں کے کچے در و دیوار دیکھ کر ناک بھوں وہ چڑھاتے ہیں جنہوں نے گوروں کی چاکری کر کے زمینیں الاٹ کرائیں۔ پیوند زدہ کپڑے دیکھ کر وہ نگاہیں پھیر لیتے ہیں جن کا بال بال رشوت ستانی میں جکڑا ہوا ہے۔

سنت نبوی سے سجے ان چہروں کو دیکھ کر ''بوسیدہ چہرے'' کی پھبتی وہ کستے ہیں جن کے روئیں روئیں سے نحوست ٹپکتی ہے۔ وہ زمانے کے بدلتے رجحانات سے ناواقف نہیں مگر ہرایرے غیرے کو یہ حق نہیں دیتے کہ جابجا بھاشن سناتا پھرے۔ انہوں نے نصاب میں تبدیلیاں کی ہیں مگر کسی سے ڈکٹیشن کبھی نہیں لی۔ انہیں فخر ہے آج دنیا میں کہیں بھی اسلام کا نام لیا جاتا ہے، کسی جگہ بھی تکبیر کا نعرہ گونجتا ہے تو انہی کی شبانہ روز محنتوں کے طفیل ہے۔ زمانہ ان سے برہم ہوا مگر وہ تو ہیں ہی کفن بدوش سدا۔ راہ حق میں ان کا تن بدن چھلنی ہوا مگر ان کی آنکھ میں ابھی نور ہے اور سب سے

بڑھ کر یہ کہ مغربی میڈیا پر دینی مدارس کے خلاف زہریلے پروپیگنڈے عروج پر ہیں۔

بولتے حقائق:

حقائق بلاشبہ حقائق ہوتے ہیں وہ خود بولتے ہیں اور اپنا لوہا آپ منواتے ہیں۔ انہیں پروپیگنڈے کی گرد اڑا کر دھندلا یا تو جا سکتا ہے لیکن چھپایا نہیں جا سکتا۔ کیونکہ جب پروپیگنڈے کی گرد بیٹھ جاتی ہے تو اس کے پیچھے سے حقائق کا تابناک چہرہ پہلے سے کہیں زیادہ روشن اور پہلے سے دوچند سہ چند نکھر کر سامنے آجاتا ہے۔ آپ تاریخ اُٹھا کر دیکھ لیں۔

گزشتہ دو عشروں سے یعنی بے نظیر بھٹو کے پہلے دور سے دینی مدارس کو دبانے کی بزور طاقت کوشش کی گئی تو ری ایکشن کے طور پر دینی مدارس اور طلبہ وطالبات میں ریکارڈ اضافہ ہوا۔ 1999ء میں جب جنرل پرویز مشرف جمہوریت کا خون کر کے اقتدار پر براجمان ہوئے تو انہوں نے آتے ہی مدارس کو نتھ اور نکیل ڈالنے کی کوشش کی۔ انہیں دنوں ایک مجلس میں اس وقت کے وزیر مذہبی اُمور ڈاکٹر محمود احمد غازی نے صدر صاحب سے کہا: ''کیا آپ نے کبھی کسی جامعہ یا مدرسے کا دورہ کیا ہے؟''

جواب نفی میں تھا۔ اس کے بعد انہوں نے جامعہ اشرفیہ لاہور کا دورہ کیا تو مدارس کے صاف شفاف نظام کو دیکھ کر بہت سے اشکالات دور ہو گئے۔ بلکہ اس کے بعد بعض بیرونِ ممالک دوروں پر انہوں نے دینی مدارس کی وکالت بھی کی۔ کئی دفعہ عالمی فورمز پر بھی برملا اعتراف کیا دینی مدارس دنیا کی بہترین این جی اوز ہیں۔ اسی طرح گزشتہ دنوں پیپلز پارٹی کی سیکریٹری اطلاعات فوزیہ وہاب نے جامعہ بنوریہ سائٹ ایریا کراچی کا دورہ کیا۔ جامعہ کے تفصیلی وزٹ کے بعد انہوں نے مفتی محمد نعیم کے ہمراہ پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ مدارس قوم کی خدمت کر رہے ہیں۔ مدارس کا دہشت گردی سے کوئی تعلق نہیں...... ''افسوس کا مقام یہ ہے ملک بھر میں بلکہ دنیا بھر میں جہاں کہیں جب بھی دہشت گردی کی کوئی واردات ہوتی ہے، بغیر تحقیق اور شواہد کے اس کا الزام دینی مدارس کے سر تھوپ دیا جاتا ہے۔ پھر دہشت گردی کی آڑ میں این جی اوز اور اسلام دشمن تحریکیں راتوں رات سرگرم ہو جاتی ہیں۔

حیرت کی بات یہ ہے دینی مدارس اور دہشت گردی کے موضوع پر درجنوں مقالہ نگار، بیسیوں دانشور، سیکڑوں تجزیہ اور تبصرہ نگار اور ہزاروں بااثر افراد شکوک وشبہات کا شکار ہیں۔ آزادی کی 63 ویں سالگرہ منانے کے بعد بھی ان کا ذہن انگریز دور کے پروپیگنڈے کا شکار ہے۔ آج بھی ان کی نظروں کے سامنے کسی پسماندہ علاقے میں واقع جھونپڑے نما مدرسے کا ہی تصور ہے۔ آج بھی ان کے دماغ کے کینوس پر وہی طالب علم ہے جس کے ہاتھ دال کی بالٹی اور سر پر روٹیوں کی چنگیر ہے۔ حالانکہ آج حالات بہت بدل چکے ہیں۔ جس طرح ملک کے دیگر شعبوں نے ترقی کے منازل طے کیے ہیں اسی طرح دینی مدارس نے بھی اپنا ہر قسم کا نظام اَپ گریڈ کیا ہے۔

میں دینی مدارس کے حوالے سے ایسے تمام دانشوروں اور لکھاریوں کو دعوت دیتا ہوں وہ کچھ کہنے اور لکھنے سے پہلے کسی بڑے جامعہ کا دورہ ضرور کرلیں۔ مدارس کا دورہ کرنے اور ان کے نظام سے متعارف ہونے کے بعد سیکڑوں لوگوں کے نظریات بدلے ہیں۔ مجھے یقین ہے اگر دینی مدارس کے اُجلے کردار اور قومی خدمات پر اعتراض اور نکتہ چینی کرنے والے بنظر غائر مشاہدہ کرلیں تو ان کے بہت سے اشکالات دور ہوسکتے ہیں۔

ماڈل دینی مدارس کا قیام:

جنرل ضیاء الحق کے بعد جو بھی حکومت آئی، اس نے آزاد مدارس کو نتھ ڈالنے کی ضرور کوشش کی۔ بے نظیر بھٹو، نواز شریف، پرویز مشرف اور پھر آصف علی زرداری نے۔ صدر پاکستان نے ماڈل دینی مدارس کے قیام اور الحاق کا ''پاکستان دینی مدارس تعلیمی بورڈ آرڈی نینس 2001ء'' جاری کیا۔ اس آرڈی نینس کا اطلاق پورے پاکستان پر ہوگا لیکن اس پر عملدرآمد اس تاریخ سے ہوگا جس کا اعلان وفاقی حکومت کرے گی۔ اس آرڈی نینس کے تحت وفاقی حکومت گزٹ نوٹیفکیشن جاری کرے گی۔ اس کے ذریعے پاکستان مدارس ایڈوکیشن بورڈ کے قیام کا اعلان کرے گی۔ بورڈ کے کچھ فرائض مندرجہ ذیل ہیں۔ دینی مدارس اور دارالعلوم قائم کرنا۔ ان درسگاہوں میں جدید تعلیم دینے کا اہتمام کرنا۔ دینی مدارس کے لیے نصاب تعلیم مرتب کرنا۔ امتحانی نظام وضع کرنا اور اساتذہ کی تربیت کے لیے تفصیلی لائحہ کار متعین کرنا۔

''آنجہانی'' پرویز مشرف کے بعد آصف علی زرداری صدر بنے تو انہوں نے بھی آتے ہی امریکی ایماء پر دینی مدارس کو حکومتی کنٹرول میں لینے کی بھرپور کوشش کی۔ اس پر روزنامہ جنگ کراچی نے ایک شاندار اداریہ لکھا تھا۔ ہم بلا کم وکاست و بلا تبصرہ یہاں پر پیش کر رہے ہیں۔ اس میں اداریہ نویس نے حکومت کو سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ وہ ایسا نہ کریں۔ اس کے نتائج اچھے نہیں ہوں گے۔

''صدر آصف علی زرداری نے اعلان کیا دینی مدارس سے متعلق اصلاحات کے تحت حکومت تمام مدارس کا کنٹرول سنبھالے گی۔ طلبہ کو انتہا پسندوں سے علیحدہ کر کے انہیں دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ جدید تعلیم سے بھی بہرہ مند کیا جائے گا۔ پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت نے مدرسہ سسٹم میں اصلاحات لانے کا عزم کر رکھا ہے جس کے تحت نصاب کو جدید بنایا جائے گا۔ انہیں حکومتی نظام میں شامل کر لیا جائے گا۔ ان خیالات کا اظہار واشنگٹن میں پاکستانی کمیونٹی سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔

چونکہ پاکستان کو درپیش چیلنجز سے کوئی بھی اکیلے نہیں نمٹ سکتا، لہٰذا اس مقصد کے لیے ہم نے تمام سیاسی جماعتوں کا تعاون حاصل کیا ہے تاکہ شدت پسندی کا مکمل طور پر خاتمہ کیا جا سکے۔ بعض سیاسی حلقوں کا تاثر یہ ہے دورۂ واشنگٹن کے دوران صدر آصف علی زرداری کے بعض بیانات خاص طور پر تمام دینی مدارس کو اصلاحات کے تحت حکومتی کنٹرول میں لینے کا اعلان براہِ راست امریکی دباؤ کا نتیجہ ہے کیونکہ امریکی تھنک ٹینکس، مغربی ذرائع ابلاغ اور بعض دانشوروں کی طرف سے ان مدارس کے متعلق بلا جواز طرح طرح کے خدشات اور تحفظات کا اظہار معمول بن کر رہ گیا ہے۔

پرویز مشرف کے دور میں بھی حکومت کی طرف سے دینی مدارس کو کنٹرول میں لینے کا خیال سامنے تھا۔ ان مدارس کو رجسٹریشن کرانے کی ہدایات بھی جاری کی گئی تھیں۔ حکومت اور وفاق المدارس کے عہدیداروں کے درمیان مذاکرات بھی ہوئے اور وفاق المدارس کی طرف سے کھل کر حکومتی اقدامات کی نہ صرف مخالفت کی گئی بلکہ اس کے خلاف مزاحمت کا عندیہ بھی دیا گیا۔ یہاں تک کہ مدارس کی رجسٹریشن میں بھی کوئی بڑی پیش رفت نہ ہو سکی۔ وفاق المدارس کے

عہدیداران اور مدارس کے منتظمین کا کہنا تھا وہ دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ جدید علوم کی تدریس اور کمپیوٹر کی تعلیم بھی نصاب تعلیم میں شامل کر چکے ہیں۔ وسائل کی فراہمی کے ساتھ ساتھ اسے مزید آگے بڑھایا جائے گا۔ جہاں تک دینی مدارس کی تعلیمی خدمات کا تعلق ہے وہ ایک مسلمہ حقیقت کا درجہ رکھتا ہے۔

مدارس حکومتی خزانے پر بوجھ ہیں؟

برصغیر میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کے خاتمے اور برطانوی حکومت کے قیام کے بعد 35 ہزار سے زائد دینی مدارس کی وقف املاک کو برطانوی حکومت نے سرکاری تحویل میں لے کر ان کے مالی وسائل اور خود کفالت پر ایک کاری ضرب لگائی ورنہ اس سے پہلے یہ مدارس ان وقف املاک سے حاصل ہونے والی آمدن سے اپنے اخراجات کی کفالت کرتے تھے۔ اس کے بعد ان مدارس کو معاشرے کے صاحب ثروت اور مخیر افراد کا تعاون حاصل کرنا پڑا۔ امر واقع یہ ہے ہزاروں نہیں لاکھوں غریب اور بے سہارا طلبہ و طالبات آج ان دینی مدارس میں دینی تعلیم کے علاوہ مروجہ اور کمپیوٹر کی تعلیم بھی حاصل کر رہے ہیں اور اب ان مدارس سے فارغ التحصیل طلبہ کو صرف تلاش روزگار کے لیے مساجد کی امامت کے لیے ہی تگ ودو نہیں کرنا پڑتی بلکہ وہ زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی خدمات انجام دینے میں مصروف ہیں۔ پاکستانی مدارس میں دوسرے ممالک کے طلبہ کی اچھی خاصی تعداد بھی زیر تعلیم ہے اور رہائش و خوراک اور نصابی کتب کے علاوہ ان کے تمام اخراجات ان مدارس کے منتظمین برداشت کرتے ہیں البتہ معاشرے کے مخیر اور صاحب ثروت افراد بھی دینی فریضہ سمجھ کر ان سے تعاون کرتے ہیں۔ یہ مدارس حکومتی خزانے پر قطعاً بوجھ نہیں ہیں۔

حکومت عجلت میں یکطرفہ اقدام یا کارروائی کے بجائے وفاق المدارس کے عہدیداران اور مدارس کے منتظمین کے ساتھ وسیع تر مشاورت کا اہتمام کرے اور اپنے اس کردار سے انہیں یقین دلائے یہ اقدام کسی بیرونی دباؤ کا نتیجہ نہیں۔ جہاں تک مدارس کی رجسٹریشن کا تعلق ہے اسے بھی باہمی مشاورت سے طے کیا جا سکتا ہے۔ اس حوالے سے حکومتی حلقوں کی طرف سے ماضی میں جن خدشات و خطرات کا اظہار کیا جاتا رہا وہ بھی بے نتیجہ ثابت ہوئے۔ ان مدارس کا ایک اپنا تاریخی

پس منظر ہے۔ برطانوی استعمار نے جب مسلمانوں پر تعلیم کے دروازے بند کیے تو یہ دینی مدارس ہی تھے جنہوں نے علم کی شمع کو روشن رکھا اور تعلیم کے فروغ میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ آج بھی وہ لاکھوں طلبہ جو غربت وافلاس اور پسماندگی کی وجہ سے تعلیمی اخراجات برداشت کرنے کے متحمل نہیں ہوسکتے۔ ان مدارس کی بدولت دینی اور مروجہ علوم کی تعلیم حاصل کرنے میں مصروف ہیں۔

اس طرح یہ مدارس جہالت اور ناخواندگی کا گراف کم کرنے اور خواندگی کے فروغ میں ایک تعمیری کردار ادا کررہے ہیں۔ رہا جدید اور مروجہ علوم کی تدریس اور اصلاحات کی ترویج کا سوال! تو ان مدارس نے عصری تقاضوں کے حوالے سے اس سے نہ کبھی انکار کیا ہے نہ اس کی مخالفت کی۔ البتہ اس کے لیے جن مالی وسائل کی ضرورت ہے، ان کی فراہمی میں حکومت تعاون کرکے ان مدارس کو جدید اور ترقی یافتہ تعلیمی اداروں کی صف میں شامل کرسکتی ہے۔ اس لیے ضرورت اس امر کی ہے تمام مکاتب فکر کے دینی مدارس کے ساتھ حکومت مشاورت کا عمل شرع کرے اور جو بھی اقدام کیا جائے اس میں کسی قسم کا بیرونی ہاتھ شامل نہ ہو۔ بلکہ یہ امر پوری طرح واضح ہوکر سامنے آنا چاہیے اس اقدام کا مقصد دینی مدارس کے نصاب کو جدید اور عصری تقاضوں کے مطابق بناکر ان کے وقار اور تشخص میں اضافہ کرنا اور مغربی حلقوں اور تھنک ٹینکس کی طرف سے ان کے خلاف مضحکہ خیز اور بے بنیاد الزام تراشی کا ازالہ کرتے ہوئے ان کا مسکت اور مدلل جواب دینا ہے۔ مختلف مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے مدارس کے منتظمین سے مشاورت اور ان کی رضامندی سے لائی جانے والی تبدیلی ہی نتیجہ خیز ثابت ہوسکتی ہے۔ اس طرح مدارس کے منتظمین، ممتاز علمائے کرام، دانشور اور دینی حلقے بھی معروضی حالات اور عصری تقاضوں کا ادراک کرتے ہوئے مثبت اور تعمیری اقدامات اور تبدیلیوں کا نہ صرف خیر مقدم کریں گے بلکہ حکومت کے ساتھ بھرپور تعاون کو بھی یقینی بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھیں گے۔

تعلیمی اصلاحات کا پروگرام:

یوں بھی حکومت کا تعلیمی اصلاحات کا پروگرام صرف دینی مدارس تک ہی محدود نہیں رہنا چاہیے بلکہ وسیع تر قومی اور ملکی مفادات کا تقاضا یہ ہے پورے ملک کی سطح پر لیا جائے جس سے مختلف

مکاتب فکر کے درمیان فروعی اختلافات کو ختم کرنا ممکن ہو سکے۔ اس سے قومی اتحاد و یکجہتی کو اسلامی تعلیمات کی بنیاد پر فروغ دینا ممکن ہو سکے گا۔ خدانخواستہ اگر حکومت نے اپنی مرضی سے محض یکطرفہ اقدام کرتے ہوئے مدارس پر اپنا فیصلہ مسلط کرنے کی کوشش کی تو یہ دانشمندانہ اقدام نہیں ہوگا۔ اس سے دینی حلقوں میں شدید غلط فہمیاں جنم لیں گی۔ قوم پہلے ہی سنگین مسائل اور چیلنجز سے نبرد آزما بدامنی اور لاقانونیت کی دلدل میں دھنستی جا رہی ہے اس لیے اب حکومت کو کسی یکطرفہ اقدام کے نتیجے میں کوئی نیا محاذ کھولنے سے بہرطور اجتناب کرنا چاہیے۔''

اس کے چند ہی دن بعد حکومت اور دینی مدارس کے مابین مذاکرات ہوئے۔ وزیر داخلہ رحمٰن ملک کے اس اعلان کے بعد کہ ''دینی مدارس کے پانچوں وفاقوں کو مستقل بورڈ کی شکل دی جائے گی۔'' دانشور اس کی کامیابی اور ناکامی کے حوالے سے تجزیوں میں مصروف ہیں۔ اس موضوع پر تجزیاتی گفتگو سے پہلے ایک زمانے سے جاری رہنے والے حکومت اور دینی مدارس کے مابین مذاکرات پر نظر دوڑانا مناسب ہوگا۔ اس حوالے سے وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے ناظم اعلیٰ قاری محمد حنیف جالندھری کا شائع ہونے والا کالم مستند معلومات فراہم کرتا ہے۔ آپ نے فرمایا:

ہم حکومتی نمائندوں کے ساتھ ہونے والے مذاکرات میں انہیں ہمیشہ یہ باور کروانے کی کوشش کرتے رہے کہ مدارس کو قوت وطاقت سے کنٹرول کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی کوئی متبادل سسٹم انہیں عضو معطل بنا سکتا ہے۔ سابقہ حکومتوں کی طرح موجودہ حکومت کے ذمہ داران نے پہلے پہل تو مدارس کے بارے میں سرے سے لاتعلقی اور اعراض کا رویہ اختیار کیا اور مدارس کے تمام نمائندہ وفاقوں کے قائدین سے ملاقات ومذاکرات کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔

کچھ عرصے بعد جب مدارس کے بارے میں بیان بازی کا سلسلہ شروع ہوا تو وہ تمام اعلانات اور بیانات سابقہ حکمرانوں کی پالیسیوں اور غلط فہمیوں کا تسلسل دکھائی دینے لگے۔ ایسے میں مدارس اور قوم کی طرف سے صدائے احتجاج بلند ہوئی۔ میں نے وزیر اعظم پاکستان سے ڈیڑھ گھنٹہ ون ٹو ون طویل اور تفصیلی ملاقات کر کے انہیں عوامی تشویش اور اہلِ مدارس کے اضطراب سے آگاہ کیا اور یہ تجویز دی دینی مدارس سے محاذ آرائی کے بجائے مفاہمت کا رویہ اختیار کیا جائے،

چنانچہ کچھ برف پگھلی اور حکومتی نمایندوں اور اتحاد تنظیمات مدارس کے مابین مذاکرات کا آغاز ہوا۔
29 ستمبر 2009ء کو شیخ الحدیث مولانا سلیم اللہ خان صدر اتحاد تنظیمات مدارس کی قیادت میں وفاقی
وزیر داخلہ کے ساتھ ہونے والی دوسری ملاقات میں ہم نے ایک مرتبہ پھر اپنے دیرینہ موقف کا
اعادہ کیا۔

افہام و تفہیم کا ماحول:

ہم نے سابقہ ملاقات کے موقع پر یہ بھی مطالبہ کیا تھا کہ مدارس چوں کہ تعلیمی اور تربیتی ادارے
ہیں، اس لیے ان کے معاملات وزارت داخلہ کے بجائے وزارت تعلیم کے سپرد کیے جائیں، چنانچہ
حالیہ مذاکرات میں پہلا مثبت تاثر تو ہمیں یہ ملا کہ نہ صرف وزارت داخلہ بلکہ وزارت مذہبی امور اور
وزارت تعلیم کے سیکرٹری اور جوائنٹ سیکرٹری صاحبان بھی مذاکرات میں شریک ہوئے۔ سابق
سیکرٹری وزارت مذہبی امور وکیل احمد خان جو مدارس اور حکومت کے مابین ہونے والے گزشتہ
پورے عشرے کے مذاکرات کا اہم حصہ رہے، انہیں بھی بطور خاص مدعو کیا گیا تھا اور سب سے اہم
بات یہ تھی کہ مدارس کی قیادت سے ملاقات سے قبل حکومتی نمایندوں نے ضروری ہوم ورک مکمل
کر رکھا تھا اور جناب وکیل احمد خان نے وفاقی وزیر داخلہ اور دیگر افسران کو مدارس کے ساتھ ہونے
والے مذاکرات اور معاملات کے بارے میں تفصیلی بریفنگ دے رکھی تھی۔

یوں ہمارا کام بہت آسان ہو گیا اور حکومتی نمایندوں کو اپنی بات سمجھانے اور ان سے اپنے
مطالبات منوانے میں ہمیں زیادہ مشکل پیش نہیں آئی۔ اس روئیداد سے یہ بات واضح ہوتی ہے
دینی مدارس کبھی بھی جدید علوم وفنون کی اہمیت سے نابلد نہیں رہے اور نہ ان کے ارباب اختیار
علمائے کرام اور طلبہ مدارس کو دورِ حاضر کے جدید تقاضوں سے بے بہرہ رکھنا چاہتے ہیں۔ بلکہ
حقیقت یہ ہے سابق آمر پرویز مشرف سمیت کسی بھی حکمران نے سنجیدگی سے ان کے موقف کو سننے
کی زحمت گوارا نہیں کی۔ جب امریکا یا مغربی دنیا اپنی اسلام دشمنی کی وجہ سے مدارس کے خلاف
زبانیں کھولتے ہیں تو ان کے پاکستانی ایجنٹ بھی مدارس کے خلاف پروپیگنڈے میں مصروف
ہو جاتے ہیں۔ میڈیا کی چمک دمک میں اصل حقائق چھپ جاتے ہیں اور مدارس کے خلاف فضا

ہموار ہونے لگتی ہے۔ موجودہ حکومت مبارکباد کے لائق ہے کہ شدید امریکی دباؤ کے باوجود وہ کھل کر مذاکرات کر رہی ہے لیکن اصل دباؤ برداشت کرنے کا مرحلہ اب آئے گا کیونکہ تجربہ یہی ہے مغرب ایسی ہر کوشش کو ناکام بنانے کے لیے انتہا پسندانہ عزائم رکھتا ہے۔ وہ لاکھ کہے ہم اسلام اور مدارس کے خلاف نہیں صرف دہشت گردی کے خلاف ہیں، لیکن افغانستان کے طالبان کی پر امن حکومت ہو یا مالاکنڈ کا امن معاہدہ ہو۔ وہ کسی بھی موقع پر غیر جانبدار رویہ ثابت کرنے میں ناکام رہا ہے۔ اس لیے قوی خدشہ ہے مغرب حکومت کے اس مثبت اور تعمیری اندازِ فکر کے خلاف دباؤ بڑھائے۔

ایسے میں حکومت کی ذمہ داری ہے وہ مغرب کے مقابلے میں اسٹینڈ لے اور ایک طویل زمانے کے مذاکرات کے ذریعے اسے جو مدارس کا ملک کے لیے نافع اور مخلص ہونا ثابت ہوا ہے وہ سفارت کاری اور لابنگ ایکسپرٹس کی معاونت سے مغرب کو بھی باور کرائے۔ تاریخی اعتبار سے یہ بات مسلّم ہے کہ خلافت راشدہ اور دیگر اسلامی سلطنتوں میں سرکاری طور پر جو جامعات قائم ہوتی تھیں، ان میں دینی اور عصری دونوں تعلیم دی جاتی تھیں۔ مغلیہ حکومت کے زوال کے بعد انگریزوں نے رائج علمی زبان فارسی پر پابندی لگادی اور سارا نظام حکومت انگریزی میں کر دیا جس کی وجہ سے اپنے وقت کے بہترین اہلِ علم وفن زبان کے اختلاف کی وجہ سے کارکردگی دکھانے سے محروم ہو گئے۔ انگریزوں کے اقدامات کی وجہ سے مسلمان عصری اور دینی میدانوں سے محروم ہونے لگے۔

ایکشن کا ری ایکشن:

ایسے موقع پر دینی علوم اور دینی شناخت کی بقا کے لیے خالص دینی مدارس کا قیام عمل میں لایا جانا وقت کی ناگزیر ضرورت تھی۔ بلاشبہ یہ دینی مدارس ہی تھے جن سے فارغ ہونے والے علماء، ائمہ، مؤذن، مبلغین، خطبا اور مفتی حضرات نے غلامی کے زمانے میں اسلامی شناخت کو برقرار رکھا اور یقیناً یہ اپنے ہدف میں 100 فیصد کامیاب رہے ہیں۔ افسوس کی بات یہ ہے اسلامی ملک بننے کے بعد حکومتی سطح پر عصری تعلیمی اداروں میں دینی تعلیم و تربیت کا مناسب اہتمام نہ ہوسکا بلکہ الٹا مدارس کے خلاف پروپیگنڈوں کا سلسلہ جاری رہا جس کی وجہ سے نہ عصری ادارے دینی تربیت

سے آراستہ ہو سکے اور نہ مدارس دینیہ بقول بعض ناقدین ''قومی دھارے میں شامل کیے جاسکے۔''

خوش آیند بات یہ ہے اکتوبر 2010ء کو حکومت اور مدارس دینیہ کی قیادت کے مابین طویل مذاکرات ہوئے اور ان امور پر اتفاق کیا گیا۔ (1) حکومت دینی مدارس کے پانچوں نمائندہ وفاقوں کو خود مختار تعلیمی اور امتحانی بورڈ کا درجہ دے گی اور ایگزیکٹو آرڈر یا ایکٹ آف پارلیمنٹ کے ذریعے اس بورڈ کو قانونی اور آئینی حیثیت دی جائے گی۔ (2) دینی مدارس میں میٹرک اور انٹرمیڈیٹ تک عصری مضامین کو شامل کیا جائے گا۔ (3) دینی مدارس گورنمنٹ کی طرف سے شائع کردہ متعلقہ کلاس کی عصری مضامین کی کتب پڑھائیں گے، اپنے لیے کوئی الگ نصاب یا کتب تیار نہیں کریں گے۔ (4) درس نظامی اور دینی علوم کے حوالے سے حکومت کا کوئی عمل دخل نہیں ہوگا، مدارس دینیہ اپنے نصاب کی تشکیل وتعیین اور تدریس وتعلیم کے سلسلے میں مکمل طور پر آزاد اور خود مختار ہوں گے۔ (5) ہر وفاق کی نصاب کمیٹی میں حکومت کے دو نمایندے ہوں گے جو بوقت ضرورت صرف عصری مضامین کی تعلیم وتدریس اور معیار کے حوالے سے ہونے والی مشاورت میں شریک ہوں گے۔ ان دونوں نمایندوں کا دینی نصاب ونظام سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ (6) عصری مضامین کے نصاب تعلیم، معیار تعلیم اور معیار امتحان میں یکسانیت پیدا کرنے کے لیے مدارس کے نمایندہ وفاقوں اور حکومت کے درمیان ایک مشترکہ ادارہ بنے گا جس کا نام، دائرہ اختیار، دائرہ کار اور ہیئت کے حوالے سے اگلے اجلاس میں مشاورت کی جائے گی۔ (7) رجسٹریشن ایکٹ جو 2006ء میں جاری ہو چکا اور نافذ العمل بھی ہے، دینی مدارس اس کی مکمل پاسداری کریں گے۔ (8) حکومت کسی بھی مدرسے کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرے گی تاوقتیکہ وہ ٹھوس ثبوت کے ساتھ متعلقہ وفاق کو اعتماد میں نہ لے۔ (9) ایکٹ آف پارلیمنٹ یعنی ایگزیکٹو آرڈر کا مسودہ حکومت اور اتحاد تنظیمات مدارس کی باہمی مشاورت سے تیار کیا جائے گا۔ حکومت یک طرفہ طور پر کوئی مسودہ پیش نہیں کرے گی۔''

2010ء میں ہونے والے مذاکرات:

ان مذاکرات اور اس کے نتیجے میں طے پانے والے معاہدے پر بعض حضرات کی طرف سے

تحفظات کا اظہار کیا گیا ہے۔ اس پر قاری حنیف صاحب کا کہنا تھا: ''عصری تعلیم کو مدارس میں شامل کرنا کوئی بیرونی ایجنڈا نہیں بلکہ وفاق المدارس کی قیادت اور ہمارے اکابر نے اس کی ضرورت کا احساس کرتے ہوئے آج سے دو دہائیاں قبل 1989ء میں مڈل تک عصری تعلیم کو شامل نصاب کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ اس دور کی بات ہے جب حکومت سے کسی قسم کے مذاکرات وغیرہ کا کوئی سلسلہ نہیں تھا لیکن اس کے باوجود اس وقت مڈل تک نصاب میں انگریزی، ریاضی سمیت جملہ عصری مضامین کی تدریس کا سلسلہ شروع کیا گیا اور متوسطات کے نام سے مڈل تک عصری تعلیم دی جانے لگی اور 1989ء سے لے کر اب تک متوسطہ باقاعدہ مدارس کے نظام کا حصہ ہے۔ اس کے بعد 2002-03ء میں نویں اور دسویں کلاس کی تعلیم کو از خود وفاق المدارس نے اپنے نصاب میں شامل کیا، جو آج تک اختیاری طور پر نصاب میں شامل ہے۔ اب صرف ایک قدم آگے بڑھ کر انٹرمیڈیٹ تک تعلیم دینے کا ارادہ کیا گیا ہے، کیونکہ وفاق المدارس کی ہمیشہ یہ پالیسی رہی ہے ایسی عصری تعلیم جو ہمارے مقاصد میں مخل نہ ہو، بلکہ ممد ومعاون ہو اسے نصاب میں شامل کرنے میں ہمیں کوئی تردد نہیں ہوگا۔

دوسری بات جس پر ہمارے ہاں بہت حساسیت پائی جاتی ہے وہ حکومتی مداخلت ہے۔ اس حوالے سے یاد رہے کہ حکومتی نمائندے مدارس کی تنظیموں کی مجالس عاملہ یا مجالس شوریٰ میں شامل نہیں ہوں گے، بلکہ محض نصابی کمیٹی میں شامل ہوں گے اور وہ بھی صرف اس اجلاس میں شریک ہوں گے جس کے ایجنڈے میں عصری تعلیم کے حوالے سے کوئی مشاورت یا غور وخوض کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ دینی معاملات اور دینی امور کے ساتھ ان کا کوئی سروکار نہیں ہوگا۔ یوں 30 افراد پر مشتمل امتحانی کمیٹی میں ان دو افراد کی موجودگی معاونت کے لیے ہوگی، مداخلت کے لیے نہیں۔ مدارس دینیہ کی قیادت نے پوری دیانت داری، ذمہ داری اور احتیاط کے ساتھ یہاں تک سفر کیا ہے اور ابھی بہت سفر اور کئی مراحل باقی ہیں۔ اکابر کی رہنمائی، مجالس عاملہ ومجالس شوریٰ کی مشاورت اور ارباب مدارس کی تجاویز کی روشنی میں آگے بڑھا جائے گا۔''

قاری حنیف کا کہنا تھا: ''سمجھتا ہوں اب تک کی پیش رفت ہماری کامیابی ہے کیونکہ مدارس

کے نمائندہ وفاقوں کو خود مختار امتحانی بورڈ کا درجہ دینے کا مطالبہ ہمارا دیرینہ مطالبہ تھا اور ہمارے ہر اجلاس، ہر قرارداد اور اعلامیے میں بار بار اس کا مطالبہ کیا جاتا رہا ہے۔ اسی طرح مدارس کی امتحانی اسناد کی عدم قبولیت بھی ہمارا ایک دیرینہ مسئلہ تھا۔ اس سے قبل حکومت مدارس کے سسٹم اور حیثیت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھی، لیکن اس فیصلے سے ہم اپنا تشخص منوانے میں بھی کامیاب ہوئے۔ اپنی تعلیمی اور امتحانی حیثیت قبول کروانے میں بھی کامیاب رہے۔ اپنی امتحانی اسناد کی حیثیت بھی منوالی۔ باقی یہ بات بھی ذہن نشیں رہے مدارس کی قیادت مدارس کے معاملے میں کسی بھی شخص سے زیادہ محتاط اور حساس ہے اور تمام قائدین کو اس بات کا بخوبی احساس و ادراک ہے اس وقت دینی مدارس بیرونی قوتوں کے ایجنڈے پر ہیں۔ یہی وجہ ہے مدارس کی قیادت کو جو کٹھن لڑائی لڑنی پڑ رہی ہے۔ تمام احباب خاطر جمع رکھیں، ایسا کوئی فیصلہ قطعاً قبول نہیں کیا جائے گا جس سے مدارس کی حیثیت، مقاصد یا حریت و آزادی پر کوئی حرف آئے۔''

اصل بات کیا ہے؟

اگر موجودہ حکومت اعتماد کی فضا قائم کرنے میں کامیاب ہوگئی اور مغربی دباؤ کا شکار ہوئی تو کچھ بعید نہیں چند عشروں کے بعد ہماری یونیورسٹیوں سے ایک طرف دین دار ڈاکٹر، انجینئر، وکیل اور دوسری طرف انگریزی کمپیوٹر اور عصری معلومات سے آراستہ علما اور مفتیان کرام کی کھیپ نکلا کرے گی۔ حکومت استقامت دکھائے تو یہ خام خیالی نہیں بلکہ مستقبل کی حقیقت ثابت ہوگی۔''

اصل بات یہ ہے حکومت ایسے دینی مدارس قائم کرنا چاہتی ہے جن میں دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ دنیوی تعلیم بھی دی جائے گی تاکہ ان اداروں کے طلبہ دوسرے طلبہ کے ساتھ شانہ بشانہ ہم آہنگ ہو کر اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کرسکیں اور بھرپور نتائج حاصل کریں۔ اس قسم کی حکومتی کوشش میں کوئی قابل اعتراض بات ہی نہیں ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد اپنی مشہور تصنیف ''تذکرہ'' میں فرماتے ہیں: ''مدتوں غور کرنے کے بعد یہ حقیقت کھلی اُمت مسلمہ کے تمام مفاسد کی اصلی جڑ دو ہی چیزیں ہیں جن کو یونانیت اور عجمیت سے تعبیر کرنا چاہیے۔ سارے برگ و بار و ثمرات کا انہیں سے ظہور رونما ہوا۔ آج ہمارے مدارس میں جو علوم پڑھے پڑھائے جاتے ہیں۔ اگر کسی صاحب

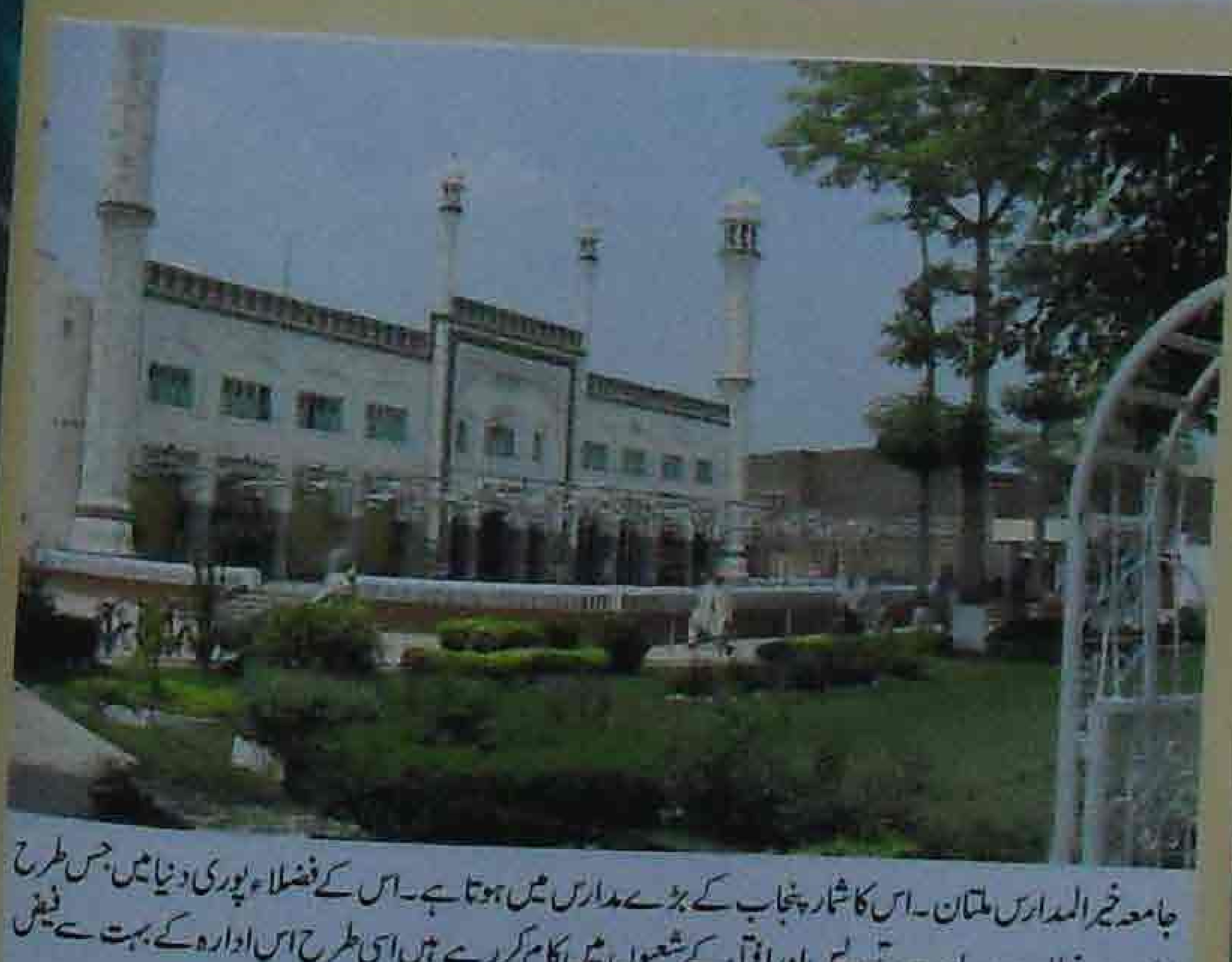




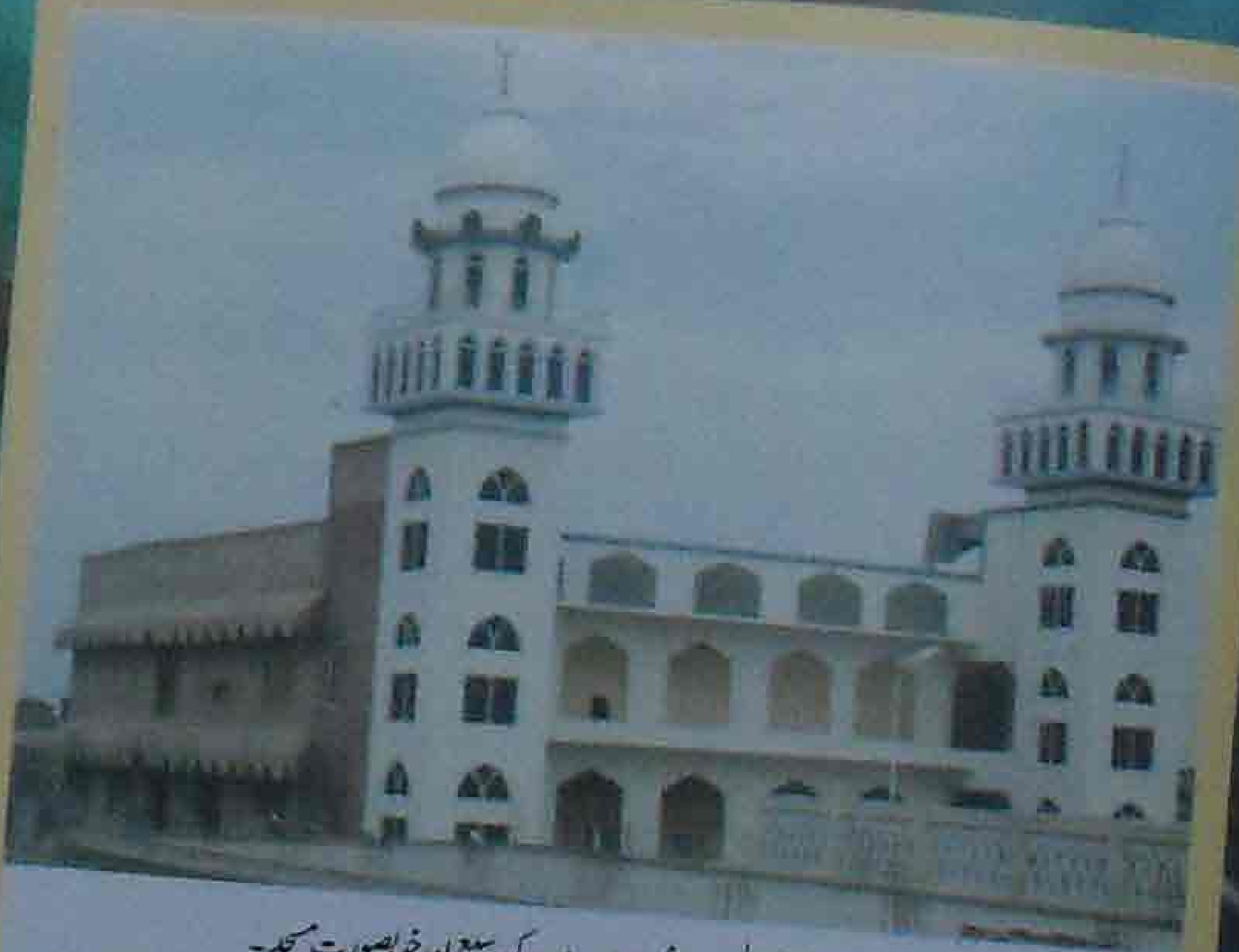
''مدرسہ دارالعلوم الاسلامیہ'' نیو ہالا سندھ۔ اس علاقے میں اس سے قبل کوئی معیاری دینی ادارہ نہیں تھا۔ مدرسے کے روح رواں اور مہتمم حضرت مفتی رشید احمد لدھیانوی رحمہ اللہ کے خلیفہ مجاز مفتی خالد صاحب ہیں۔



کراچی کی معروف دینی درس گاہ "جامعہ احسن العلوم گلشن اقبال"۔ شیخ الحدیث مفتی زرولی خان صاحب دامت برکاتہم کا اپنے ہاتھوں سینچا ہوا پودا جو ایک مضبوط تناور درخت کا روپ دھار چکا ہے۔



جامعہ خیر المدارس ملتان۔ اس کا شمار پنجاب کے بڑے مدارس میں ہوتا ہے۔ اس کے فضلاء پوری دنیا میں جس طرح امامت، خطابت، سیاست، تدریس اور افتاء کے شعبوں میں کام کر رہے ہیں اسی طرح اس ادارہ کے بہت سے فیض یافتہ ماضی اور حال میں شیخ الحدیث کے عہدے پر بھی فائز ہیں۔



جامعہ دارالعلوم الحسینیہ شہداد پور سندھ کی وسیع اور خوبصورت مسجد۔



جامعہ دارالعلوم الحسینیہ شہداد پور۔ پاکستان بھر میں شعبہ حفظ کے لیے یہ سب سے بڑا مدرسہ شمار ہوتا ہے۔



جامعہ دارالعلوم الحسینیہ شہداد پور کا دارالحدیث۔



جامعہ دارالعلوم الحسینیہ شہداد پور کا ایک کمرہ۔ جس میں حضرت سید انور شاہ نفیس رحمہ اللہ کی خطاطی کے شہ پارے لگے ہوئے ہیں۔

حکمت کی نظران کی تحلیل کرے کہ کس قدران کا شریعت اصلیہ اور دین خالص سے مرکب ہے اور کس قدر اس فتنہ عالم آشوب، یونانیت اور عجمیت سے، کوئی شے اس سے نہ بچی۔ حتیٰ کہ علوم الٰہیہ وتلاوت وبیان اور عملاً جزئیات اعمال ورسوم وہیئات معاشرت وغیرہ۔ جب یہ حال علوم شرعیہ کا ہے تو پھران اساطیرِ اوہام کا کیا پوچھنا، جن کو بہ لقب شریف ''معقولات'' پکارا جاتا ہے۔''

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں: ''ان کا سرمایۂ ناز علم حق نہیں ہے جو تفرقہ مٹاتا اور اتباع سبل متفرقہ کی جگہ ایک ہی صراط مستقیم پر چلتا ہے بلکہ یکسر خلاف ہے، نفس پرستی اس کی کثافت کو خمیر کردیتی ہے اور دنیا طلبی کی آگ اس کی ناپاکی کے بخارات اور تیز کرتی رہتی ہے۔''

جہاں تک قاری صاحب کی بات ہے اس سے یہی بات سمجھ آتی ہے کہ دینی مدارس کے لوگ کبھی بھی یہ نہیں کہتے کہ کوئی انجینئر نہ بنے یا کوئی ڈاکٹر نہ بنے، بلکہ اسلام کے شروع کے زمانے میں ایک بہترین عالم تاجر بھی ہوتا تھا اور امور دین کے لیے بھی وقت نکالتا تھا۔ اسی پر مولانا مودودی فرماتے ہیں: ''دوسری چیز جو ہمیں اپنے نظام تعلیم میں بطور اصول پیش نظر رکھنی چاہیے۔ اسی کی بنیاد پر ہمارا سارا نظام تعلیم بننا چاہیے۔ وہ یہ ہے ہم اس دین ودنیا کی تفریق کو ختم کردیں۔ دین ودنیا کی تفریق کا تخیل ایک عیسائی تخیل ہے یا بدھ مذہب یا ہندوؤں اور جوگیوں کا ہے۔ اسلام کا تخیل اس کے بالکل برعکس ہے۔ ہمارے لیے اس سے بڑی کوئی غلطی نہیں ہوسکتی کہ ہم اپنے نظام تعلیم میں، اپنے نظام تمدن میں اور اپنے نظامِ مملکت میں اس دین اور دنیا کی تفریق کے تخیل کو قبول کرلیں۔''

خاک میں ملتے منصوبے:

اب ہم واپس آتے ہیں ماڈل دینی مدارس کے منصوبے کی طرف! پاکستان کے پانچوں بورڈز نے ''ماڈل دینی مدارس'' کے قیام اور دینی مدارس بورڈز آرڈی نینس کو مسترد کردیا ہے اور اسے مدارس کے خلاف سازش قرار دیا ہے۔ حکومتی اسکیم میں شرکت نہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور کہا ہے دینی مدارس اور جامعات کی آزادی اور خودمختاری کا ہر قیمت پر تحفظ کیا جائے گا۔''

سرکاری امداد کے سہارے چلنے والے دینی مدارس کی حالت ملک کی مختلف ریاستوں میں کھلی

آنکھ سے ہر جگہ دیکھی جاسکتی ہے جنہیں دیکھ دیکھ کر سعید روحیں عبرت حاصل کرتی ہیں۔ان مدارس کا اوران سے فاضل بن کر نکلنے والوں کا انجام سامنے ہے۔یہ مدرسے کس حدتک دینی ہوتے ہیں اوران سے نکلنے والے کس حدتک درجۂ فضیلت کے حامل ہوتے ہیں! ہر فرد وبشر اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے۔انہی کو پیش نظر رکھ کر امریکا کی حکومت سے امداد لینے والے مدارس کے بارے میں قبل از وقت سمجھا جاسکتا ہے۔ظاہر ہے جو مدارس حکومت کی امداد سے چلیں گے،ان کا منظور شدہ نصاب پڑھائیں گے وہ مسلمانوں کو کیا دیں گے؟

تین بڑی کمزوریاں:

پروفیسر ڈاکٹر محمد امین اپنے ایک مقالے ''حکمت عملی میں تبدیلی کی ضرورت'' میں لکھتے ہیں:

''موجودہ دینی مدارس کے نظام تعلیم میں تین بڑی کمزوریاں ہیں: (1) وہ صرف مذہبی تعلیم دیتے ہیں،اورصرف مساجد ومدارس کے لیے افراد تیار کرتے ہیں۔ (2) یہ تعلیم مسلک پرستی اور فرقہ واریت پرمبنی ہوتی ہے۔ (3) یہ مدارس صرف علماء اور متخصصین تیار کرتے ہیں اور عام مسلمانوں اور ان کی اولاد کی دینی تعلیم وتربیت میں کوئی خاص کردار ادانہیں کرتے۔

اس کا نقصان یہ ہوا معاشرے اور ریاست کی قیادت ان لوگوں کے ہاتھ میں چلی گئی ہے جو دینی تعلیم وتربیت سے بے بہرہ ہیں۔کیونکہ جدید تعلیم ملحدانہ مغربی فکر وتہذیب پر مبنی ہے اور تعلیم کی اسلامی اساسات سے بڑی حدتک محروم ہے۔علمائے کرام نے مذہبی تعلیم کے کارِ خیر میں مصروف ہونے کی وجہ سے جدید تعلیم کو نظر انداز کردیا ہے اور عام مسلمانوں کی تعلیم وتربیت کو اور جدید تعلیمی نظام کو اسلام کے مطابق ڈھالنے کی جدوجہد کو وہ اپنی ذمہ داری نہیں سمجھتے۔جدید علوم خصوصاً انگریزی زبان نہ جاننے کی وجہ سے اور جدید علوم سے دور ہونے کی وجہ سے دینی مدارس سے فارغ التحصیل ہونے والے علمائے کرام مساجد ومدارس میں ملازمت کے علاوہ دنیا کا کوئی کام نہیں کرسکتے۔

دینی مدارس اگر اس صورتِ حال سے نکلنا چاہیں تو ان کا لائحہ عمل مندرجہ ذیل نکات پر مبنی ہونا چاہیے:

(1) اپنے مقاصد تعلیم میں وسعت پیدا کریں اور مسجد ومدرسہ کے لیے رجال کار تیار کرنے

کے ساتھ ساتھ پاکستان کے مسلم معاشرے اور ریاست کو چلانے کے لیے رجال کار بھی تیار کریں۔

(2) دینی مدارس ان کروڑوں مسلمان بچوں کی مذہبی تعلیم وتربیت کی ذمہ داری بھی قبول کریں جو ملک جدید تعلیمی دھارے میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ اس کے کئی طریقے اختیار کیے جاسکتے ہیں اور حالات کی نزاکت کا تقاضا ہے سب پر بیک وقت عمل کیا جائے۔ ایک یہ کہ علمائے کرام اور دینی عناصر خود جدید تعلیم کے ادارے کھولیں اور انہیں اسلامی تناظر میں چلائیں۔ دوسرے یہ کہ جدید تعلیم کا جو نظام اس وقت پبلک اور پرائیویٹ سیکٹر میں چل رہا ہے، اسلامی تناظر میں اس کی اصلاح کا مطالبہ نہ صرف حکومت سے کریں بلکہ خود بھی اس کام میں جت جائیں۔ تیسرے یہ، شام کے اوقات میں اسکولوں کے بچوں کی دینی تعلیم وتربیت کا اہتمام اپنے مدارس میں کریں۔

عملاً یہ ممکن نہیں:

(3) علمائے کرام دینی مدارس کو مسلک پر نہ چلائیں بلکہ اسلام کی بنیاد پر چلائیں۔ دیکھیے! اس وقت اگر ایک پبلک یا پرائیویٹ سیکٹر یونیورسٹی میں دیوبندی، بریلوی، اہلحدیث وغیرہ سب مل کر کام کرتے ہیں اور اس سے کوئی اُلجھن اور مسئلہ پیدا نہیں ہوتا تو دینی مدارس میں اس اصول کو لاگو کرنے سے کوئی مسئلہ کیوں کر پیدا ہوگا؟ آخر اس میں کیا حرج اور قباحت ہے اور اس سے کون سی قیامت ٹوٹ پڑے گی اگر ایک دینی مدرسے میں قرآن پڑھانے والا استاد بریلوی ہو، حدیث پڑھانے والا دیوبندی ہو اور عربی پڑھانے والا اہل حدیث ہو؟ اسی طرح طلبہ بھی مختلف مسالک سے ہوں۔ فروعی مسائل میں استاذ یہ رویہ اختیار کرسکتا ہے کہ اپنا مسلک بھی بتادے اور دوسرے مسالک کا بھی ذکر کردے۔ یہ سب بالکل ممکن اور قابلِ عمل ہے۔ صرف ذہنوں کے قفل کھولنے کی ضرورت ہے۔

(4) جس طرح ابتدائی صدیوں میں یونانی فکروتہذیب کا مقابلہ کرنے کے لیے علماء نے اپنے مدارس میں منطق وفلسفہ اور کلام پڑھانا شروع کرلیا تھا اسی طرح آج کا چیلنج مغربی فکر وتہذیب ہے۔ لہٰذا یہ ضروری بلکہ بالکل ناگزیر ہے کہ جدید مغربی فکروتہذیب کا مطالعہ اور اس کا رد دینی مدارس میں لازماً پڑھایا جائے۔ علمائے کرام نے اس چیلنج کا ادراک اور توڑ نہیں کیا۔ یہی وجہ

ہے پاکستانی معاشرہ آج مغربی تہذیب کے سیلاب کفر میں بہتا چلا جارہا ہے۔ لہٰذا علمائے کرام اپنے دینی مدارس میں فوراً اس کا اہتمام کریں ورنہ مغربی تہذیب کے غلبے کے خلاف بند نہیں باندھا جاسکے گا۔ مغربی تہذیب کا "کمال" یہ ہے یہ آپ کو عیسائی نہیں بناتی لیکن آپ کے فکروعمل کو غیر اسلامی بنادیتی ہے۔ لہٰذا خواہ مذہبی تعلیم ہو یا عمومی، جدید تعلیم مغربی فکروتہذیب کو رو کے بغیر آج اسلام کی بات کرنا بے معنی اور لا حاصل ہے۔"

ڈاکٹر محمد امین صاحب کی بیشتر باتیں ایسی ہیں جن پر عمل ہورہا ہے اور یہ بعض تجاویز ایسی ہیں جن پر حکومت اور عصری تعلیمی اداروں کو توجہ دینی چاہیے۔ مدارس کا ان کے ساتھ کوئی تعلق نہیں بنتا اور نہ ہی وہ خامیاں ہیں۔ مدارس اپنی وسعت اور حیثیت سے بڑھ کر خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

دینی مدارس کا نصب العین:

دینی مدارس کا نصب العین تو یہ تھا اور ہے کہ وہ قرآن، حدیث، فقہ اور تاریخِ اسلام کے ماہر اور ایکسپرٹ افراد تیار کریں۔ یہ ذمہ داریاں دینی مدارس بحسن وخوبی نبھائے ہوئے ہیں۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ دینی مدارس سے ڈاکٹرز، انجینئرز، وکیل، ماہرِ معاشیات، کمپیوٹر انجینئر، حساب داں اور سائنس داں پیدا نہ کرنے کا گلہ کیا جائے؟ کیا دینی مدارس اس کام کے ذمہ دار ٹھہرائے جاسکتے ہیں اور ان سے یہ شکوہ کیا جاسکتا ہے؟

جواب نفی میں ہونے کے باوجود پاکستان کے کئی مدارس میں آئی ٹی ڈپارٹمنٹ، انگلش لینگویج لیب، سائنس لیبارٹری، جدید فلکیات، بینکنگ کے نئے طریقہ کار سمجھنے کے شعبے، شعبہ صحافت، ٹیچرز ٹریننگ کورس، تدریب المعلمین، کلیۃ التخصص، کلیۃ الشریعۃ کی طرز کے کئی شعبے قائم ہوچکے ہیں۔ حتیٰ کہ بعض مدارس میں تو ایم بی اے تک کی سطح کی تعلیم بھی دی جارہی ہے۔

یہ کتنی خوش آئند بات ہے اب کچھ مدارس میں دینی علوم کے ساتھ ساتھ صحافت، ایم بی اے، انفارمیشن ٹیکنالوجی اور انگریزی کی بھی تعلیم دی جارہی ہے۔ شاید ہی کوئی ایسا مدرسہ ہو جہاں ٹیکنیکل ایجوکیشن بھی دی جارہی ہو، لہٰذا اس طرف بھی دھیان دینا چاہیے۔ ذرا سوچیے کتنا اچھا لگے گا ہمارا عالم دین علم دین کے ساتھ ساتھ ماہر معاشیات بھی ہو۔ حافظ وقاری کے ساتھ ساتھ ماہر نفسیات بھی

ہو۔ ہمارے خطیب اپنے جمعہ کے خطابات اور وعظوں میں وضو و نماز کے فرائض و فضائل کے ساتھ ان کے طبی و روحانی فوائد بھی بیان کر رہے ہوں۔ جس سے عبادات میں شوق پیدا ہو۔

یہ حقیقت ہے علمائے کرام اپنی سی کوشش سے اپنا کام بخوبی کیے جا رہے ہیں۔ آج پاکستان میں جو اسلامی اقدار کی رمق موجود ہے وہ ان کی محنت کا ثمر ہے مگر کیا ہمارے عصری تعلیمی ادارے اپنا کام پورا کر رہے ہیں؟ اگر دینی مدارس کسی مجدد الف ثانی، کسی انور شاہ کشمیری، کسی شبیر احمد عثمانی کو آج پیدا نہیں کر سکے تو آج کا عصری تعلیمی نظام بھی کسی علامہ اقبال اور کسی دوسرے ڈاکٹر عبدالقدیر کو پیدا نہیں کر سکا۔ اب ہم نے ان کی اسناد کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے اس سے ان کی قومی دھارے میں شمولیت کی اُمید دم توڑ گئی ہے۔ ہم مجموعی انحطاط کا شکار ہیں۔ مان لیا دینی مدارس کا قومی دھارے میں کردار نہ ہونے کے برابر رہ گیا ہے۔ یہ کس نے کیا؟ دینی مدارس میں ایک نجی تعلیمی سسٹم ہے جس پر حکومت نے کبھی توجہ ہی نہیں دی۔ دینی مدارس کے نام پر فنڈ سرکاری افسر ہی کھاتے رہے۔ ایسے میں ہم انہیں کنارے لگا کر ان سے قومی دھارے میں شمولیت کی اُمید کیسے کر سکتے ہیں؟

اعترافِ حقیقت:

یہ بات درست ہے آج کل دینی مدارس میں بھی علوم و فنون کے شعبے بڑھتے جا رہے ہیں لیکن سیرت و اخلاق میں روز افزوں انحطاط دیکھنے میں آ رہا ہے۔ مستقبل میں ہم نے جن چیلنجوں کا سامنا کرنا ہے ان کے لیے رجوع الی اللہ، بے داغ سیرت، اعلیٰ اخلاق، بلند ہمت، استغنا اور خودداری کی ضرورت ہے۔ اگرچہ اس کا سامان اس عام مذہبی و اخلاقی تنزل کے زمانے میں جتنا عربی مدارس میں ہے اتنا کہیں اور نہیں۔ ایک اور مسئلہ جس کی طرف دینی مدارس کو توجہ دینی چاہیے وہ جدید علوم اور زبانوں کی تعلیم ہے۔ اس وقت پوری دنیا ایک گاؤں کی مانند ہو چکی ہے۔ جدید ذرائع ابلاغ کی بدولت ایک فرد کا پیغام پوری دنیا تک پہنچ سکتا ہے اس لیے ہمیں ایسے افراد تیار کرنے چاہییں جو دنیا کی مختلف زندہ زبانوں میں اسلام کی تبلیغ کا فریضہ انجام دے سکیں لیکن اس میں شرط یہ ہے یہ سب تمام تر دین کی خدمت و حفاظت اور مذہب کے فروغ کے لیے ہو۔ اس

صورت میں یہ جہاد ہوگا اور یہ تیاری ''واعدوا لھم ما استطعتم من قوۃ'' میں داخل ہوگی۔ دینی مدارس کی روح اخلاص، تقویٰ، صداقت اور للّٰہیت ہے۔ اگر یہ برقرار ہے تو دنیا کی کوئی زبان بھی سیکھی جاسکتی ہے۔ اگر خدانخواستہ یہ روح باقی نہ رہی تو خود عربی بھی بے دینی اور گمراہی کا ذریعہ بن سکتی ہے۔

پاکستان کے دینی مدارس کی تاریخ میں ''جامعۃ الرشید'' کراچی کو یہ اعزاز حاصل ہے اس نے سب سے پہلے اپنے ہاں صحافت کورس متعارف کروایا۔ صحافت کی اثر پذیری اور اس میدان پہ مفاد پرستوں کے قبضے کے باعث صحافت کورس شروع کرنا ناگزیر ہوگیا تھا۔ مغربی میڈیا سراسر ناانصافی اور تعصب پر اتر آیا تھا۔ اس کی میں آپ کو دو چار مثالیں دیتا ہوں۔ جون 2009ء میں ایران میں صدارتی انتخابات کی گہما گہمی عروج پر تھی۔ احمدی نژاد اور حسین موسوی کے درمیان حریفانہ کشاکش نے پورے ایران میں ہلچل مچادی تھی۔ احمدی نژاد کے خلاف احتجاجی جلوسوں کا سلسلہ چل نکلا اور پھر جون کی ایک تپتی دوپہر میں ندا آقا سلطان نامی خاتون بھی احتجاجی ریلی کا حصہ بن جاتی ہے۔ اسے شاید اندازہ نہیں تھا آج کی شام جب ڈھلے گی تو اس کے بہتے خون پر امریکی و برطانوی استعماری سازشوں کی کشتی تیرنا شروع ہوجائے گی۔

ریلی کشاں کشاں آگے بڑھی اور صدارتی محل کی طرف مڑ گئی۔ جس لمحے ''ندا'' صدارتی محل کی طرف مڑی، اسی وقت ایک بے سمت گولی آئی اور خون میں لت پت ندا چکرا کے گر پڑی۔ یہاں سے ایک اور کہانی کا آغاز ہوتا ہے۔ عالمی میڈیا ایران کے احتجاجی جلوسوں کی کوریج کررہا تھا۔ ٹی وی چینلوں نے یہ ویڈیو بنائی اور آن کی آن میں ساری دنیا ایران کو دہشت کا جہاں، ظلم کی سرزمین اور سربریت کا دیس قرار دینے لگی۔

مغرب کا دوغلا پن:

مغربی میڈیا کی کڑی میں ایسا ابال آیا کہ ایران کی اعلیٰ قیادت کو بار بار صفائی پیش کرنا پڑی۔ اس واقعے کے صرف ایک ماہ بعد ہی جرمنی میں امریکی و مغربی میڈیا کی غیر جانبداری کی ہنڈیا بیچ چوراہے پھوٹ پڑی۔ مروہ الشربینی کو بر سر عدالت خنجر کے 18 وار کرکے شہید کردیا گیا۔ مروا کو

مسلمان ہونے اور حجاب پہننے کی سزادی گئی۔ قاتل کا نام پتا دنیا بھر کے میڈیا کے علم میں آیا، لیکن ایرانی سربریت کا ڈھنڈورا پیٹنے والا سی این این، بی بی سی اور فاکس نیوز مہر بہ لب، خاموش تماشائی بنے رہے۔ ندا آقا سلطان کے مرنے سے لے کر تدفین تک لحمہ بہ لحمہ سنسنی پھیلاتا مغربی میڈیا، مروہ کی شہادت کے بعد ایسا چپ سادھ کر بیٹھ گیا دنیا کو پتا ہی نہیں چل سکا کہ مروہ کا جنازہ مصر میں ادا کیا گیا۔

2000ء میں ستمبر کا مہینہ تھا۔ ایک خنک رات میں اسرائیلی جنگی جہازوں نے اڑانیں بھریں اور نہتے فلسطینیوں کے سروں پر قیامت ٹوٹنے لگی۔ صبح ہوتے ہوتے 3 ہزار فلسطینی خاک وخون میں لت پت ہو چکے تھے۔ اگلے دن بھرے فلسطینیوں اور اسرائیلوں کے درمیان جھڑپیں شروع ہوگئیں۔ اب کی بار 808 فلسطینی جاں سے گزر گئے اور ارض مقدس 107 اسرائیلیوں کے وجود سے پاک ہوگئی، لیکن انتہائی حیرت کی بات یہ ہے اگلے دن نیویارک ٹائمز نے 107 اسرائیلیوں کی ہلاکت کو شہ سرخی بنایا۔

800 سو سے زائد فلسطینیوں کا خبر میں ذکر تک نہیں تھا۔ صرف یہی نہیں ''نیویارک ٹائمز'' میں اس واقعے کا ذکر ڈیڑھ سو مرتبہ مختلف دنوں میں آیا لیکن کسی جگہ بھی فلسطینیوں کی ہلاکت کا ذکر تک نہیں کیا گیا۔ یہ خبر پڑھ کر مجھے بل کلنٹن کے دور اقتدار کا آخری زمانہ یاد آگیا۔ انہوں نے فلسطین اور اسرائیل تنازع کو حل کرنے کی کوشش شروع کی تو ان کے ساتھ ایک یہودی عورت کا اسکینڈل سامنے لا کے میڈیا پر اس کی اتنی تشہیر کی گئی کہ صدر امریکا کو بھی دفاعی راستہ اختیار کرنے پر مجبور ہونا پڑا اور اصل معاملہ پھر کھٹائی میں پڑ گیا۔

میڈیا یہودیوں کے شکنجے میں:

''جنرل میڈ ڈومری'' نے جرمن کی بے لگام طاقت کو لگام ڈالنے کے لیے جو چال چلی تھی، اس میں میڈیا نے ہی اہم کردار ادا کیا۔ برصغیر میں مولوی محمد باقر کے ''دہلی اُردو اخبار'' اور منشی کشور کے ''اودھ'' سے لے کر ابوالکلام آزاد کے ''الہلال'' اور ظفر علی خان کے ''زمیندار'' تک نے سامراج کے ایوانوں میں جو زلزلہ برپا کیا وہ کسی سے مخفی اور پوشیدہ نہیں۔ بدقسمتی سے آج میڈیا کی

ڈور یہودیوں اور عیسائیوں کے ہاتھوں میں ہے اور وہ مسلمانوں کے خلاف اس کا بھرپور استعمال کر رہے ہیں۔

اس کا اندازہ آپ اس سے لگائیں دنیا بھر کے ٹی وی، ریڈیو، انٹرنیٹ اور اخبارات وجرائد تک تقریباً بیشتر پر اہل مغرب پوری طرح قابض ہیں۔ دنیا کے سب سے بڑے دو میگزین ٹائمز اور نیوز ویک وہاں سے نکلتے ہیں۔ خبر رساں ایجنسیوں پر یہودیوں کی اجارہ داری ہے۔ دنیا کی سب سے بڑی اور مشہور خبر رساں ایجنسیاں، جن کی دی ہوئی خبروں پر ہمارے صبح وشام کے اخبارات چلتے ہیں۔

''اے ایف پی'' اور ''رائٹر'' وغیرہ غیر مسلموں کی ہیں۔ اے ایف پی فرانس کی اور رائٹر برطانیہ کی ہے، جس کا مالک یہودی ہے۔ سی این این اور فوکس نیوز سب سے مشہور ٹی وی چینل ہیں، جن کا تعلق امریکا اور برطانیہ سے ہے۔ یہ چینلز دن رات اپنی نشریات میں نظریہ پاکستان اور دفاع پاکستان کے خلاف ڈھنڈورا پیٹتے رہتے ہیں۔ ویب سائٹس کو دیکھیں تو گوگل، فیس بک اور کیو ریصف اول پر نظر آتی ہیں۔ کیو ریکا شمار دنیا کی سوطاقت ور ترین چیزوں میں ہوتا ہے۔ اس پر شائع ہونے والی ایک تصویر دنیا کا نقشہ بدل کر رکھ دیتی ہے۔

اخباری صنعت میں دنیا کے تین بڑے اخبار جاپان سے شائع ہوتے ہیں۔ دوسری طرف مسلم دنیا کی موجودہ حالت پر نظر دوڑائیں تو اس حوالے سے یہاں کوئی قابل ذکر پیش رفت نظر نہیں آتی۔ ہمارا کوئی عالمی چینل، کوئی عالمی میگزین، کوئی عالمی اخبار اور نیوز ایجنسی موجود نہیں۔ یہی وجہ ہے دجالی مشنریاں میڈیائی پروپیگنڈے کے ذریعے اپنے مذموم عزائم کی تکمیل میں مصروف عمل ہیں۔ آپ میڈیا کی طاقت اور اس کے دوغلے کردار کا اندازہ اس سے لگائیں ایک جعلی اور نام نہاد ویڈیو جس میں طالبان کو صنف نازک پر کوڑے برساتے دکھایا جاتا ہے۔ پاکستانی ذرائع ابلاغ سمیت عالمی میڈیا آناً فاناً آسمان سر پر اُٹھا کر وہ واویلا مچاتا ہے کہ الامان والحفیظ۔ دوسری طرف جرمنی کی بھری عدالت میں مسلمان عورت پر قاتلانہ حملہ کر کے اسے شہید کر دیا جاتا ہے تو اسے عالمی میڈیا نمایاں کوریج نہیں دیتا۔ بوسنیا و کوسوو کے مسلمانوں کی چیخوں کا میڈیا کوئی نوٹس نہیں لیتا۔

ہماری ذمہ داریاں:

شیشان وبرما کے معصوم بچوں کا ذکر تک کرنا میڈیا گوارا نہیں کرتا۔ صومالیہ وفلسطین کی ماؤں اور بہنوں کی عزت کا احساس کسی کو نہیں ہے۔ کشمیر اور افغانستان کے مسلمانوں کے ساتھ ہونے والے بھیانک مظالم سے ہم واقف تک نہیں۔ مختاراں مائی کا مسئلہ ہو تو اسے سر پر بٹھایا جاتا ہے، جبکہ ان کی اپنی گود میں روزانہ ایسے سیکڑوں واقعات رونما ہوتے ہیں تو خاموشی چھائی رہتی ہے۔ اس وقت کسی کو حقوقِ نسواں یاد نہیں رہتے۔ ڈینیل پرل کیس پر دنیا بھر کا میڈیا چیخ اُٹھتا ہے مگر عراق میں لاکھوں مسلمانوں کی شہادت پر کوئی آواز تک اُٹھانے کی زحمت گوارا نہیں کرتا۔ غیروں سے کیا گلہ! ہمارے اپنے ملک میں علمائے کرام کی پریس کانفرنسوں کو ہائی جیک کرنے کے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ اس وقت مسلمانوں کے 75 فیصد وسائل پر غیر مسلم قابض ہیں، لیکن مسلمانوں کو ان حقائق کے متعلق کوئی بتانے والا تو ہو۔

اسی طرح جب امریکا نے عراق پر حملہ کیا تو ابتدائی دنوں میں عراق میں ہونے والی تباہی کے کچھ مناظر ''الجزیرہ'' نے دکھانا شروع کیے۔ امریکا سے الجزیرہ کی یہ جرات برداشت نہ ہو سکی اور اس ''جرم'' کی پاداش میں الجزیرہ کے دفاتر اور عراق میں ان کے ٹی وی تنصیبات پر بمباری کر کے انہیں تباہ کر کے رکھ دیا۔ آج بھی غزہ کے تڑپتے، بلکتے اور مظلوم مسلمانوں کے حق میں ایک الجزیرہ 58 اسلامی ممالک سے زائد کام کر رہا ہے۔

وہ یہودی جن کو ہمارے آقا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارا ازلی دشمن قرار دیا، آج ریڈیو کی 99 فیصد صنعتیں اور برقی لہریں اسی لابی کے زیر کنٹرول ہیں۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے یہودیوں نے پوری دنیا کے میڈیا کو یرغمال بنا رکھا ہے اور وہ اسی میڈیا کو مسلمانوں کے خلاف استعمال کر رہے ہیں۔ مغربی میڈیا کی جانبداری دیکھیے اور اس کے مقابل مسلمانوں کی حکمت عملی کا جائزہ لیجیے۔ آج دنیا میں 20 ہزار سے زائد عالمی سطح کے ٹی وی چینلز ہیں۔ یہ سب کے سب صبح و شام مسلمانوں کے خلاف زہر اگلنے میں مصروف ہیں۔ ان کے مقابلے میں صرف اور صرف الجزیرہ ہے۔

واشنگٹن پوسٹ، نیویارک ٹائمز اور ٹائم میگزین دنیا کے سب سے بااثر اخبار و میگزین قرار دیے

جاتے ہیں۔ ان تینوں کے مالک یہودی ہیں۔ ان کے مقابلے میں بین الاقوامی سطح کا کوئی ایک اسلامی میگزین یا اخبار نہیں پیش کیا جاسکتا۔ عالمی سازشوں کا ذکر چھوڑیے آپ آج اور دس سال پہلے کے پاکستان کو تصور میں لائیے۔ پھر اپنے دل سے پوچھیے کیا اخلاقی انحطاط اور معاشرتی پستی کی انتہا نہیں ہوگئی؟ رسائل وجرائد نے نوجوان نسل کو اسلامی تہذیب سے تو برگشتہ کیا ہی تھا، اب خاندانی روایات بھی آخری سانسوں پر ہیں۔ اسلام و مسلمان کو پاکستان میں ہی بے خانماں کردیا گیا۔

کیا ان حالات میں مسلمانوں کی کوئی ذمہ داری نہیں بنتی؟ کیا اس پوری قوم کو مفاد پرست دہریے کالم نگاروں کے رحم و کرم پہ چھوڑ دیا جائے گا؟ کیا کسی دین کا درد رکھنے والے کی ذمہ داری نہیں کہ آگے بڑھے، صحافت کے میدان میں آئے اور اسلام مخالف پروپیگنڈے کا جواب اپنے قلم و زبان سے دے؟ جامعۃ الرشید میں صحافت کورس شروع کرنے کا بنیادی سبب علماء کو صحافت کے میدان میں اترنے کے لیے تیار کرنا تھا۔

فکری اور نظریاتی کام:

''ضرب مومن'' اور ''روزنامہ اسلام'' کے اجرا کے بعد پاکستانی صحافت میں ایک نئے دور کا آغاز ہو چکا تھا۔ بے شمار لوگ جو اخبارات سے وابستہ تھے یا جن کے دل میں صحافت کے پیشے سے منسلک ہونے کی کسک جنم لے رہی تھی۔ ان کے بار بار رابطوں نے کورس شرع کرنے پر مجبور کردیا۔ اب تک کورس کی کامیابی اور اس کے ہمہ جہت فوائد نے ثابت کردیا کورس کا جامعۃ الرشید جیسے نمایاں دینی مدرسے میں آغاز ایک انقلابی اقدام تھا۔ یہ کورس نوجوان فضلاء کو مضمون نگاری اور قلم کے ذریعے اظہار مافی الضمیر کی تربیت دینے کے لیے شروع کیا گیا تاکہ علماء دعوت دین کے میدان میں تحریر کے فن کو مؤثر طور پر استعمال کرسکیں اور قلم کے استعمال کے معیاری رویوں کی تربیت پا کر دینی علوم کی ترجمانی بہتر سے بہتر انداز میں کرنے کے قابل ہو جائیں۔

کورس کے بنیادی مقاصد میں علماء کو صحافت سے روشناس کرانا اور فکری و نظریاتی کارکن تیار کرکے ملک بھر کے مختلف اخبارات وجرائد میں بھجوانا ہے۔ اسی طرح علماء کو دین کے دفاع و تبلیغ کے لیے تقریری کے ساتھ ساتھ تحریری میدان میں بھی ماہر بنانا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ علماء کو مالی

طور پر مستحکم کرنے کی بھی کوشش ہے تاکہ مدارس ومساجد میں درس وتدریس کے ساتھ ساتھ مالی مشکلات سے بھی بخوبی نمٹ سکیں۔

اس سلسلے میں ابتدا میں سب سے بڑا مسئلہ افرادی قوت کا تھا۔ چونکہ یہ کام فکری اور نظریاتی نوعیت کا تھا اس کے لیے درکار صلاحیتوں والے اور خصوصاً علماء کو پڑھانے والے اساتذہ کی تلاش جوئے شیر لانے کے مترادف تھی لیکن رفتہ رفتہ لوگ ملتے گئے اور کارواں بنتا گیا۔ شوال میں 15 فضلا کا انتخاب کیا جاتا ہے جو دینی علوم میں اچھی استعداد، زبان وبیان میں مؤثر صلاحیت، کتب بینی ومضمون فہمی کے شوق، ادبی ذوق کے مالک اور مسلم امہ کی خدمت کے جذبے سے سرشار ہوں۔ ان کے انتخاب کے لیے پہلے معلوماتِ عامہ، عصر جدید کے مسائل کا ادراک اور مضمون نویسی کی صلاحیت کا امتحان ہوتا ہے۔ پھر پینل انٹرویو کے ذریعے ذہنی صلاحیت اور فطری رجحانات ومیلانات کی جانچ ہوتی ہے۔

جائزوں اور امتحانات کی تکمیل کے بعد کامیاب امیدوار ''یک سالہ کورس'' میں شریک ہوجاتے ہیں جس کا آغاز اردو املا وقواعد، تحریر کے آداب کی تربیت اور معیاری اردو ادب کے مطالعے سے ہوتا ہے۔ ساتھ ہی ایک مکمل اور جامع انگلش لینگویج کورس شروع ہوجاتا ہے جس میں گرامر اور کنورسیشن کے علاوہ ٹرانسلیشن کی مشق پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔ آج کی صحافت میں انگلش سے اردو صحافتی زبان میں ترجمہ کی صلاحیت ناگزیر ہوگئی ہے۔

تربیت کا نقطۂ عروج:

مختلف کمپیوٹر کورس ایم ایس آفس، ان پیج، کورل ڈرا، فوٹو شاپ، کوارک ایکسپریس اور فری ہینڈ بھی سال کے آغاز سے شروع ہوجاتے ہیں۔ اس کورس کے مرکزی دو پیریڈ ملک کے مشہور صحافی اور استاذ لیتے ہیں۔ ایک پیریڈ میں خبر نویسی اور دوسرے میں اداریہ نگاری کے اصول اور متعلقہ ضمنی مباحث کے علاوہ ان کی باقاعدہ عملی مشق مسلسل ہوتی ہے۔ اس کے لیے طلبہ کو مختلف تقاریب کی رپورٹنگ کے لیے بھیجا جاتا ہے۔ ان طلبہ کو اسلامی صحافت کی عملی مشق کے لیے کچھ مدت کے بعد ہفت روزوں اور روزناموں میں مختلف پرچوں کی تیاری کے مختلف مراحل میں شریک کیا جاتا ہے۔

یہ طلبہ کورس کے ساتھ ساتھ عملی تجربہ حاصل کرتے ہیں جو آگے چل کر ان کو پختہ کار اور آزمودہ صحافی بننے کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ صحافت کورس کے ساتھ ساتھ مختلف صحافتی شعبوں رپورٹنگ، ایڈیٹنگ، فیچر رائٹنگ کی عملی تربیت کا اہتمام صحافت کورس کی وہ خصوصیت ہے جسے بلا جھجک ممتاز اور منفرد کہا جاسکتا ہے۔

اس تربیت کا نقطۂ عروج وہ مرحلہ ہوتا ہے جب اس کورس کے شرکا ایک ایسا ماہانہ رسالہ شائع کرتے ہیں جس کی کمپوزنگ، ڈیزائننگ، ایڈیٹنگ، پیسٹنگ وغیرہ سب خود ہی کرنا ہوتی ہے۔ ہر اتوار کے روز صحافت سے وابستہ اہم شخصیات کو جامعہ آنے کی دعوت دی جاتی ہے اور ان کے لیکچر کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اس سے طلبہ کی معلومات اور ذوق وشوق میں اضافہ ہوتا ہے۔ عصرِ حاضر میں مسلم امہ کو درپیش مسائل کا ادراک نمو پاتا ہے۔

مطالعاتی اور تفریحی دوروں کا انعقاد ہوتا رہتا ہے اور فراغت کے بعد اپنی صلاحت واہمیت ثابت کرنے والے طلبہ کو اسلامی صحافت میں اپنا کردار ادا کرنے اور مستقبل بنانے کا بھرپور موقع فراہم کیا جاتا ہے۔ انہیں معاشرے میں بہترین مقام ومنصب کا حامل ہوتے ہوئے دین کی خدمت کے قابل بنایا جاتا ہے۔

تحریر کیسے سیکھیں:

طلبہ کو فوٹو گرافی کی تربیت بھی دی جاتی ہے تاکہ جاندار کی تصاویر کے بغیر بامعنی تصویری صحافت کو آگے بڑھا سکیں۔ صحافت کورس کے شرکا یہ کورس مکمل کر لینے کے بعد دوسرا سال پاکستان میں قائم روزنامہ اسلام کے پانچ اشاعتی مراکز میں سے کسی ایک میں مختلف اصناف صحافت کی عملی مشق میں گزارتے ہیں۔ یہ سال اختیاری ہوتا ہے۔ اس تربیت سے گزرنے والا ایک منجھے ہوئے اور دیانتدار صحافی کے طور پر اس شعبے میں خدمات دینے کے قابل ہو جاتا ہے۔

مذکورہ بالا بات کو یوں بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ کورس کے دو حصے ہیں: نظری صحافت اور عملی صحافت۔ نظری صحافت شوال سے شعبان تک کے دورانیے پر مشتمل ہے۔ اس میں 10 چیزیں شامل نصاب ہیں:

(1) ”تحریر کیسے سیکھیں؟“ اس کتاب کو صحافت کا انسائیکلوپیڈیا کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اسے تین اساتذہ کرام پوری تفصیل اور تجربات کی روشنی میں پڑھاتے ہیں۔

(2) رپورٹنگ، سبنگ، ایڈیٹنگ: خبر کی ہر پہلو سے عمدہ مشق کے لیے سال بھر میں دو گھنٹے مختص کیے گئے ہیں۔

(3) عربی وانگریزی ترجمہ: یہ حقیقت ہے دنیا بھر کی معلومات عربی وانگریزی دو زبانوں میں منتقل ہو چکی ہیں۔ عربی میڈیا، انگریزی میڈیا اور انٹرنیٹ سے کماحقہ استفادے کے لیے ان دو بڑی زبانوں کے ترجمے کی مشق ماہرانہ بنیادوں پر کرائی جاتی ہے۔ اس مقصد کے لیے العربیة بین یدیک۔ حصہ دوم میں عربی ہفت روزے، ماہنامے اور روزنامے نصاب کا حصہ ہیں، جبکہ انگریزی ترجمے کے لیے ایک گھنٹہ مختص ہے۔

(4) انگلش گرامر: پوری تفصیل اور مشق کے ساتھ مکمل گرامر ازبر کروائی جاتی ہے۔ یہ گرامر جہاں ٹرانسلیشن میں معاون ثابت ہوتی ہے، وہیں طالب علم کورس کے اختتام تک انگلش بولنے اور لکھنے کے بھی قابل ہو جاتا ہے۔

(5) موضوعاتی اسباق: درج ذیل چار موضوعات کی اہمیت کے پیش نظر محض مطالعے کی ترغیب دینے کے بجائے انہیں درساً پڑھایا جاتا ہے۔ (i) عالمی میڈیا: تمام ممالک کے الیکٹرونک وپرنٹ میڈیا کے احوال پر مفصل بحث۔ (ii) بین الاقوامی تعلقات: عالمی سیاست کی گتھیاں سلجھانے کے لیے IR (انٹرنیشنل ریلیشن) کو خصوصی طور پر موضوع سخن بنایا جاتا ہے۔ (iii) ”الغزو الفکری“: دورِ حاضر میں عالم اسلام پر سامراج کی نظریاتی یلغار کو سمجھنے کے لیے اس کتاب کی روشنی میں صلیبی جنگوں پر سیر حاصل بحث، مکمل احوال اور مفصل اعداد و شمار کی روشنی میں۔ (iv) تاریخ پاکستان (ماضی، حال اور مستقبل) اور پاکستانی سیاست۔

(6) مضمون نویسی کی عملی مشق: ہر طالب علم پر پندرہ دن میں ایک مضمون لکھنا لازمی ہے۔ کورس کے نو آموزوں کے مضامین روزنامہ اسلام اور ہفت روزہ ضرب مؤمن میں ترجیحی بنیادوں پر شائع کیے جاتے ہیں۔ کچھ ہی عرصے میں طلبہ اپنے مضامین ملک کے دیگر اخبارات کو ارسال کرنا

شروع کر دیتے ہیں، جہاں صرف قابلیت کا سکہ چلتا ہے۔ بعض طلبہ اپنی اس کاوش میں عموماً کامیاب ہو جاتے ہیں۔

(7) مباحثہ پروگرام (Debate): یہ ہفتے میں صرف ایک دن ہوتا ہے۔ پوری جماعت کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ایک موضوع دے دیا جاتا ہے۔ ایک فریق نے اس ایشو کے حق میں، جبکہ دوسرے نے اس کی مخالفت میں گفتگو کرنی ہوتی ہے۔ استاذ محترم کی موجودگی میں فریقین اپنے اپنے نقطۂ نظر کو مدلل انداز میں ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بعد ازاں ہر ایک کی کوتاہیوں کی اصلاح کر کے جیتنے والے فریق کی نشاندہی بھی کی جاتی ہے۔ اس سے لسانی صلاحیتیں اجاگر اور انٹرویو کا ملکہ حاصل ہو جاتا ہے۔ Table Talk کی پریکٹس بھی ہو جاتی ہے۔

(8) کمپیوٹر کورسز: فن صحافت کے لیے معاون پروگرام ان پیج، کورل ڈرا، ایم ایس ورڈ اور انٹرنیٹ میں مہارت کے لیے ایک پیریڈ خاص ہے۔

(9) جداریہ: رسالے کی ادارت کی مشق کے لیے پندرہ روزہ ایک ''جداریہ'' تیار کروایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ طلبہ ہفت روزہ ضرب مؤمن اور روزنامہ اسلام کے منتظمین کی معاونت کر کے بھی اپنی تربیت مکمل کرتے ہیں۔

(10) ماہرین فن کی آمد: ملک کے معروف صحافی، نامور سیاسی و سماجی شخصیات کو وقتاً فوقتاً دعوت دے کر طلبہ صحافت کو ان کے تجربات سے مستفید کیا جاتا ہے۔ 10 ماہ تک ان تمام مدارج سے گزرنے کے بعد عملی صحافت کا مرحلہ آتا ہے۔

تو پھر یہ سب کچھ کیا ہے؟

عملی صحافت: اس مقصد کے لیے طلبہ 40 دن روزنامہ اسلام کے دفتر میں گزارتے ہیں، جہاں انہیں اخبار کی تیاری کے تمام مراحل سے عملی طور پر گزارا جاتا ہے۔ یوں ان کی صحافت ''تھیوری'' اور ''پریکٹس'' دونوں کے ساتھ پایۂ تکمیل کو پہنچتی ہے۔ کورس کے خدوخال پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالنے سے ہی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ صحافت کے جملہ پہلوؤں کا کس قدر دقت نظر سے احاطہ کیا گیا ہے۔ بلاشبہ کالج اور یونیورسٹیوں میں پڑھائے جانے والے فن صحافت سے یہ

بدرجہا بہتر ہے۔ کئی سال کا کام کو یک سالہ کارکردگی میں سمودیا گیا ہے۔ یہ کورس بڑی تیزی کے ساتھ کامیابی کی طرف بڑھ رہا ہے۔

اب تک جامعۃ الرشید کے صحافت کورس کے فضلا ملک بھر کے متعدد روزناموں ہفت روزوں اور ماہنامہ رسالوں سے منسلک ہو چکے ہیں۔ بہت سے فضلاء نے مدارس میں صحافت کی تدریس وتعلیم شروع کردی ہے۔ کئی طلبہ نے تعلیمی وتبلیغی اداروں کے ترجمان رسائل وجرائد کی ذمہ داریاں سنبھالی ہوئی ہیں۔

یہ اسلامی صحافت ایسا شعبہ ہے جسے علماء میں مروجہ علمی ودعوتی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ نہ صرف اختیار کیا جاسکتا ہے بلکہ ان مروجہ خدمات امامت، خطابت، تدریس، تصنیف وتالیف کو مزید بہتر اور منظم انداز میں انجام دیا جاسکتا ہے۔ اس کورس کے شرکا کو پرکشش سہولیات کے ساتھ بہترین مستقبل کی ضمانت فراہم کی جاتی ہے۔ اس کورس کے شرکا تکمیل کے بعد جب کراچی، اسلام آباد، لاہور یا ملتان میں سے کسی اسٹیشن میں شام کے وقت خدمات انجام دیتے ہیں تو انہیں یہ خصوصی رعایت حاصل ہوتی ہے وہ شام سات سے رات بارہ بجے تک محض پانچ گھنٹے کام کریں۔ دن کے اوقات میں وہ تدریس، تالیف، امامت وخطابت وغیرہ جو چاہے شغل اپنا سکتے ہیں۔ ذہین اور باصلاحیت فضلا کو ادھر متوجہ ہونا چاہیے تاکہ مغرب اور مغرب زدہ میڈیا کا مقابلہ نہیں تو کم از کم ان کے زہریلے پروپیگنڈے کا موثر جواب ہی دیا جاسکے۔ وفاق المدارس کو اس میں کردار ادا کرنا چاہیے۔

اسپیشلائزیشن کا دور:

دینی مدارس کو اب اس بات کی طرف بھی توجہ دینی چاہیے کہ موجودہ دور تخصص اور اسپیشلائزیشن کا دور ہے۔ محنت کی کمی اور ہمتوں کی پستی کی وجہ سے جامعیت کا فقدان ہے۔ اب پہلے زمانے کی طرح جامع ہستیاں نظر نہیں آتیں، اس لیے دینی علوم وفنون کی بقا اور ترقی کے لیے ضروری ہے تفسیر، حدیث، فقہ، نحو، ادب، منطق اور فلسفہ کے متخصصین تیار کیے جائیں۔

یہ خوش آیند بات ہے وفاق المدارس کے ایک اعلامیے کے مطابق انہوں نے مختلف علوم میں

پی ایچ ڈی کروانے کا فیصلہ کیا ہے۔ دینی مدارس میں مختلف علوم میں پی ایچ ڈی کا نصاب مرتب کرنے کا ٹاسک ملک کے جید علمائے کرام کے پینل کو دیا گیا ہے۔ اسی طرح ''القرآن کورسز نیٹ ورک'' کے یک سالہ کورس کا نصاب بھی وفاق المدارس کی سطح پر شروع کرنے کا فیصلہ کرلیا گیا ہے۔ وفاق المدارس کے اس حوصلہ افزا اقدام سے معلوم ہوتا ہے ارباب مدارس اپنے نصاب کو وقتاً فوقتاً اپ گریڈ کرتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے آج آپ کو ہزاروں ایسے علمائے کرام مل جائیں گے جو بظاہر دنیوی سمجھے جانے والے علوم وفنون کے بھی ایکسپرٹ ہیں۔ ان میں جج سے لے کر ماہر معیشت تک موجود ہیں۔ اگر دینی مدارس کا نظام اور نصاب اتنا پسماندہ ہے تو پھر یہ سب کیسے تیار ہو گئے؟

آنسوؤں کی جھڑی:

ان حقائق کے تناظر میں موجودہ حکومت کی رہنمائی کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ وہ دینی مدارس کی خدمات اور عوام میں ان کی مضبوط جڑوں کا پاس رکھتے ہوئے ان کے خلاف کسی جارحانہ اقدام اُٹھانے کے بجائے ان سے خیر خواہانہ اور مفاہمانہ رویہ اختیار کرے۔ اہم قومی وملکی معاملات میں ان سے وسیع تر مشاورت کا معمول بنائے۔

ادھر دینی مدارس کے رہنماؤں کو بھی چاہیے وہ حکومت کے ساتھ ہر ممکن تعاون کریں۔ عوام الناس کے اندر مدارس کے خلاف پھیلائے گئے شکوک وشبہات اور پروپیگنڈے کا تسلی بخش جواب دیں۔ ملکی وغیر ملکی اہم شخصیات کو بڑے مدارس کا دورہ کروائیں۔ ان کو اپنا نظام سمجھا کر قائل کرنے کی کوشش کریں۔ ان کے شبہات وخدشات کا ازالہ کریں۔

حاشا وکلا! ہمارا یہ مطلب نہیں دینی مدارس حکومت یا غیر ملکی عہدیداروں کی خوشامد کریں یا ان سے اپنی بقا کی بھیک مانگیں۔ ہاں! اتنی بات ضرور ہے جب اختلافات غلط فہمی پر مبنی ہیں تو اس کے ازالے کے لیے بات چیت اور مکالمے کا طریقہ اختیار کرنا ہی مفید ہوگا۔ یہ خبر قابلِ تحسین ہے دینی مدارس کے بارے میں غلط فہمیاں دور کرنے کے لیے گزشتہ دنوں پانچوں وفاق کے نمائندوں نے امریکی کانگریس کے ارکان سے باقاعدہ ملاقاتیں کی تھیں۔ ڈائیلاگ کا یہ دوراندیشانہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے تاکہ مغربی عوام کے ذہن میں موجود دینی مدارس کے بارے میں غلط فہمیاں دور ہو سکیں

اور پروپیگنڈے کی گرد چھٹ سکے۔

گزشتہ دنوں اسی حوالے سے ایک بوڑھے دانشور سے ملاقات ہوئی۔ اہل علاقہ اسے ''تاریخی بابا'' کے نام سے پکارتے ہیں۔ وہ ایک برجستہ، صاحب علم و فضل، نیک طینت عالم دین اور مفکر ہے۔ ایسی بزرگوار ہستی میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھی۔ مجھے پہلی ملاقات میں ہی اپنی اعلیٰ خصائص و صفات کی بنا پر اپنا گرویدہ بنالیا۔ وہ پوری رات عبادت میں مشغول رہتا اور دن بھر عالم اسلام، مسلمانوں اور اسلام کی فلاح کے بارے میں سوچتا رہتا۔ کبھی کبھی وہ مجمع سے خطاب بھی کرتا۔ اس کی تقریر نہایت پُر مغز اور اثر پذیر ہوتی۔ دورانِ تقریر مسلمانوں کی بے بسی پر جب کڑھتا تو اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی۔

تمہید کے بعد:

میں جب بھی کچھ پوچھتا تو بڑے اچھے انداز سے جواب دیتے۔ جب انہیں معلوم ہوا میں ایک عشرے سے کوچۂ صحافت سے وابستہ ہوں اور دو معروف اخبارات میں میرے کالم چھپتے ہیں پھر تو ہر بات کو تفصیل سے سمجھانے کی کوشش کرتے۔ پاکستان کے مذہبی، سیاسی اور علاقائی حالات پر سوال کے جواب پر روشنی ڈالتے ہوئے انہوں نے کہا: ''ہم سب ایک کشتی کے سوار ہیں۔ وہ اس سفینۂ ملک و ملت کے ناخدا ہیں اور ہم اس کے مسافر۔ اس کے پتوار ان کے ہاتھ میں ہے اور ساحل مطلوب تک پہنچنے کے لیے ہواؤں کا رُخ متعین کرنا اور درپیش طوفانوں سے اس کو بچانا ان کی ذمہ داری ہے۔

اگر کوئی مسافر کشتی میں سوراخ کر رہا ہو تو اسے نہ صرف روکنا بلکہ ناخداؤں کو آگاہ کرنے کی ذمہ داری بھی مسافروں پر عائد ہوتی ہے۔ اگر ہم نے اپنی اپنی ذمہ داریوں کو دیانتداری سے نہ نمٹایا اور تساہل و تغافل برتا تو پھر خاکم بدہن سفینہ بچے گا نہ ملاح اور نہ ہی مسافر۔ بچنے کی صورت صرف یہی ہے کہ سب مل جل کر اس سوراخ کرنے والے کا ہاتھ روکیں۔ ورنہ ''لمحوں نے خطا کی صدیوں نے سزا پائی'' والا معاملہ ہوگا......''

کچھ دیر کے بعد میں دو زانو ہو کر بیٹھا اور مزید پوچھا: ''پاکستان کے تعلیمی نصاب میں

تبدیلیوں کو آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں؟ اس کا محرک کون ہے؟ اس کے مقاصد کیا ہیں؟ ہماری آیندہ نسل پر اس کے کیا کیا اثرات مرتب ہوں گے؟ اس کے کیا نتائج نکلیں گے......؟''

یہ سننے کے بعد انہوں نے گردن جھکائی، مراقبہ کیا، کچھ دیر سوچتے رہے۔ اتنی گہری سوچ میں چلے گئے میں سمجھا شاید میں نے کوئی غلط یا بے موقع سوال پوچھ لیا ہے۔ جس پر وہ رنجیدہ اور غمزدہ ہو گئے۔ کچھ دیر کے بعد انہوں نے سکوت توڑتے ہوئے مجھے مخاطب کر کے کہا: ''اچھا سوال پوچھا ہے۔''

یہ سن کر میں سمجھا یقیناً وہ مجھ پر مہربان ہو چکا ہے اور ان کا جواب مجھ پر کئی خفیہ کہانیاں اور سربستہ راز آشکارا کرے گا اس لیے میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔ میں اس لیے بھی خوش تھا کہ ان کا جواب میرا کالم بن جائے گا جو میرے لیے اعزاز ہے۔ انہوں نے تمہید باندھتے ہوئے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔

خوشحالی اور تعمیر و ترقی کا راز:

''اس حقیقت سے سبھی آشنا ہیں کہ ملکوں اور قوموں کی خوشحالی، تعمیر و ترقی اور استحکام کا دار و مدار نظامِ تعلیم پر ہوتا ہے۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر دنیا بھر کی ریاستیں اپنے شہریوں کو بہتر سے بہتر تعلیمی مواقع فراہم کرتی ہیں۔ ملک و قوم کی تہذیب و ثقافت اور نظریہ سے ہم آہنگ نصاب تعلیم ترتیب دیئے جاتے ہیں۔ قوموں کے عروج و زوال میں علم کی حیثیت اور اس کا عمل دخل ایک مسلّمہ امر ہے۔

وہ علم جو اس قوم کے نظریۂ حیات سے مطابقت رکھتا ہو۔ خالقِ کائنات نے اپنی مخلوق میں سے مرکزی کردار کی حامل نوع انسانی کو اشرف المخلوقات قرار دیتے ہوئے اسے اس کے جدِ امجد حضرت آدم علیہ السلام کے ذریعے پہلا تحفہ ہی علم کا دیا اور پھر گزرتے زمانے کے ساتھ کم و بیش سوا لاکھ انبیا و رسل اور کتب و صحف کے ذریعے اپنے چشمۂ فیض سے نوازا۔ مگر چونکہ حق و باطل کا معرکہ ازل سے جاری ہے اور ابد تک رہے گا اس لیے شیطان اور اس کے آلہ کاروں کو یہ کب گوارا تھا؟ اس نے ''علم دشمن'' تلاش کر لیے اور پھر ماضی کے ساڑھے چودہ سو سال گواہ ہیں کہ علم کے بازار میں جہالت کس کس روپ میں گمراہی کے اہداف لے کر آتی رہی۔ کبھی دھتکاری گئی تو کبھی

سینے سے لگائی گئی۔

متحدہ ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ذریعے لارڈ میکالے اور مسیحی مشنری ادارے ”قوم کی تقدیر“ بدلنے کے لیے ”جدید نظامِ تعلیم“ لائے جس سے قوم کی تقدیر تو نہ بدلی البتہ قوم کی تدبیر ضرور بدل گئی۔ لارڈ میکالے کی تیار کردہ قوم آج اُس کے اہداف کی تکمیل کے لیے سرگرداں ہے۔

قیامِ پاکستان سے آج تک اسلامی جمہوریہ پاکستان میں مقاصد سے ہم آہنگ تعلیم کے لیے کسی نے سوچا نہ ہی منصوبہ بندی کی۔ ہر دور کی بدلتی قیادت اپنی اپنی مرضی کے تجربات میں مصروف رہی۔ کسی کے من کو امریکی طرزِ تعلیم بھا گیا تو کوئی روس کے کریملن کا نظامِ تعلیم متعارف کروا کر مطمئن ہو گیا۔

ہر طرح کا تجربہ اس ”تجربہ گاہ“ میں ہوا، مگر اس بات پر ہر حکومت کو شرحِ صدر رہا اسلام کی بنیاد پر تعلیم قوم کے لیے مہلک ہے۔ جبکہ تعلیم کی حالت یہ ہے آزادی کے 63 سال گزر جانے کے باوجود ہماری شرح خواندگی 50 فیصد بھی نہ ہو سکی۔ یہ کتنی شرمناک بات ہے ہماری شرح خواندگی صرف 34 فیصد ہے۔ خواندگی کے لحاظ سے پاکستان دنیا میں 160 ویں، 58 مسلم ممالک میں 44 ویں، 7 سارک ممالک میں چھٹے اور دنیا کے گنجان ترین ممالک E.9 میں آخری نمبر پر ہے۔

جسمانی اور ذہنی غلامی:

مشرف دور میں طاغوتی قوتوں کے اشاروں پر نصابِ تعلیم سے قرآنی آیات، انبیائے کرام علیہم السلام، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور مسلم فاتحین رحمہم اللہ کے واقعات اور فلسفہ جہاد و شہادت کا اخراج کیا گیا اور اسلامیات کے مضمون پر ہر طرف سے نشتر چلائے گئے۔ یہ اقدامات پاکستان کی نظریاتی اساس پر حملہ ہیں اور اسے ایک سیکولر ریاست بنانے کی طرف پیش قدمی ہے۔ سوچنے کی بات ہے آخر ان مضامین ہی کی کاٹ چھانٹ کیوں کی جا رہی ہے اور اس کے ذریعے کون سی ترقی مطلوب ہے؟

یہ ہمیں ہماری تاریخ سے روشناس کراتے ہیں۔ مسلمانوں کے عروج و زوال اور اس کے اسباب بتاتے ہیں۔ ہمیں ہماری اور ہمارے ملک کی بنیاد بتاتے ہیں۔ آخر ہم کب تک اس

حقیقت سے منہ چراتے رہیں گے؟ ان اصلاحات کا مقصد محض حکمرانوں کے خودساختہ اعتدال پسندی کے نظریے کا فروغ ہے اوراس کے ذریعے وہ معاشرہ وجود میں آئے گا جس کے افراد کو اپنے ملک ودین سے کوئی سروکار نہ ہوگا۔ یہ بات ہر سچے محبِ وطن کے لیے لمحۂ فکریہ ہے۔

دنیا بھر کی قومیں اپنے نظامِ تعلیم کو ملک وقوم کے مذہب اور نظریہ سے ہم آہنگ کرتی ہیں۔ مذہب اور نظریہ سے مربوط نظامِ تعلیم کے نتیجے میں پروان چڑھنے والی نسل ایک مضبوط معاشرے کی تشکیل کرتی ہے۔ جاپانی کہاوت ہے: ''منصوبہ ایک سال کا ہو تو فصل اگاؤ، منصوبہ دس سال کا ہو تو درخت اگاؤ۔ اگر منصوبہ دائمی ہے تو تعلیم دو۔''

کسی بھی ملک کے عوام کو تبدیل کرنے یا اس کو ذہنی طور پر غلام بنانے کے لیے اس کے نصابِ تعلیم کو تبدیل کردیا جائے تو وہ قوم ذہنی طور پر غلام بن جاتی ہے اور ذہنی غلامی جسمانی غلامی سے ہزارہا درجہ بدتر ہے چونکہ جسمانی غلامی میں صرف جسم غلام ہوتا ہے اور ذہنی غلامی سے انسان کا کردار تک مرجاتا ہے۔

نصابِ تعلیم اور نظامِ تعلیم:

حالیہ نصابِ تعلیم میں تبدیلیاں معمولی نوعیت کی نہیں ہیں جنھیں نظر انداز کیا جائے بلکہ یہ ہمارے نظریۂ حیات، ملتِ اسلامیہ اور نظریہ پاکستان کی نفی اور تبدیلی ہے۔ وہ استعماری قوتیں نوجوانانِ پاکستان کو نظریہ اسلام سے بیگانہ کرکے نہ صرف غیرمحسوس طریقے سے لادینیت، الحاد اور سیکولرازم کے اندھیروں میں دھکیلنا چاہتی ہیں بلکہ ملک کی جڑوں کو کھوکھلا کرنے پر تلی ہوئی ہیں۔ انھوں نے اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے بیک وقت دو محاذوں پر یلغار کی۔

ایک نصابِ تعلیم اور دوسرا نظامِ تعلیم۔ نصابِ تعلیم میں تبدیلی کے لیے انھوں نے ہماری صفوں میں سے افراد کو چنا اور نظامِ تعلیم کے لیے پرانے شکاریوں کو نیا جال دے کر بھیجا جنھوں نے ترقی وخوشحالی کے دانے ڈال کر قوم کو پھانسنے کی کوشش کی۔ بیگانوں سے تو کہنا کیا! افسوس اپنوں پر ہے جو غیرمحسوس طریقے سے اسلام اور پاکستان دشمن قوتوں کے ایجنڈے کی تکمیل کا آلہ کار بن گئے اور اسلام کی بنیاد پر قائم ہونے والی خالص اسلامی نظریاتی ریاست کے نصابِ تعلیم کو

قراردادِ مقاصد اور قومی تعلیمی پالیسی سے انحراف کرتے ہوئے یوں بدل ڈالا کہ وہ اسلامی ملک کا نصابِ تعلیم محسوس نہیں ہوتا۔

اب آپ غیر ملکی ''آقاؤں'' کے وہ بیانات پڑھیے جس میں انہوں نے اقرار کیا ہے پاکستان کا نصابِ تعلیم اور نظامِ تعلیم تبدیل کرنے کے لیے ہم نے پاکستان پر ''زور'' ڈالا۔ اس کے بعد اس بات میں کوئی شک نہیں رہتا کہ دشمن قوتیں کس طرح ہم پر حملہ آور ہو رہی ہیں اور ہم محوِ خوابِ خرگوش ہیں۔

2 فروری 2005ء کو امریکی ٹی وی کو انٹرویو دیتے ہوئے امریکی صدر بش نے دوٹوک الفاظ میں کہا تھا: ''پاکستان کا نصابِ تعلیم میرے کہنے پر تبدیل کیا گیا۔ میں نے پرویز مشرف سے بات کی تھی۔ اس کے بعد میرا تعارف زبیدہ جلال سے کروایا گیا۔ صدر مشرف کی حمایت کے بعد پاکستان کے نظامِ تعلیم میں ان کی ''بہتری'' کے لیے اقدامات کیے گئے۔''

9 اپریل 2004 میں امریکی وزیر خارجہ کونڈو لیزا رائس نے امریکی سینٹ میں بیان دیتے ہوئے کہا تھا: ''امریکا کے خلاف پاکستان میں بڑھتی ہوئی نفرت کا شافی علاج وہاں کی وِنڈر فل لیڈی زبیدہ جلال، نصابِ تعلیم میں ہماری مطلوبہ تبدیلیاں کر کے علاج کر رہی ہیں۔'' 17 مارچ 2004ء سابق امریکی وزیر خارجہ کولن پاؤل نے کہا: ''پاکستان سمیت تمام مسلم ممالک کے اسکولز دہشت گردوں کی آماجگاہ ہیں۔ ہمیں ان کے نصابِ تعلیم کے متعلق تشویش ہے۔ اس کے ازالے کے لیے ہم نے صدر مشرف سے بات کی ہے۔''

جون 2004ء میں پشاور یونیورسٹی میں خطاب کرتے ہوئے برطانوی وزیر خارجہ جیک اسٹرا نے واشگاف انداز میں کہا: ''پرویز مشرف جو ''اصلاحات'' متعارف کروا رہے ہیں ہم اس کا بھرپور خیر مقدم کرتے ہیں۔'' 28 جولائی 2003ء امریکی ادارے ''ایجوکیشن سیکٹر ریفارمر'' کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر مسٹر برائن نے اسلام آباد میں بتایا: ''پاکستان کے نصابِ تعلیم کی ''اَپ گریڈیشن'' کے لیے امریکا پاکستان کو 60 ملین ڈالر، پاکستانی کرنسی 3 ارب 90 کروڑ روپے امداد دے گا۔''

......میں دہراتا ہوں......:

ان بیانات کے کچھ ہی عرصے بعد اسی مشن کو آگے بڑھاتے ہوئے پاکستان کے ارباب اقتدار نے بھی اس طرح کے حیرت انگیز بیانات داغے۔ اس وقت کے صدر پرویز مشرف نے ''انڈیا ٹوڈے'' کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا: ''پاکستان اور بھارت کا نصابِ تعلیم مشترک ہونا چاہیے۔''

مئی 2004ء میں قومی اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے سابقہ وزیر تعلیم زبیدہ جلال نے کہا: ''بیالوجی کی کتاب میں قرآنی آیات کا کیا کام ہے؟ اور اگر سیرتِ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کتے کی تصویر آ گئی ہے تو اس میں کیا مضائقہ ہے؟'' یکم ستمبر 2004ء کو وزیر تعلیم کے حکم سے تعلیمی اداروں سے ریفریشر کورس کے لیے 200 ٹیچرز کی امریکا روانگی۔ اور پھر اس کے بعد اسلامی جمہوریہ پاکستان کے نصابِ تعلیم کے حوالے سے جو کچھ ہوا اور ہو رہا ہے وہ پاکستان کے مسلمانوں کے لیے کسی المیہ سے کم نہیں۔

باخبر درویش صفت دانشور نے مزید کہا: ''وطنِ عزیز پاکستان لاکھوں مسلمانوں کے خون اور مسلمان ماؤں، بہنوں، بیٹیوں کی عصمتوں کا نتیجہ ہے۔ کروڑوں مسلمان عوام اور ہزاروں حقیقی رہنماؤں کی انتھک محنت وجدوجہد کے زمرے میں پاکستان معرضِ وجود میں آیا۔ مقصد یہ تھا ایک الگ ملک حاصل کر کے اس میں اسلام کو عملی طور پر نافذ کیا جا سکے تا کہ مسلمان اسلام کے زریں اصولوں کے مطابق زندگی گزار سکیں لیکن صد افسوس! اپنے قیام کے فوراً ہی بعد پاکستان کو اسلام سے دور رکھنے اور اس کی نظریاتی وجغرافیائی سرحدوں کو پامال کرنے کی بھرپور سازشیں کی گئیں۔

کہیں معیشت پر ڈاکہ ڈالا گیا، کہیں ثقافت کو یرغمال بنایا گیا اور کہیں ڈش، کیبل پر فحش فلموں کے ذریعے نئی نسل کے ذہنوں کو مادر پدر آزادی کی طرف مائل کیا گیا اور اب...... میں دہراتا ہوں...... اب طاغوتی قوتیں نظامِ تعلیم پر اپنی گرفت مضبوط کر کے نئی نسل کے ذہنوں سے اللہ، رسول اور اسلامی تہذیب وثقافت کو ختم کرنے کی کوشش کر رہی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ ہی اپنے دین کی حفاظت کرنے والے ہیں، دشمن اسلام کو ختم نہیں کر سکتا۔ اس کی واضح مثال یہ ہے کہ روس 77 سال تک تاجکستان، کرغستان، ازبکستان اور دیگر ریاستوں پر مسلط رہا اور وہ اپنے ''خیال'' میں

اسلام ختم کر چکا تھا لیکن جب سات دہائیوں کے بعد یہ ریاستیں آزاد ہوئیں تو ہزاروں لاکھوں فرزندانِ اسلام اپنے دین کا تحفظ کرنے والے موجود تھے۔

چہرے پڑھنے کا اسپیشلسٹ:

انہوں نے آسمان کی طرف منہ کیا۔ دونوں ہاتھ اُٹھائے، آنسوؤں کی لڑی ان کے رُخساروں پر جاری تھی اور زبان پر یہ الفاظ تھے: ''اے وہ پاک ذات! جس کی طرف عاجزی کی جاتی ہے اور جس پر اعتماد کیا جاتا ہے۔ جب کوئی شخص تجھ سے اُمید باندھ لے تو وہ نامراد نہیں ہوسکتا، اس کی اُمید ضرور پوری ہوتی ہے تو ہماری نئی نسل کی حفاظت فرما۔

ہماری اس نئی آنے والی نسل سے بڑی امیدیں وابستہ ہیں تو ان کا محافظ ہو جا اور جس کا تو نگہبان ہو جائے اس کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا......'' یہ کہتے ہوئے انہوں نے مجھے جانے کی اجازت دی اور میں اس دور اندیش، باخبر اور ضعیف دانشور کے نصاب و نظامِ تعلیم کے حوالے سے فکر انگیز انکشافات سن کر دشمن قوتوں کے خوفناک منصوبوں پر کڑھتا ہوا اپنی اور قوم کی بے بسی پر پشیمان لوٹ آیا۔

بے شک طلبہ کسی بھی قوم کا سرمایہ ہوتے ہیں۔ ان پر آج جو محنت کی جائے گی کل اس کا پھل ساری اُمت کو ملے گا۔ اگر کوئی قوم اپنا مستقبل حال سے بہتر بنانا چاہتی ہے تو اسے اپنا علم و تجربہ نوجوان طلبہ تک منتقل کرنا لازمی ہے۔ اگر طلبہ چاہتے ہیں وہ مستقبل میں خود کو ملنے والی قیادت کی ذمہ داریاں کما حقہ نبھا سکیں تو انہیں اپنے اساتذہ کے سینوں سے جاری علم و معرفت کے چشموں کو اس خوبی سے جذب کرنا ہوگا جیسے نشیبی زمین موسمِ بہار کی بارش جذب کر کے گلہائے رنگا رنگ اور اشجار پر اثمار اُگاتی ہے۔

اس زمانے میں کفر نے مادے پر دنیا پرست دیوانوں کی طرح شب و روز محنت کر کے ایسی ترقی حاصل کر لی ہے۔ اپنے علم و تجربے کو اتنی وسعت دے دی ہے۔ ہماری آنے والی نسل تبھی کفر کے نو زائیدہ شتونگڑوں کا مقابلہ کر سکے گی جب ان کو ظاہری و باطنی علوم میں گہرا رسوخ حاصل ہو۔ رسوخ حاصل ہوتا ہے تعلیم کے زمانے میں حصولِ علم کے آداب اور تقاضے پورے کرنے سے۔ یہ زمانہ اگر

غفلت میں گزر جائے تو آدمی اپنوں کے لیے عبرت اور غیروں کے لیے ٹھٹھول کا سامان بن جاتا ہے۔

چند دن بعد میری ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوئی جو ہر اعتبار سے قابلِ رشک اور ترقی کی معراج پر پہنچا ہوا ہے۔ وہ ہر فن مولا ہے۔ ناممکن کو ممکن بنانے کا ماہر ہے۔ وہ پتھروں کو "پارس" بنانے کا ہنر بخوبی جانتا ہے۔ آج تک ان کی لغت میں "نہیں" کا لفظ درج نہیں ہو سکا۔ وہ حافظ، عالم، مفتی، مفکر، دانشور اور قلم کا شہسوار ہے۔

اسلاف کی نشانی ہے۔ وہ ہر میدان کا ماہر ہے۔ وہ ناموری وشہرت، علم وفضل اور دینی ودنیاوی ترقی کے اعتبار سے اوجِ ثریا تک پہنچا ہوا ہے۔ وہ جس شعبے میں بھی جائے قیادت ہی کرتا ہے۔ دورانِ تعلیم بھی وہ ہم سبقوں سے آگے ہی رہا کیونکہ اس کی گھٹی میں ہی سیدزادہ ہونے کی وجہ سے سرداری ہے۔ وہ 21 سال سے "مفتی گر" ہیں۔

اللہ نے انہیں اچھی شکل وصورت دینے کے ساتھ ساتھ سیرت سے بھی خوب نواز رکھا ہے۔ اُن کا پڑھنے پڑھانے کا اسٹائل بھی نرالا ہے۔ وہ ایک عشرے سے صحافت کی دنیا پر بھی چھائے ہوئے ہیں۔ ان کی بات مستند مانی جاتی ہے۔ ان کا تجزیہ وتبصرہ خطا نہیں کرتا۔ وہ آج بھی تین بڑے شعبوں کے انچارج ہیں۔ سیکڑوں ان کے شاگرد ہیں۔ وہ کھوٹے کھرے کی پہچان کے اسپیشلسٹ ہیں۔ چہرے پڑھنا ان کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔ دلائل کی دنیا میں بات منوانا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔

دنیا بھر کی معلومات سے ان کی نجی محفل میں بیٹھنے والا ہر شخص محظوظ ہوتا ہے۔ اسلام اور عالم اسلام کے حالات ان کے نوکِ زباں ہوتے ہیں۔ مسلمانوں کی معدنی دولت پر یہود ونصاریٰ کے کنٹرول پر وہ کڑھتا رہتا ہے۔ غریبوں، یتیموں اور فقیروں کا وہ یار بیلی ہے اور ان کی مدد پر وہ خوش بھی ہوتا ہے۔ اسلامی بینکاری، جدید علوم وفنون، عصرِ حاضر کی ضروریات کی ترویج اور دیگر متروکہ شعبوں کے احیا کے لیے وہ ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا ہے۔

تبدیلیاں یا اضافے؟

کسی کام کے نہ ہونے سے وہ مایوس نہیں ہوتا کیونکہ وہ مایوسی اور کم ہمتی کو سب سے بڑی

لعنت سمجھتا ہے۔ ہر نظام کو وہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں دیکھنا چاہتا ہے۔ طالبان کے سنہری دور کے خاتمے پر وہ خون کے آنسو ضرور رویا تھا مگر دنیا بھر میں اسلامی جہادی تحریکوں کی حیرت انگیز کامیابیاں اس کی ہمت بندھاتی ہیں کہ وہ دور پھر آنے والا ہے۔ حماس کا وہ عاشق ہے۔ مسئلہ فلسطین کو وہ اقوام عالم کے فساد کی اصل جڑ قرار دیتا ہے۔ جہاد اور مجاہدین سے انوکھا لگاؤ رکھتا ہے۔ وہ علمی شخص ہے اور ایسی ہی باتیں پسند کرتا ہے۔ دینی مدارس سے وہ خاص محبت رکھتا ہے اسی لیے وہ ان کی بہتری کے لیے ہر وقت سوچتا رہتا ہے۔

دورانِ ملاقات میں نے پوچھا: ''آپ نے 21 سال تک افتاء کا کام کیا اور 25 سالہ آپ کا تدریسی تجربہ ہے۔ دینی مدارس کے درسِ نظامی کی کوئی ایسی کتاب نہیں جس پر آپ نے ہر اعتبار سے غور و خوض نہ کیا ہو، کیا مدارس کے نصاب میں تبدیلی ہونی چاہیے؟''

اس نے ٹھنڈی آہ بھری، آنکھیں موندیں، پلکیں جھپکائیں، قہوے کی چسکی لی اور نیم افسردہ مسکراہٹ سے بولا: ''ہونی چاہیے لیکن آپ اسے تبدیلی نہ کہیں، اضافہ کہیں۔ تبدیلی کا لفظ بلاوجہ کی تشویش پیدا کرتا ہے۔ مجھے یہ بات کہتے ہوئے 25 سال، 6 ماہ، 29 دن ہو چکے ہیں لیکن......''
وہ کہتے کہتے رک گئے...... لیکن کچھ دیر سوچنے کے بعد گویا ہوئے: ''کچھ حضرات نہیں مانتے۔ وہ اسے دشمن کی گہری سازش قرار دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں اس میں ذرا سی تبدیلی سے بھی ہمارا حال ترکی والا ہوگا حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں۔

نصاب ''جامد'' ہونے کی وجہ سے ہی ہم زمانے سے کئی سال پیچھے ہیں جبکہ ہمیں زمانے سے دس سال آگے ہونا چاہیے تھا کیونکہ قیادت کا خواب دیکھنے والے ہمیشہ آگے ہوتے ہیں اور ان کی نظریں دور اندیش ہوتی ہیں نہ کہ دیر اندیش۔ کسی بھی ترقی کا خواب دیکھنے والی قوم کا نصابِ تعلیم ''جامد'' نہیں ہوتا بلکہ وہ حالات اور وقت کے ساتھ ساتھ نصاب کو جدید سے جدید تر بنانے کی بھرپور کوششیں کرتے رہتے ہیں کیونکہ ضروری تبدیلیاں یا اضافے ہی کسی کو موجودہ حالات سے ہم آہنگ کر سکتے ہیں۔ اس کی کئی واضح مثالیں خیر القرون سے بھی ملتی ہیں۔

”تعزیراتِ ہند“ کے قوانین:

غزوۂ بدر میں نادار قیدیوں کی آزادی کے لیے شرط لگائی گئی تھی کہ وہ مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھادیں۔ ظاہر ہے یہ تمام قیدی کفار تھے۔ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو عبرانی زبان سیکھنے کا حکم دیا گیا تھا۔ یہ زبان اس زمانے کے کفار کی تھی اور انہی سے سیکھی گئی تھی۔ جدید ایجادات کے استعمال کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تعریف فرما کر ٹیکنالوجی کی اہمیت آشکارا فرمادی تھی۔ چنانچہ مسلمانوں نے اس زمانے سے ہی اس پر توجہ دینا شروع کردی تھی۔ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس زمانے کی منجنیقوں کی تربیت کفار کے پاس جا کر حاصل کی تھی۔

محمد بن قاسم کا منجنیق کے ذریعے سندھ کو فتح کرنا بچے بچے کو معلوم ہے۔ مغل حکومتوں کی توپیں بھی آج تک فوجی چھاؤنیوں میں نظر آجاتی ہیں۔ صلاح الدین ایوبی اور ٹیپو سلطان نے اپنے دور میں دستیاب جدید سے جدید ٹیکنالوجی استعمال کی ہے۔

فقہ حنفی کو مرتب کرنے والے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے جلیل القدر شاگرد حضرت امام محمد رحمہ اللہ نے فرمایا: ”من لم یعرف اھل زمانه فھو جاھل.“ ”جو شخص اپنے زمانے کے لوگوں کے مزاج وطریق کار سے واقف نہیں وہ جاہل ہے۔“ حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ نے بڑی کوشش کی کہ پورے ہندوستان کا نصابِ تعلیم ایک اور اعلیٰ سے اعلیٰ ہو، جامد نہ ہو لیکن نامعلوم طاقتوں نے ایسا نہ ہونے دیا۔

قضا وتحکیم کے قوانین، اکاؤنٹنگ اور بینکنگ کا نظام، انگلش لینگویج، ٹیچر ٹریننگ، کمپیوٹر کی تعلیم اور دیگر جدید علوم آلیہ کی تعلیم کا واضح ثبوت حکیم الامۃ مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کے قول سے بھی ملتا ہے۔ جدید علوم سیکھنے اور نصاب میں تبدیلی واضافے کا مشورہ دیتے ہوئے ایک مرتبہ آپ نے فرمایا: ”میرے خیال میں ”تعزیراتِ ہند“ کے قوانین کی تعلیم، ڈاکخانہ اور ریلوے کے قواعد وضوابط کی تعلیم، عصرِ حاضر کے مطابق مبلغ تیار کرنے کی تعلیم اور صنعت وحرفت کی تعلیم مدارس کے نصاب میں داخل ہونی چاہیے تا کہ طلبہ کرام فراغت کے بعد کسی طرح بھی کسی دوسرے کے محتاج نہ ہوں۔“

دو بنیادی وجوہات:

ہم ان لوگوں کو دین کی بات سنانا چاہتے ہیں جو تیز رفتار گاڑی میں سوار ہیں لیکن افسوس ہم خود پیدل ہیں۔ اندازہ لگائیے پیدل آدمی تیز رفتار گاڑی میں سوار کو کس طرح اپنی بات سمجھا سکتا ہے۔ ان کو بات سمجھانے کے لیے ہمیں مدارس کے نصاب میں چندوہ چیزیں شامل کرنی ہوں گی جن کی ضرورت دعوتِ دین کے حوالے سے پیش آتی ہے۔ تم دیکھنا آج سے دس سال کے بعد اگر ہم نے نصاب میں ضروری اضافے نہ کیے تو دنیا ہمیں مسترد کردے گی کیونکہ وہ ہم سے بہت آگے نکل چکی ہوگی۔

ہمیں دنیا میں رہنے کے لیے دنیا کے طور طریقے سیکھ کر ان کا ساتھ دینا ہوگا۔ ہمیں دورِ جدید کے چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ان چیزوں سے کم از کم واقفیت ضرور حاصل کرنا ہوگی جو عصرِ حاضر میں دین کی تفہیم وتشریح کے لیے ضروری ہیں۔ آج ہمیں ان چیلنجوں کا سامنا نہیں ہے جن کا نصف صدی پہلے تھا تو پھر ہمارا نصاب ونظام نصف صدی پہلے والا کیوں ہے؟

ان کا کہنا تھا: ”آج کے جو مسائل ہمیں درپیش ہیں وہ اُمت کے لیے تو نئے مسائل ہیں لیکن اس قسم کا چیلنج نیا نہیں ہے۔ سب سے پہلے یہ چیلنج مسلمانوں کو اس وقت پیش آیا جب مسلمان جزیرۃ العرب سے نکلے۔ قوموں کی باگ ڈور ان کے ہاتھوں میں آئی اور ان کو دنیا میں پھیلے ہوئے مختلف فلسفیانہ نظریات سے واسطہ پڑا۔ یونان کے فلسفہ سے، ہندوستان کے فلسفہ سے اور نظریات سے یہ بہت بڑا چیلنج تھا۔ معمولی چیلنج نہیں تھا۔ جیسا چیلنج آج ہمیں درپیش ہے وہ اس سے بھی بڑا چیلنج تھا کیونکہ اس وقت تک مسلمانوں نے فلسفہ کے اندر قدم ہی نہیں رکھا تھا۔

اب تو کیفیت یہ ہے ہمیں تقریباً ایک ہزار سال سے زیادہ ہوگیا ہے مختلف نظریات کے بارے میں سوچنے، سمجھنے اور ان کے جواب دینے کی عادت پڑگئی ہے لیکن وہ وقت تو ایسا تھا فلسفیانہ نظریات اچانک سامنے آئے۔ اس سے پہلے مسلمانوں کے سامنے یہ مسئلہ تھا ہی نہیں تو ہمارے اسلاف نے کیا کیا؟ ہمارے بزرگوں نے یہ کام کیا ان تمام علوم کو حاصل کیا۔ وہی فلسفے جو اسلامی عقائد اور علوم سے ٹکرا رہے تھے۔ ان فلسفوں میں مہارت پیدا کی۔ صرف یہ نہیں کہ سمجھ لیا بلکہ مہارت پیدا کی۔ اس

میں مصنف بنے، محقق بنے۔ نئے نظریات دنیا کے سامنے لائے اور دنیا کو باور کرایا جتنا کچھ فلسفے کا اسلامی نظریات سے ٹکراؤ تھا، فلسفیانہ بنیادوں پر اور فلسفیانہ انداز میں ان کا رد کیا۔ صرف یہ نہیں کہا، قرآن کے خلاف ہیں۔ عربیت کے خلاف ہیں بلکہ یہ بتایا وہ عقل کے بھی خلاف ہیں۔

نئے دور کے نئے چیلنجز:

ارسطو نے کوئی بات لکھی ہے تو یہ ثابت کیا وہ عقل کے خلاف ہے۔ افلاطون نے فلاں بات عقل کے خلاف کہی ہے اور سقراط نے جو فلاں بات کی ہے عقل اس کو تسلیم نہیں کرتی۔ دلائل سے اس کو ثابت کیا تو اس وقت اُمت میں ایک نیا کام تھا اور عام روش سے ہٹ کر کام کر رہے ہیں تو درحقیقت بنیادی طور پر یہ اسلام اور مسلمانوں کی تعلیمی پالیسی کے تسلسل سے ہٹ کر نہیں ہے۔ ہمارے بزرگان دیو بند کو آپ دیکھ لیں۔ انہوں نے ان تمام علوم وفنون کی حفاظت جو پچھلی صدیوں سے چلے آرہے تھے، فلسفہ میں بھی، فلکیات میں بھی، منطق میں بھی، حکمت وطب میں بھی اور دوسرے علوم اسلامی تو اپنی جگہ پر تھے مگر ان علوم وفنون میں بھی مہارت پیدا کی اور ہمارے دارالعلوم دیو بند میں ان تمام علوم کے ماہرین موجود تھے۔

اب ہمارا واسطہ جدید سائنس سے ہے۔ سائنسی تجربات سے ہے اور آج ہمارے لیے یہ بات بہت آسان ہے۔ اس لیے کہ اسلامی عقائد کا فلسفہ کے ساتھ تو تصادم ہوا ہے، آیندہ بھی رہے گا مگر سائنس کے ساتھ اسلام کا تصادم نہیں ہے۔ فلسفیانہ نظریات کا تصادم تو اسلام کے ساتھ ہوتا رہا ہے۔ آج بھی ہے اور آیندہ بھی ہوتا رہے گا لیکن خوب سمجھ لیجیے سائنس کے ساتھ اور اس کے تجربات ومشاہدات کے اسلام کا کوئی تصادم نہیں ہے اور نہ ہی ہو سکتا ہے کیونکہ سائنسی حقائق تجربات اور مشاہدات کی بنیاد پر ہوتے ہیں۔ ان کا کوئی عقل سلیم رکھنے والا شخص انکار نہیں کر سکتا۔ اسلام نے بھی کہیں ان کا انکار نہیں کیا۔ اب ہمارا کام آسان ہو گیا ہے۔ ہمیں اب فلسفیانہ نظریات اور سائنسی حقائق سے واسطہ ہے اور اب ہمارا کام صرف اشارہ گیا ہے اپنے زمانے کو سمجھیں اور اہلِ زمانہ کو سمجھیں۔

آج کے مسائل کو سمجھیں اور جدید چیلنجز کو سمجھیں کہ قانون کی دنیا میں کیا مسائل ہیں؟

معیشت کے میدان میں کیا مسائل ہیں؟ سیاسی اور قانونی میدان میں کیا مسائل ہیں؟ طب کی دنیا کے کیا مسائل ہیں؟ ان مسائل کو سمجھنا اور زمانے کے حالات اور تقاضوں کو سمجھنا ایک عالم دین کا فرض منصبی ہے۔ صرف مستحب نہیں ہے بلکہ فرض وواجب ہے۔ آج کے مسائل کو سمجھنا بھی اور آج کے لوگوں اور اقوام وممالک کو سمجھنا بھی، اس لیے اب دنیا سمٹ گئی ہے اور سارے براعظم مل کر ایک شہر کی شکل اختیار کر گئے ہیں۔ اس وقت امت مسلمہ کو پوری دنیا کے مسائل کا سامنا ہے۔ پوری دنیا میں مسلمان موجود ہیں۔ وہاں ان کو طبی مسائل بھی درپیش ہیں۔ سیاسی مشکلات کا بھی ہے۔ قانونی اُلجھنوں سے بھی واسطہ ہے۔ دوسرے چیلنجز بھی درپیش ہیں۔ ان سب کو سمجھنا ہماری ذمہ داری ہے۔"

باخبر مفتی کی باتیں:

باخبر مفتی کا کہنا تھا: ''درس نظامی کے ساتھ عصری تعلیم کو چلانا انتہائی مشکل کام ہے لیکن بہتر منصوبہ بندی، لگن اور تھوڑی سی اضافی کوشش سے یہ معاملہ بڑی آسانی سے سلجھایا جاسکتا ہے۔ تھوڑے عرصے میں بالخصوص دینی اور بالعموم دنیاوی کامیابیاں سمیٹی جاسکتی ہیں۔ میٹرک مدارس کے طلبہ کے لیے عصری تعلیم کی پہلی سیڑھی سمجھی جاتی ہے۔ میٹرک کی عصری تعلیم میں وہی اہمیت ہے جو کسی عمارت میں بنیاد کی ہے۔ وفاقی حکومت کے ایک فیصلے کے مطابق نہم اور دہم کا علیحدہ علیحدہ بورڈ کا امتحان ہونا چاہیے، لیکن جو طلبہ نہم دہم کا اکٹھا امتحان دینا چاہیں تو اس کی بھی اجازت ہے۔ ہمارا مشورہ ہے جماعت نہم اور جماعت دہم کے علیحدہ علیحدہ امتحان دلوائے جائیں۔ اس کی دو بنیادی وجوہات ہیں۔ پہلا مدارس کا تعلیمی سال مطابق انگریزی مہینہ تقریباً نومبر میں شروع ہوتا ہے اور میٹرک کے سالانہ امتحان مارچ اپریل میں ہوتے ہیں۔ اگر چھٹیاں نکال دی جائیں تو 3 ماہ کا عرصہ بنتا ہے اور دوسرا عصری تعلیم کے لیے چوبیس گھنٹے تو کبھی بھی مختص نہیں کیے جاسکتے۔ زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے دیے جاسکتے ہیں۔ دو گھنٹے روزانہ کے حساب سے دیکھا جائے تو تقریباً 180 گھنٹے بنتے ہیں، جن میں 1050 نمبروں کی تیاری کرنی ہوتی ہے۔ اس لیے نہم اور دہم علیحدہ علیحدہ پڑھانے کے دو فوائد حاصل ہوں گے۔ ایک تو درس نظامی متاثر نہیں ہوگا اور دوسرا

عصری تعلیم بھی مضبوط ہوگی اور تھوڑی سی محنت سے اعلیٰ درجات بھی حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ نیز طالب علم کی بنیاد بالخصوص انگریزی قدرے مضبوط ہوگی۔

تھوڑی سی ذاتی کوشش:

مدارس کے طلبہ کو میٹرک میں مندرجہ ذیل مضامین پڑھنے چاہییں۔ انگلش، اُردو، حساب، اسلامیات لازمی، مطالعہ پاکستان، اسلامیات اختیاری، جنرل سائنس، عربی جو اختیاری مضمون ہے۔ عصری تعلیم کی دوسری سیڑھی ایف اے ہے۔ مروّجہ نصاب کے مطابق ایف اے میں کل 1100 نمبر ہوتے ہیں۔ جنہیں پارٹ ون، پارٹ ٹو میں مساوی تقسیم کیا جاتا ہے اور 1100 نمبر کا کمپوزٹ بھی دکھایا جاتا ہے۔ ایف اے میں مدارس کے لیے مندرجہ ذیل مضامین آسان بھی ہیں اور اعلیٰ نمبروں کے حصول میں معاون ہیں۔

انگریزی، اُردو، اسلامیات لازمی اور اختیاری مضامین عربی، اسلامیات اختیاری اور تاریخ اسلام۔ پاکستان کے تمام بورڈز میں عموماً اعلیٰ پوزیشنیں بھی مندرجہ بالا مضامین میں آتی ہیں۔ ایف اے میں مدارس کے طلبہ وطالبات کے لیے انگلش کے علاوہ کوئی بھی قابل ذکر مضمون نہیں جو ان کا زیادہ وقت لے۔ اس لیے انگریزی بہتر بنانے کے لیے ایک بہترین موقع ہے جس سے طلبہ بھرپور فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ عصری تعلیم کی تیسری اور اہم سیڑھی بی اے ہے۔ عموماً یونیورسٹیوں میں بی اے کے کل نمبر 800 ہیں۔ بعض میں پارٹ سسٹم رائج اور زیادہ تر میں کمپوزٹ یعنی دو سال کے بعد اکٹھا امتحان۔

بی اے کے بعد چونکہ ایم اے اور ایم فل وغیرہ کے لیے مطلوبہ مضمون پڑھنا ضروری ہے۔ ایم اے کے حوالے سے مدارس کے طلبہ میں عموماً غلط فہمی پائی جاتی ہے۔ وہ ایم اسلامیات وایم اے عربی کرتے ہیں حالانکہ حکومت پاکستان کے قوانین کے مطابق درس نظامی بذاتِ خود ایم اے عربی واسلامیات کے مساوی ہے۔ بس HEC یعنی ہائر ایجوکیشن کمیشن اسلام آباد سے ایم اے کے مساوی معاونت کا سرٹیفکیٹ لینا پڑتا ہے۔ اس لیے مدارس کے طلبہ سے گزارش ہے وہ مندرجہ بالا مضامین میں ایم اے کر کے اپنا قیمتی وقت برباد نہ کریں۔

دوسرے نمبر پر مندرجہ بالا مضامین کی طرف عام لوگوں کا بھی بہت زیادہ رجحان ہے جس سے ملازمت کے لیے سخت مقابلہ ہوتا ہے۔ اس لیے دنیاوی طور پر کامیابی کے مواقع بڑھانے اور علم کی وسعت کے لیے دیگر مضامین کا مطالعہ کریں۔ ایم اے اُردو ایم اے تاریخ، ایم اے سیاسیات یا ایم اے معاشیات کریں۔ اس طرح آپ کے پاس زیادہ مواقع ہوں گے اور ان مضامین میں ایم اے کرنے والوں کی تعداد نسبتاً کم ہے۔ ماسوائے ایم اے معاشیات کے دیگر مضامین تھوڑی سی ذاتی کوشش سے پڑھے جاسکتے ہیں۔ باقاعدہ داخلہ لینے کی ضرورت نہیں اور نہ ہی مستقل استاذ کی ضرورت ہے۔

روشن مستقبل کی ضمانت:

درسِ نظامی کی بنیاد پر ایم فل میں داخلہ لیا جاسکتا ہے۔ 2007ء سے ایک نئی شرط کا اضافہ ہوا ہے وہ ہے ٹیسٹ۔ یعنی داخلے کے وقت پاکستان کی تقریباً تمام یونیورسٹیوں کے لیے ٹیسٹ لازمی قرار دیا گیا ہے جو "NTS" یعنی نیشنل ٹیسٹنگ سروس لیتی ہے۔ اس ٹیسٹ میں مطلوبہ مضمون کے علاوہ انگلش و ریاضی میں درمیانے درجے کی مہارت ضروری ہے۔ عموماً تین ماہ کی تیاری سے یہ ٹیسٹ بآسانی پاس کیا جاسکتا ہے۔

اس ٹیسٹ کی تیاری کے لیے ہر بڑے شہر میں ادارے موجود ہیں۔ اس وقت ملک کے جامعات میں مدارس کے طلبہ کی ایک بڑی تعداد ایم فل / پی ایچ ڈی کر رہی ہے۔ مدارس کے طلبہ کو دیگر شعبوں میں بھی جانا چاہیے۔ ان میں بہت سا خلا موجود ہے۔ ان شعبوں میں علماء کی کمی شدت سے محسوس کی جارہی ہے۔ مندرجہ بالا عصری تعلیم کا سادہ سا خاکہ ہے جسے چھوٹے بڑے تمام مدارس بغیر کسی اضافی کوشش کے اپنا سکتے ہیں۔ محض عصری تعلیم کے چند اساتذہ کی ضرورت ہے۔ ویسے یہ بات یاد رکھیں! دینی مدارس کے قیام کا مقصد ماہر انجینئر، ڈاکٹر، ماہر معاشیات اور سائنس دان پیدا کرنا نہیں ہے بلکہ ایسے صاحب استعداد علماء پیدا کرنا ہے جو قرآن وحدیث اور ان سے متعلقہ علوم میں ماہرانہ بصیرت کے حامل ہوں۔

عربی زبان وادب قرآن وحدیث اور متعلقہ علوم کی حفاظت اور ان کی تدریس کے تسلسل کو

باقی رکھنا جو قرن اوّل سے قیامت تک جاری رہے گا۔ مساجد اور مدارس کے نظام کو باقی رکھنے کے لیے ائمہ وخطباء اور مدرسین مہیا کرنا۔ دعوت وارشاد کے ذریعے عوام کے دین وایمان کی حفاظت اور اعتقادی فتنوں سے بچانا۔ عوام میں جذبہ حریت وآزادی کو باقی رکھنا۔ تعلیم کے ساتھ تزکیہ وتربیت اور اتباع سنت کا اہتمام کرنا، اور اسلامی معاشرت کی حفاظت کرنا۔ علمائے دیوبند کی یہ خصوصیت ہے دینی علوم کی اعلیٰ مہارت اور وسعت مطالعہ کے ساتھ اتباع سنت، اخلاص وللہیت، انابت الی اللہ، خشیت وتقویٰ اور جذبہ خدمت میں اعلیٰ نمونہ ہیں۔ دین کے احکام کی تعبیر وتشریح میں راہ اعتدال رکھتے ہیں۔

تعلیم وتزکیہ، جہاد اور اشغال بالحدیث حنفی مسلک کی ترجیح کے ساتھ ان تین عناصر کا ربط علمائے دیوبند کا طریق عمل ہے۔ یہ اچھی بات ہے دینی مدارس کے طلبہ اس میں مہارت حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ عصری علوم میں بھی مہارت حاصل کر رہے ہیں جو ان کے روشن مستقبل کی ضمانت اور علامت ہے۔''

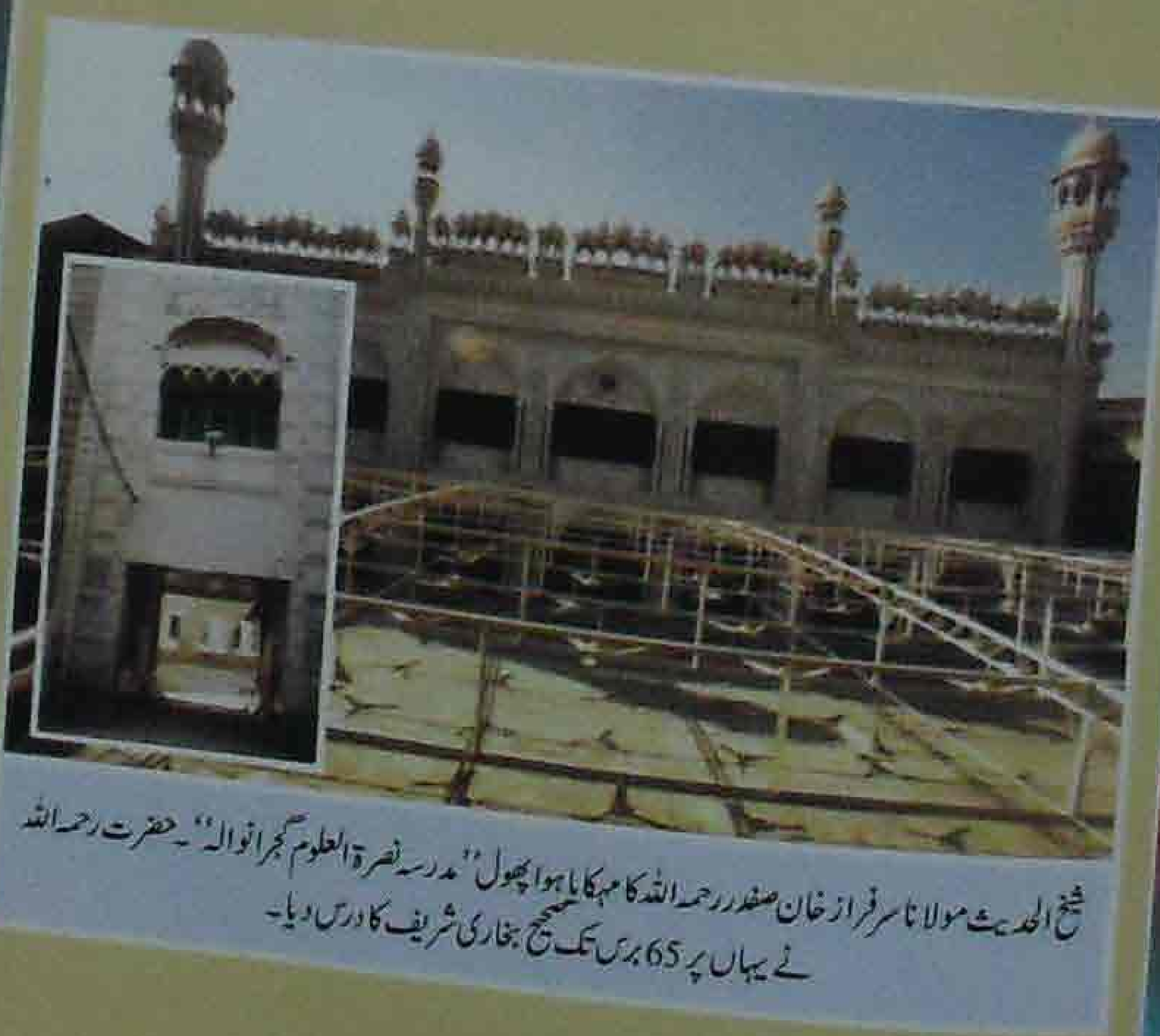
پہلی آرزو اور آخری خواہش:

میں ان کی باتیں بڑے غور سے سُن رہا تھا۔ وہ کچھ دیر کے لیے رکے اور پھر کہنے لگے: ''اللہ کی بڑی شان ہے بہت بڑی شان، کل کائنات کی سوچ سے بھی بہت بڑی شان۔ اس کا فرمان ہے: ''ہم اس قوم کی حالت نہیں بدلتے جب تک وہ خود اسے بدلنے کا ارادہ نہیں کرتی۔'' اس ارشادِ خداوندی کے پیش نظر ہمیں اپنی ہونہار اولاد...... وہ مدارس کے تمام طلبہ کو اپنی اولاد کہتے ہیں..... کا مقدر بدلنے کے لیے نصاب میں ضروری تبدیلیاں لانی ہوں گی۔ لازمی اضافے کرنے ہوں گے لیکن اس میں اتنی دیر نہیں کرنی چاہیے کہ پانی سر سے گزر جائے۔

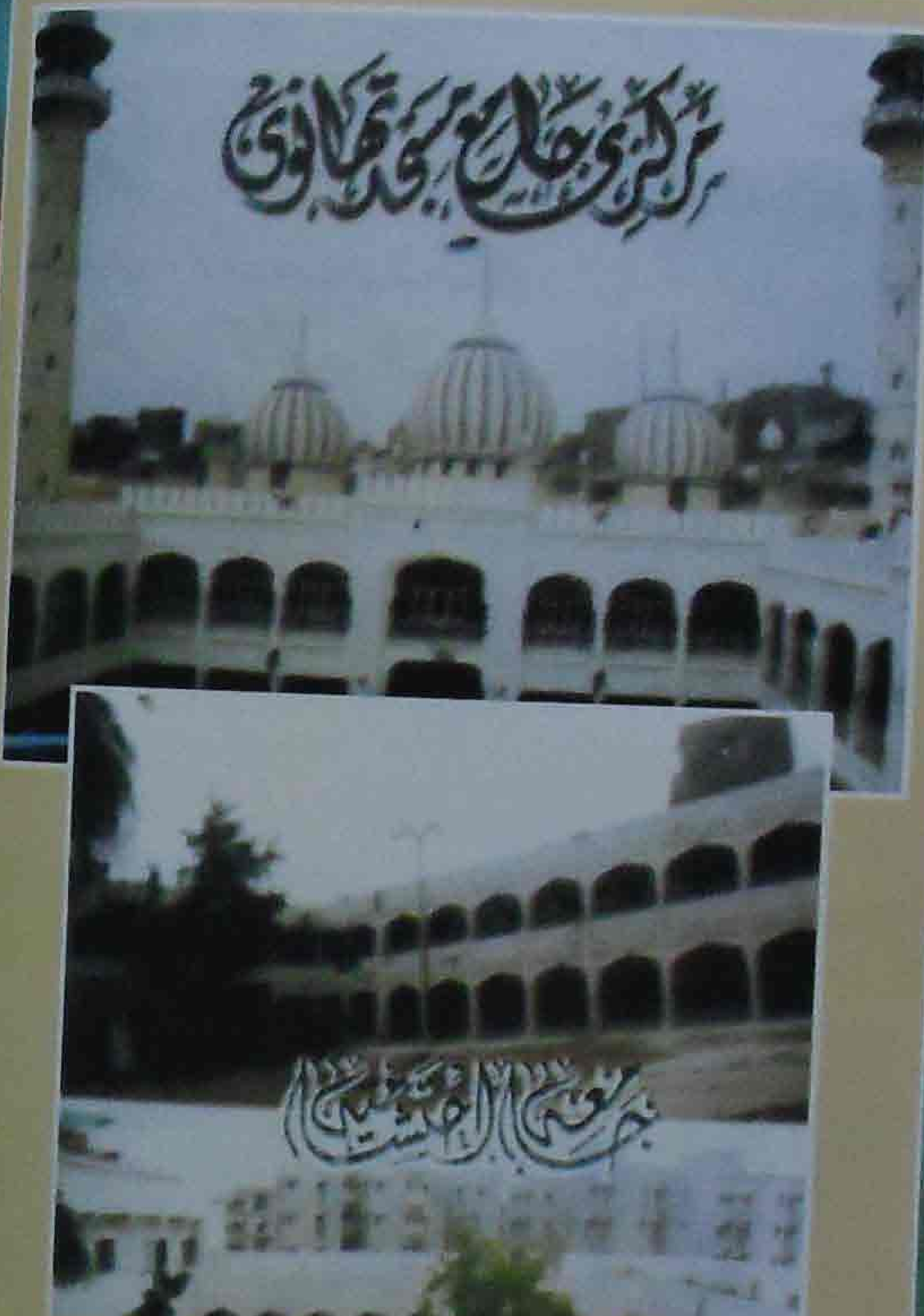
میرا 25 سالہ تجربہ یہی کہتا ہے، میرا تجزیہ اور تبصرہ یہی ہے۔ وقت کا دھارا بڑی تیزی سے بہ رہا ہے۔ اگر ہم نے دیر لگائی تو شاید زمانے کا بے رحم ہاتھ ہمیں اتنی مہلت نہ دے کہ ہم اس جدید دور میں درپیش چیلنجز کا ڈٹ کر مقابلہ کر سکیں۔ تم یہ بات اپنے ذہن کے کینوس پر لکھ لو۔ میں دلائل کے ذریعے اپنے تجزیے کو ثابت کر سکتا ہوں۔''



جامعہ دار العلوم پشاور، پختونخواہ۔ اس کے بانی مولانا فقیر محمد پشاوری رحمہ اللہ تھے۔ یہاں پر دورہ حدیث تک تمام درجوں کی تعلیم دی جاتی ہے۔



شیخ الحدیث مولانا سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ کا مہکایا ہوا پھول ''مدرسہ نصرۃ العلوم گجرانوالہ''۔ حضرت رحمہ اللہ نے یہاں پر 65 برس تک صحیح بخاری شریف کا درس دیا۔

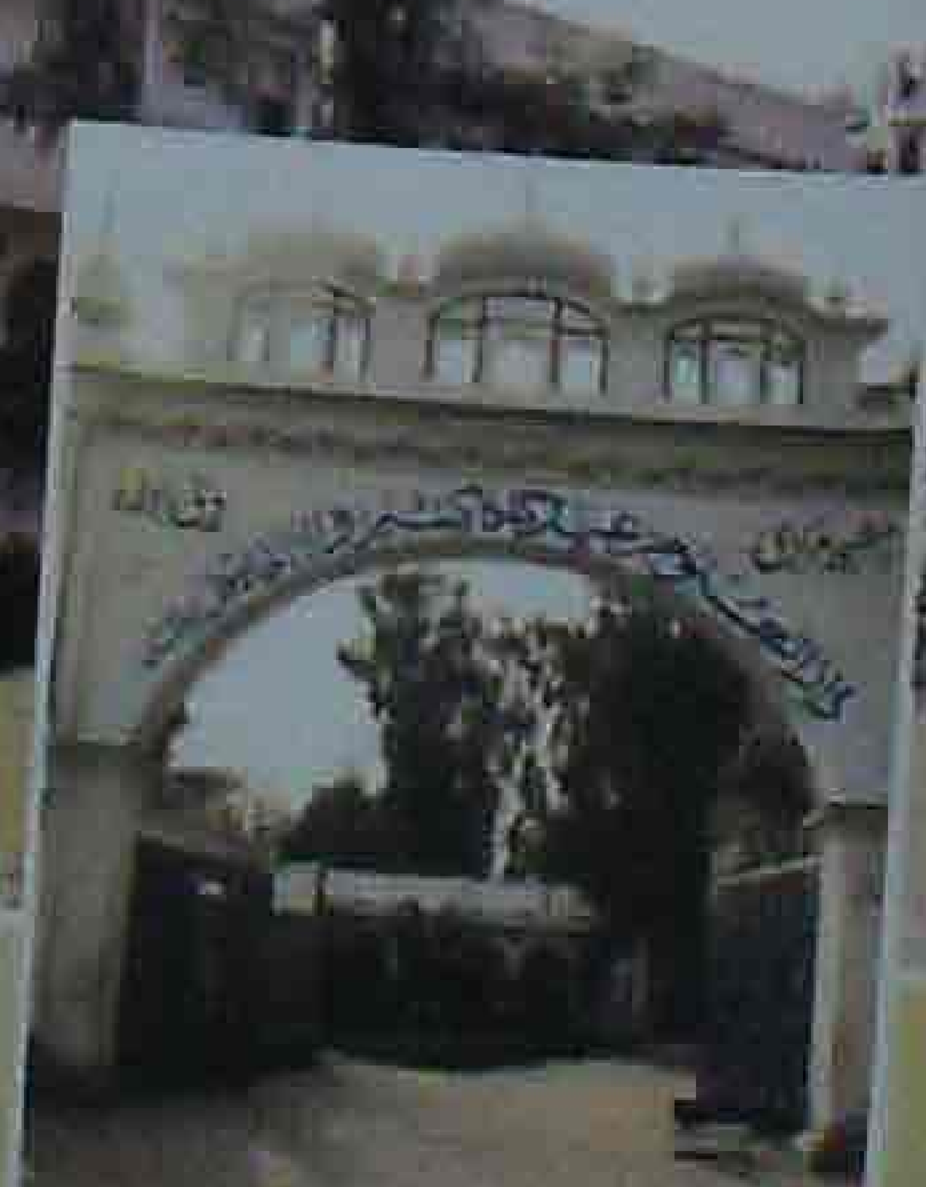


جامعہ احتشامیہ، جیکب لائن، کراچی

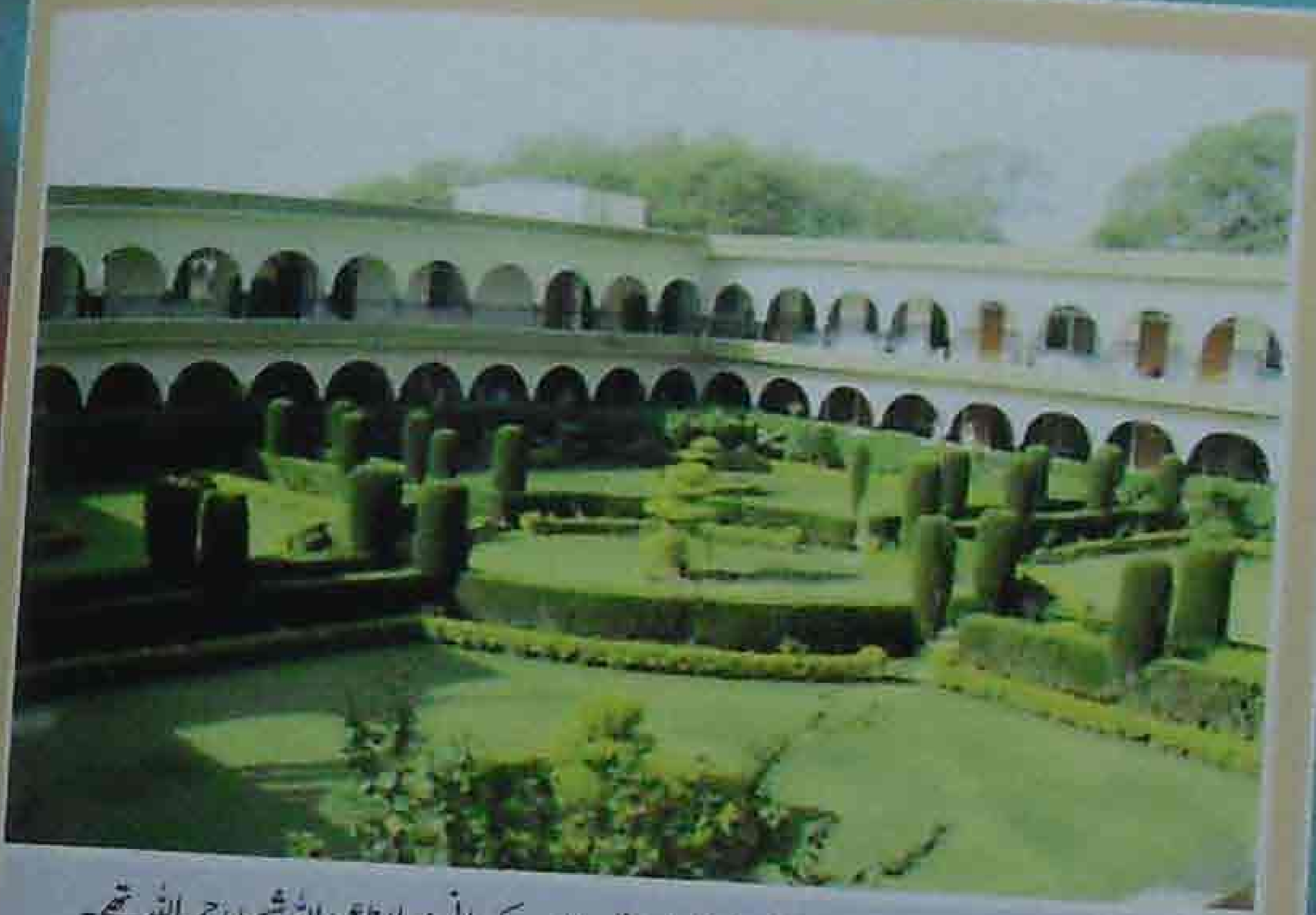


"جامعہ مدنیہ لاہور"۔ اس کے بانی مولانا سید حامد میاں رحمہ اللہ تھے۔ یہاں پر ابتدائی درجوں سے لے کر دورۂ حدیث تک تعلیم ہوتی ہے۔

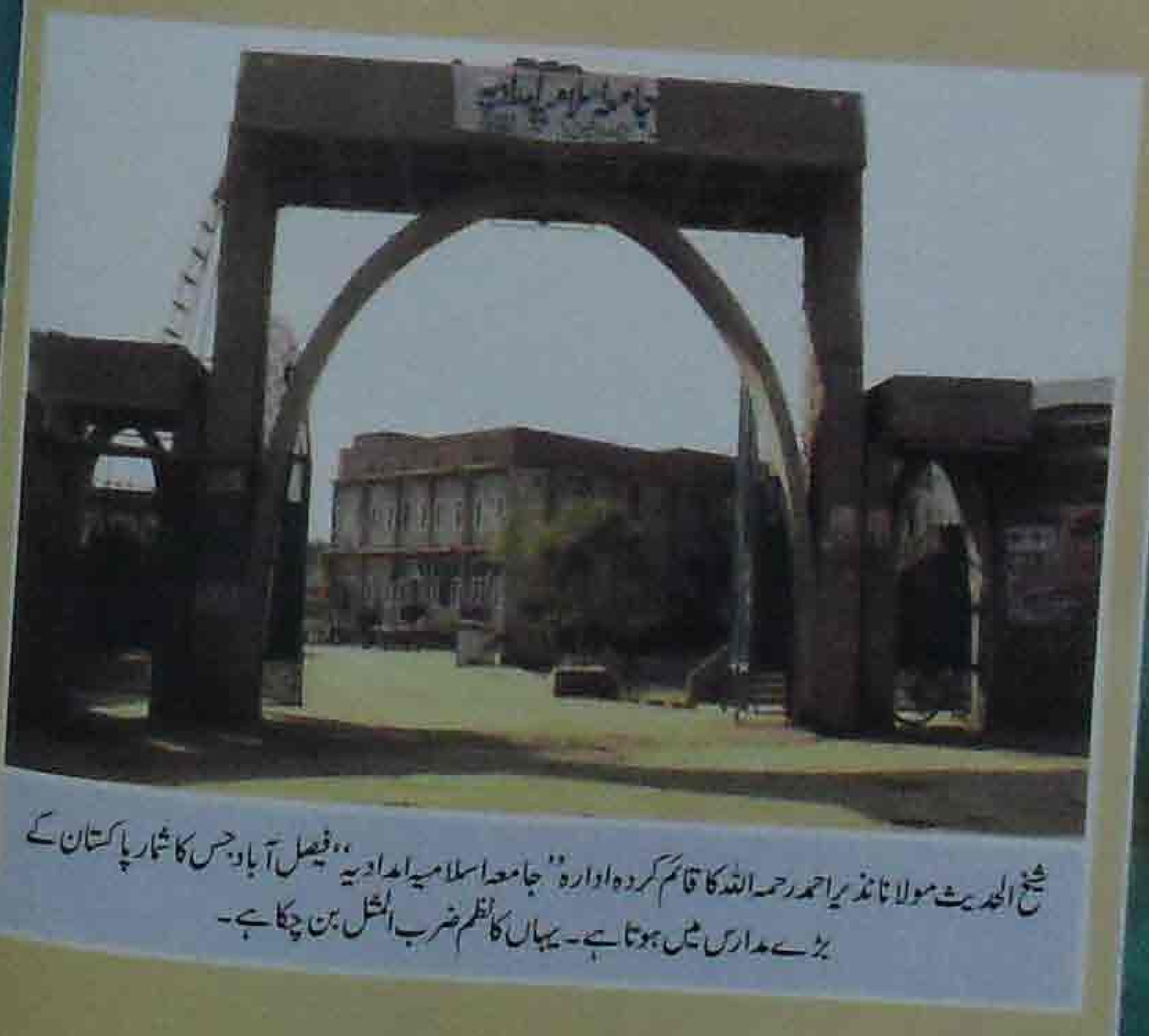




پاکستان کے مشہور ومعروف دینی درس گاہ "دار العلوم کبیر والا"۔ اس کے بانی مولانا عبدالخالق رحمہ اللہ تھے۔ یہ ادارہ پاکستان کے صفِ اول کے مدارس میں شامل ہے۔



’’جامعہ فریدیہ‘‘ ای سیون، اسلام آباد کا عمومی منظر۔ اس کے بانی مولانا عبداللہ شہید رحمہ اللہ تھے۔



شیخ الحدیث مولانا نذیر احمد رحمہ اللہ کا قائم کردہ ادارہ ’’جامعہ اسلامیہ امدادیہ‘‘ فیصل آباد جس کا شمار پاکستان کے بڑے مدارس میں ہوتا ہے۔ یہاں کا نظم ضرب المثل بن چکا ہے۔

انہوں نے پھر ایک ٹھنڈی آہ بھری، آنکھیں موندیں، پلکیں جھپکائیں اور قہوے کی آخری چسکی لیتے ہوئے پہلو بدلا اور ایک دوسرے مہمان کی طرف متوجہ ہوگئے۔ میں ان کی دینی مدارس کے لیے دور اندیش اور درد بھری باتیں نوٹ کرتا ہوا اس کے ''فقیری تھلے'' سے لوٹ آیا لیکن آج تک ان باتوں کی نمکینی مجھے یاد آتی ہے اور شاید اس وقت تک آتی رہے گی جب تک دینی مدارس کے ذمہ دار، عصرِ حاضر کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے نصاب میں ضروری اضافے نہیں کر لیتے کیونکہ اس فقیر منش باکمال شخص کا یہی دکھڑا تھا، یہی آرزو تھی اور یہی آخری خواہش بھی تھی۔

''دنیا کے سو عظیم لوگ'':

اس کے کچھ ہی عرصے بعد جامعۃ الرشید کراچی نے ایک کا نیا تعلیمی منصوبہ شروع کیا تھا۔ جب اس منصوبے کا آغاز ہوا تو ہمارے ایک دوست ''ایم وائی خان'' نے بڑا خوبصورت تجزیہ کیا تھا وہ میں ان کے شکریے کے ساتھ میں پیش کر رہا ہوں۔ ان کا کہنا تھا: ''مجھے 10 سال پہلے واشنگٹن یونیورسٹی میں جانے کا اتفاق ہوا۔ ابراہام، ماس کمیونیکیشن کا طالب علم تھا۔ وہ یونیورسٹی کی تعلیم کے بعد صحافت میں جانا چاہتا تھا۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ وہ یہودیوں کی ایک خفیہ تنظیم ''ٹارگٹ'' کا بھی رکن تھا۔ یہودیوں نے یہ تنظیم پوری دنیا میں یہودیوں کا امیج بہتر بنانے کے لیے بنائی ہے۔ یہ لوگ ٹیلی ویژن، ریڈیو، اخبارات، میگزین اور کتابوں کے ذریعے یہودیوں کا امیج بہتر بناتے ہیں۔ یہ پہلا شخص تھا جس نے مجھے اس تنظیم کے بارے میں بتایا۔ ''تم دنیا میں سب سے زیادہ بکنے والی کتابیں دیکھو، تمہیں ان کتابوں میں کوئی نہ کوئی یہودی کردار ضرور ملے گا۔ یہ یہودی کردار ہم لوگ تشکیل دیتے ہیں۔'' ''دنیا کے سو عظیم لوگ'' جیسی کتاب تک کا محرک ''ٹارگٹ'' تھی۔ میں نے اس سے حیران ہو کر پوچھا تھا: ''لیکن اس کتاب کی پہلی شخصیت تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اس کتاب میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی شامل ہیں۔ تم لوگوں نے ایسی کتاب کیوں لکھوا دی جس کا آغاز ہی پیغمبر اسلام سے ہوتا ہے۔'' اس نے مسکرا کر مجھے ماس کمیونیکیشن کی ایک تھیوری سمجھائی۔ اس تھیوری کا لب لباب تھا کسی بھی پراڈکٹ کی فروخت کے لیے اس کی اچھی ساکھ ضروری ہوتی ہے۔ اگر ہم لوگ اس کتاب میں پیغمبر اسلام اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ذکر نہ

کرتے تو اس کتاب کی کریڈیبلٹی مشکوک ہو جاتی لہٰذا ہم نے ان دونوں ہستیوں کا ذکر کر کے اس کتاب کی ساکھ قائم کر دی۔

فرض کریں:

اس کا یہ نتیجہ نکلا یہ کتاب اسلامی ممالک میں ریکارڈ تعداد میں فروخت ہوئی۔ آج تک یورپ اور امریکا میں اس کی ایک کروڑ کاپیاں فروخت ہوئی ہیں جبکہ یہ اسلامی ممالک میں ساڑھے چار کروڑ کی تعداد میں بکی ہے۔ میں نے اس سے پوچھا: ''اس کتاب سے آپ لوگوں نے کیا فائدہ حاصل کیا؟'' اس نے بتایا: ''اس کتاب میں 59 یہودی مشاہیر ہیں۔ ہم لوگوں نے مسلمانوں کی دو ہستیوں کا ذکر کر کے اپنے 59 مشاہیر کو معتبر ثابت کر دیا۔ اس کے کہنے کا مطلب تھا وہ لوگ اس طرح سائنسی پیمانے پر کام کرتے ہیں۔

واشنگٹن یونیورسٹی کا کیمپس انتہائی خوبصورت تھا۔ اس کے لان، کیفے ٹیریا، شاپنگ سینٹر، کلاس رومز، کامن رومز، لائبریری اور کانفرنس ہال ہر چیز صاف ستھری، خوبصورت اور پُر آسائش تھی۔ میں اس یونیورسٹی میں گھوم کر بہت مرعوب ہوا۔ یہ مجھے یونیورسٹی کے کامن روم میں بھی لے کر گیا۔ یہ ایک بڑا سا ہال تھا جس میں دس دس صوفوں کے بے شمار سیٹ لگے تھے۔ اس ہال کے ایک کونے میں کافی شاپ تھی۔ اسٹوڈنٹس اس کمرے میں آتے، کافی شاپ سے کافی لیتے اور اپنی پسند کے کارنر میں جا کر بیٹھ جاتے۔ اس ہال میں ایک اور انوکھی چیز تھی، اس کی دیواروں پر چاروں طرف ایک طویل نوٹس بورڈ لگا تھا۔ اس نوٹس بورڈ پر کوئی بھی طالب علم اپنی مرضی کا کوئی بھی نوٹس لگا سکتا تھا۔

فرض کریں ایک طالب علم کسی دوسرے طالب علم سے ملنا چاہتا تھا تو وہ ایک کاغذ پر طالب علم ساتھی کا نام اور ملاقات کا وقت لکھے گا اور یہ کاغذ نوٹس بورڈ پر چپکا دے گا۔ میں نے دیکھا جو بھی طالب علم کمرے میں داخل ہوتا تھا، وہ ایک سے دوسرے سرے تک نوٹس بورڈ کا جائزہ لیتا تھا۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد کوئی دوسرا کام کرتا تھا۔ اس نوٹس بورڈ پر یونیورسٹی میں موجود مختلف مذہبوں، مختلف نسلوں اور مختلف طبقۂ فکر کے طالب علموں کی تنظیموں کا لٹریچر اور ان کی میٹنگوں کا وقت اور شیڈول بھی چسپاں تھا۔ جب اس نوٹس بورڈ کا جائزہ لینا شروع کیا تو مجھے اس پر بیسیوں قسم

کی مسلمان تنظیموں کے نام اور میٹنگوں کا شیڈول نظر آیا۔ ایک امریکی یونیورسٹی میں عربی زبان دیکھ کر اور مختلف تنظیموں کے نام پڑھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔

آکسفورڈ کا نصاب:

میں نے انگلی سے عربی زبان کے ان نوٹسوں کی طرف اشارہ کیا تو اس نے کہا ''یہ وہی لوگ ہیں جو بنیادی طور پر عالم اسلام کے زوال کی وجہ ہیں۔'' مجھے اس کے نقطہ نظر پر حیرت ہوئی، اس نے کہا: ''تم مسلمان کبھی ہم یہودیوں اور عیسائیوں کی سازشوں کو پوری طرح نہیں سمجھ سکتے مائی ڈیئر فیلو۔ انسان کی زندگی کے دو ادوار بہت حساس اور اہم ہوتے ہیں۔

پہلا دور اس کا بچپن ہوتا ہے۔ بچہ اپنی زندگی کے ابتدائی سات برسوں میں جو کچھ سیکھتا ہے، وہ پوری زندگی اس کے ساتھ رہتا ہے۔ انسان کی زندگی کا دوسرا دور اس کے 20 سے 30 سال کے درمیان والے دس سال ہوتے ہیں۔ اس دور میں انسان جو کچھ سیکھتا ہے وہ باتیں، وہ چیزیں اس کی عملی زندگی کا حصہ بن جاتی ہیں۔

تم کبھی اپنی گفتگو کا تجزیہ کرو، تم کسی روز اپنی گفتگو ریکارڈ کر لو اور فرصت کے لمحوں میں تم اپنی یہ گفتگو سنو تو تم یہ دیکھ کر حیران رہ جاؤ گے، تم نے اس گفتگو میں کئی بار اپنے بچپن کا ذکر کیا یا پھر ان باتوں کا جو تم نے اپنی جوانی کے 20 سے 30 سال کے دوران سیکھی تھیں۔

تم اکثر باتوں ہی باتوں میں اپنے بچپن کے دوستوں، ساتھیوں، استاذوں اور کتابوں کا ذکر کرتے ہو۔ تم اپنے یونیورسٹی کے دوستوں، استاذوں، کتابوں اور ان لوگوں کا ذکر بھی کرتے ہو جن سے تم یونیورسٹی کے دور میں متاثر ہوئے تھے۔ بچپن کا دور ہم سب کا کردار، ہم سب کی شخصیت بناتا ہے جبکہ یونیورسٹی کا دور ہماری عملی زندگی کو بنیاد فراہم کرتا ہے۔ ہم اپنی عملی زندگی میں وہ سب کچھ کرتے ہیں جو ہم یونیورسٹی میں سیکھ کر آتے ہیں۔ پوری اسلامی دنیا کا بچپن اور جوانی ہمارے قبضے میں ہے۔''

میں نے پریشان ہو کر اس کی طرف دیکھا، اس نے بتایا: ''تم دیکھو، تم لوگوں کے ممالک میں چھوٹے بچوں کو کیا پڑھایا جاتا ہے؟ وہ کس ملک کی زبانیں پڑھتے ہیں؟ ان کا نصاب کون تیار کرتا

ہے؟ وہ کس ملک کی کہانیاں پڑھتے ہیں؟ ان کے ہیروز کون ہیں؟'' اس نے رُک کر میری طرف دیکھا، میں نے اعترافی لہجے میں جواب دیا: ''انگریزی زبان، آکسفورڈ کا نصاب اور انگریزوں کے ہیرو۔'' اس نے کہا: ''تم پھر دیکھ لو تمہارے بچے بچپن میں کیا سیکھتے ہیں؟''

قابلِ فخر باتیں:

اگر تم امریکا اور یورپ کی تمام بڑی یونیورسٹیوں کا پروفائل نکال کر دیکھو تو یہ معلوم کر کے تمہیں حیرت ہوگی ہماری یونیورسٹیوں کے دس فیصد طالب علموں کا تعلق اسلامی ممالک سے ہوتا ہے۔ یہ طالب علم ہماری یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ یہاں سے پڑھ کر واپس جاتے ہیں اور وہاں جاکر تمہارے ملکوں پر حکومت کرتے ہیں۔ اب تم خود بتاؤ تمہارے ملکوں کے حکمران طبقے کی ذہنیت کیا ہوگی؟ وہ اپنے اپنے ملک پر کن اصولوں اور کن ضابطوں کے تحت حکومت کریں گے؟'' وہ خاموش ہو گیا۔

میں نے جواب دیا: ''ظاہر ہے تمہارے دیے ہوئے اصولوں اور ضابطوں کے مطابق۔''

اس نے کہا: ''دیکھو! میں تمہیں ایک پتے کی بات بتاتا ہوں، وہ کبھی فکری اور نظریاتی لحاظ سے آزاد نہیں ہو سکتے جن کے بچے دوسرے ملکوں کے دیے نصاب پڑھتے ہوں اور جن کے جوان دوسرے ملکوں کی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرتے ہوں۔ جب تک اسلامی ممالک کے بچے انگریزی زبان اور انگریزی نصاب پڑھتے رہیں گے۔ جب تک اسلامی ممالک کے نوجوان ہماری یونیورسٹیوں میں داخلے لیتے رہیں گے ہمیں عالم اسلام سے کوئی خطرہ نہیں۔''

میں اکثر سوچا کرتا تھا کیا کبھی اس ملک میں کوئی ایسا ادارہ ہوگا جو چھوٹے بچوں اور عملی زندگی کے دروازے پر کھڑے رہنمائی کر سکے، جوان کے لیے نصاب تیار کر سکے، جوان کی تعلیم و تربیت کا بندوبست کر سکے۔ میں دس سال تک ایسا ادارہ تلاش کرتا رہا لیکن مجھے کوئی ایسا ادارہ نہیں ملا۔ چند سال پہلے مجھے میرے ایک دوست نے ''جامعۃ الرشید'' کے ''کلیۃ الشریعۃ'' کا لٹریچر لا کر دیا۔ یہ لٹریچر پوسٹ گریجویشن کورس کے بارے میں تھا۔ بڑی تفصیل سے اس کا مطالعہ کیا۔ مجھے یہ معلوم کر کے بڑی حیرت ہوئی جامعۃ الرشید بی اے، بی ایس سی اور بی کام کے ڈگری ہولڈرز

نوجوانوں کو دینی علوم کا چار سالہ پوسٹ گریجویشن کورس کرا رہا ہے۔ یہ معلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی ادارہ اپنے طالب علموں کو تمام اسلامی علوم عربی اور اُردو کے ساتھ انگریزی میں بھی پڑھاتا ہے۔ یہ ایک بہت ہی قابلِ فخر بات تھی۔

اس کا کیمپس بھی کسی جدید ترین یونیورسٹی سے کم نہیں۔ یہ کسی بھی بین الاقوامی کنٹری سائیڈ ٹریننگ ریزارٹ سے کم نہیں۔ شہر کے ہنگاموں سے دور صاف ستھرا پاکیزہ ماحول مگر دینی فضا، وہی جدید سہولتوں سے آراستہ رہائشی وتدریسی عمارات اور وسیع وعریض سبزہ زار۔ جاذب نظر مثالی ہارٹی کلچر۔ وہی جدید سوئمنگ پول اور وسیع وعریض کھیل کا میدان۔ وہی کینٹین کی سہولت، وہی ڈسپنسری۔ ڈاکٹر اور فوری طبی امداد کا ہمہ وقت انتظام۔ وہی روشن کشادہ اقامت گاہیں۔ وہی ٹیلی فون، فیکس، انٹرنیٹ اور فوٹو کاپی کی سہولتیں۔ وہی اسٹینڈ بائی جنریٹر، پینے کے لیے فلٹرڈ پانی اور موسم کے لحاظ سے گرم اور ٹھنڈے پانی کا انتظام۔ وہی کتب خانہ، آڈیو ویژول ایڈز، وہی ملٹی میڈیا اور اس کے ساتھ ساتھ قیام وطعام کی مفت سہولیات بھی۔ یہ ساری چیزیں اس کیمپس کو یورپ کی بڑی بڑی یونیورسٹیوں کے کیمپسوں سے ممتاز کرتی ہیں۔

فرق واضح ہے:

گزشتہ سال ہمارے ادارے نے ایک ''مذاکرے'' کا اہتمام کیا۔ اس کا موضوع تھا ''ڈسکشن اباؤٹ گلوبلائزیشن'' (Discussion About Globalization) جس میں ماہرینِ معیشت، قانون دان، ماہرینِ فلکیات، دانشور، علماء، صحافی، اسپیشل کورسز کے اسٹوڈنٹس اور دیگر مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والی شخصیات نے شرکت کی۔ مقررین میں سے کسی نے ''ملٹی نیشنل کمپنیوں کے اثرات سے کس طرح ہر شخص متاثر ہوتا ہے؟'' پر تبصرہ کیا تو کسی نے عالمگیریت پر سیر حاصل گفتگو کی اور آخر میں سوال وجواب کی دلچسپ نشست بھی ہوئی۔

ایک مقرر نے کہا: ''آج جنگ کا فلسفہ تبدیل ہو چکا ہے۔ اب جنگ معیشت کے میدانوں میں لڑی جا رہی ہے لہٰذا کسی ملک وملت کی بقاء کا انحصار اس کی اقتصادی حیثیت اور معاشی ترقی پر ہے۔ جس ملک کی معیشت جتنی مضبوط ہوگی اس کی حکومت اندرونی وبیرونی طور پر اتنی ہی مستحکم

ہوگی جس کی اقتصادی طاقت کمزور ہے وہ سمجھ لے کہ اس کی بقاء کی اہمیت کو تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''کاد الفقران یکون کفراً.'' ''فقر و فاقہ کفر کا سبب بن سکتا ہے۔'' اس لیے تجارت ضروری ہے تاکہ معاشی و اقتصادی حالت بہتر اور اچھی ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی بڑی بڑی تجارتیں ہوتی تھیں..... نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی تجارت کی ہے۔ دو دفعہ تجارت کی خاطر بیرون ملک بھی سفر کیا۔

مہمانِ خصوصی جو ایک بڑے ادارے کے سربراہ بھی ہیں اور ماہرِ معیشت بھی، انہوں نے اپنے خطاب میں سب سے زیادہ زور اس بات پر دیا اداروں کو مضبوط کرنا چاہیے۔ اگر ادارے مضبوط ہوں تو پھر ہر مشکل کا حل کسی نہ کسی طریقے سے نکل آتا ہے۔

اس کی واضح مثال یہ ہے 2001ء میں جب صدر بش نے پاکستانی صدر کو فون کرکے پوچھا بتاؤ افغانستان کے معاملے میں ہمارا ساتھ دیتے ہو یا نہیں؟ تو صدر کو اسی وقت جواب دینا پڑا چونکہ اس وقت ہمارا جمہوری ادارہ مضبوط نہیں تھا بلکہ جمہوریت نہیں تھی اور ملک پر فردِ واحد کی حکمرانی تھی، اس لیے صدر مشرف نے ایک ایسا فیصلہ کر ڈالا جس کے ذریعے افغانستان میں طالبان کی اسلامی حکومت ختم ہوگئی اور ہزاروں لاکھوں لوگوں کے قتل میں ہم برابر کے شریک ہوگئے۔

ایک دلچسپ جواب:

اس کے برعکس 2004ء میں جب عراق کے معاملے میں صدر بش نے ترکی کے صدر کو فون کرکے کہا ہماری فوجیں ترکی کے راستے عراق میں داخل ہونا چاہتی ہیں۔ اس کی اجازت چاہیے تو اس وقت ترکی کے صدر نے کہا ٹھیک ہے لیکن کل ہم یہ معاملہ پارلیمنٹ میں پیش کریں گے۔ اگر ہماری شوریٰ نے اجازت دے دی تو ٹھیک ہے ورنہ معذرت۔ چنانچہ اس فیصلے کو پارلیمنٹ نے مسترد کرتے ہوئے اجازت نہیں دی حالانکہ اس وقت صرف راستے کے عوض ترکی کو بھاری بھرکم رقم کی پیشکش بھی کی گئی تھی۔ یہ فرق ہوتا ہے اداروں کے مضبوط اور کمزور ہونے کا۔

دوسری مثال یہ ہے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے مدینہ ہجرت کرکے تشریف لائے تو سب سے پہلے ''مسجدِ نبوی'' کی شکل میں ادارہ قائم کیا۔ سوایسی شخصیات جنھوں نے دنیا میں عظیم

انقلاب برپا کیا اور انسانیت کے لیے کار آمد ثابت ہوئی ہیں، ان میں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر اعتبار سے مثالی ہونے کی وجہ سے پہلا نمبر دیا گیا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تیسرے نمبر پر رکھا ہے باوجود اس کے کہ اس کا کتاب مصنف خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا پیروکار ہے۔

تیسری مثال یہ ہے آج دنیا میں ایک ارب 30 کروڑ سے زائد مسلمان آباد ہیں اور تمام کے تمام سود کو حرام سمجھتے ہیں لیکن اس کے باوجود سود کھانے پر مجبور ہیں کیونکہ ہمارے پاس کوئی ایسا مضبوط ادارہ نہیں ہے جو سود سے پاک صاف طریقے کی رہنمائی کرے۔ یہ ادارے نہ ہونے یا کمزور ہونے کی وجہ سے ہے اس لیے اداروں کو مضبوط کرنے کی نہایت ضرورت ہے۔

ایک دوست نے پوچھا: ''علمائے کرام دینی مسائل اور احکام میں تو رہنمائی کر سکتے ہیں لیکن یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک عالم تاجر بھی بن جائے۔ ایک ہی شخص فیکٹری کا منیجر بھی ہو، بینکار بھی ہو، انجینئر بھی ہو، ڈاکٹر بھی..... اور عالم دین بھی..... اتنے شعبے کوئی کیسے سنبھال سکتا ہے؟''

جواب بڑا دلچسپ تھا وہ عالم دین کچھ بھی نہ ہو لیکن وہ ان سب معاملات کی معلومات تو ضرور رکھتا ہو کیونکہ معلومات کے بغیر وہ رہنمائی کس طرح کر سکتا ہے؟ آج اگر کوئی شخص سوال پوچھتا ہے حکومت کی ''بیمہ پالیسی'' میں حصہ لیا جاسکتا ہے یا نہیں شریعت اس بارے میں کیا کہتی ہے؟ اگر عالم دین کو بیمہ اور اس کی مروّجہ صورتوں کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تو آپ بتائیں وہ کس طرح جواب دے سکتا ہے؟ وہ کس طرح اس کو مطمئن کر سکتا ہے؟ وہ کس طرح اس کو حرام سے روک سکتا ہے؟

قوم کی حالت کب بدلتی ہے؟

فقہ حنفی کو مرتب کرنے والے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے جلیل القدر شاگرد حضرت امام محمد رحمہ اللہ نے فرمایا: ''من لم یعرف اھل زمانہ فھو جاھل.'' جو شخص اپنے زمانے کے لوگوں کے مزاج وطریق کار سے واقف نہیں وہ جاہل ہے۔ چنانچہ عوام کی رہنمائی کے لیے کم از کم جدید دور کی ٹیکنالوجی اور علوم آلیہ سے اتنی واقفیت ضرور حاصل کرنا ہوگی جو عصرِ حاضر میں دین کی تفہیم وتشریح کے لیے فرض کے درجے میں آتی ہے۔

علماء کو گلوبلائزیشن کے چیلنجز کا مقابلہ کے لیے جدید دور کے طور طریقے سیکھنے ہوں گے۔ اللہ

تعالیٰ کا فرمان ہے: ''ہم اس وقت تک کسی قوم کی حالت نہیں بدلتے جب تک وہ خود اسے بدلنے کا ارادہ نہیں کر لیتی۔'' اس ارشادِ خداوندی کے پیش نظر بھی عالمگیریت کے دور کی نئی نئی اصطلاحات کو سمجھنا ہوگا یا پھر ایسے اجنبی جزیرے کا انتخاب کرنا ہوگا جو اس دنیا سے الگ تھلگ ہو، جہاں کسی کی پہنچ نہ ہو، جہاں کوئی اور نہ ہو۔

ہمارے ایک نقاد دوست کا کہنا ہے: دینی مدارس پرانے ہو چکے ہیں، ان میں چودہ سو سال پرانی تعلیم دی جاتی ہے۔ ان کا نصاب پرانا ہے۔ ان کی کتابیں پرانی ہیں۔ ان کی گرائمر اور زبانیں پرانی ہیں۔ ان میں دی جانے والی تعلیم کا اسٹائل پرانا ہے۔ ان کے اساتذہ پرانے ذہنوں اور پرانے خیالات کے مالک ہیں۔ ان میں دی جانے والی تعلیم کا طریقہ فرسودہ اور قدیم ہے۔ ان کے لباس، ان کی روایات، ان کے خیالات، ان کی زبان اور ان کا طرزِ معاشرت قدیم ہے۔ یہ مدرسے آج کے عصری تقاضے پورے نہیں کرتے لہٰذا انہیں بند کر دینا چاہیے یا پھر انہیں جدید شکل دے دی جائے۔ ان کے طالب علموں کو پتلون اور کوٹ پہنائے جائیں، انہیں میز اور کرسی پر بٹھایا جائے، انہیں انگریزی میں تعلیم دی جائے۔ انہیں چمچ اور کانٹے سے کھانے کا طریقہ سکھایا جائے اور انہیں تعلیم کے ساتھ ساتھ میوزک کی تربیت بھی دی جائے۔

میں نے اس کی ساری باتیں سنیں اور اس کے بعد تاریخ کے اوراق پلٹتے ہوئے اس سے عرض کیا: تمہاری ساری باتیں غلط ہیں۔ تمہیں شاید یہ معلوم نہیں دنیا میں پہلا مذہبی مدرسہ یہودیوں نے بنایا تھا۔ حضرت یوسف علیہ السلام جب مصر کے تخت پر جلوہ افروز ہوئے اور ان کے تمام بھائی کنعان سے مصر منتقل ہوئے تو ان کے بھائیوں میں سے ایک بھائی کی اولاد نے تعلیم و تربیت کو اپنا روزگار بنا لیا۔ ان لوگوں نے مصر میں مذہبی تربیت کا ایک مدرسہ قائم کیا، یہ لوگ ان مدرسوں میں علمائے کرام پیدا کرتے تھے۔ یہ علمائے کرام ان مدارس سے فارغ ہونے کے بعد لوگوں میں تبلیغ کرتے تھے۔ انہیں مذہبی شعائر سکھاتے تھے۔ یہ سلسلہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور تک قائم رہا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے بہت پہلے مصر کے یہودیوں پر برا وقت آ چکا تھا۔

مہذب دنیا اور طالبان:

یہ لوگ بری طرح فرعون کے ظلم کا شکار تھے۔ فرعون نے ان کی عبادت گاہیں اور مدارس تباہ و برباد کر دیے تھے لیکن اس کے باوجود یہ لوگ چھپ چھپا کر اپنی تعلیمات کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب اپنی قوم کو لے کر مصر سے نکلے تو مدارس اور ان میں دی جانے والی تعلیمات کا یہ سلسلہ بھی مصر سے باہر آ گیا۔ یہ لوگ جب فلسطین پہنچے تو انہوں نے آج سے ساڑھے چار ہزار سال پہلے بیت المقدس میں باقاعدہ مدرسہ قائم کیا۔ یہ مدرسہ یہودیوں نے قائم کیا تھا۔

اس وقت یہ قانون پاس ہوا تھا دنیا کے جس کونے میں یہودیوں کی عبادت گاہ بنے گی وہاں یہودی تعلیمات کا مدرسہ بھی قائم ہو گا چنانچہ ساڑھے چار ہزار سال گزرنے کے باوجود آج تک دنیا کے جس کونے میں "سینی گاگ" بنتا ہے وہاں یہودیوں کا مدرسہ بھی قائم ہوتا ہے۔ دنیا میں 99 فیصد ایسی مساجد ملیں گی جو محض مساجد ہیں اور ان میں کوئی مدرسہ نہیں، مساجد میں زیادہ سے زیادہ امام مسجد یا اس کا کوئی ساتھی صبح کے وقت چھوٹے بچوں کو ناظرہ قرآن کی تعلیم دیتا ہوا ملے گا، لیکن آپ کو دنیا میں کوئی ایسا سینی گاگ نہیں ملے گا جس میں باقاعدہ اسکول موجود نہ ہو اور اس میں بچوں کو یہودیت کی باقاعدہ تعلیم نہ دی جاتی ہو۔ دنیا کے سو فیصد سینی گاگ میں مذہبی اسکول موجود ہیں جبکہ پچاس فیصد سینی گاگ یہودیوں کو عالم اور فاضل بننے کی تعلیم دیتے ہیں۔

دوسرا پچھلے ساڑھے چار ہزار سال سے دنیا کے تمام سینی گاگ میں ایک ہی نصاب پڑھایا جا رہا ہے۔ تمام سینی گاگ طالب علموں کو عبرانی زبان کی تعلیم دیتے ہیں۔ ان کا سلیبس، ان کی کتابیں، ان کی گرامر، ان کی زبان اور ان کی ثقافت ہر چیز پرانی اور قدیم ہے۔ ان کے اساتذہ اپنے نظریات میں کٹر اور متشدد واقع ہوئے ہیں۔ ان کا حلیہ ساڑھے چار ہزار سال پرانا ہے، یہ لوگ ساڑھے چار ہزار سال سے سیاہ گاؤن، سیاہ کوٹ یا سیاہ عبا پہن رہے ہیں۔ یہ لوگ ساڑھے چار ہزار سال سے سر ڈھانپتے چلے آ رہے ہیں۔

ہم مسلمان کروشیے سے بنی جو ٹوپی استعمال کرتے ہیں یہ ٹوپی یہودیوں کی ایجاد ہے، یہودیوں اور مسلمانوں کی اس ٹوپی میں صرف رنگ کا فرق ہے۔ یہودی سیاہ رنگ جبکہ مسلمان

سفید اور دوسرے رنگوں کی ٹوپیاں استعمال کرتے ہیں۔ دنیا میں ہیٹ یہودیوں نے ایجاد کیا تھا، ان کے مذہبی رہنما سیاہ رنگ کا ہیٹ سر پر رکھتے تھے۔ ان کی دیکھا دیکھی یہ ہیٹ دوسرے لوگوں نے استعمال کرنا شروع کر دیا۔

آج بھی آپ یہودیوں کی کسی بستی میں چلے جائیں آپ کو وہاں کے نوے فیصد مردوں کے سروں پر سیاہ ہیٹ ملے گا۔ دنیا میں یہودی پہلی قوم تھی جس نے داڑھی کو مذہبی فریضہ بنایا۔ آج آپ دنیا کے کسی کونے میں چلے جائیں آپ کو 90 فیصد یہودی باریش ملیں گے۔

تسبیح یونانیوں نے ایجاد کی تھی لیکن اس کا باقاعدہ استعمال یہودیوں نے کیا تھا۔ ان کے کھانے پکانے کا اسٹائل، دستر خوان، شادی بیاہ کی رسمیں، مردے دفن کرنے کا طریقہ، حلیہ، تعلیمی نظام، عادتیں، رونا دھونا، لڑائی جھگڑے اور تعلقات کی نوعیت ہر چیز تین ساڑھے تین ہزار سال قدیم ہے لیکن دنیا کا کوئی شخص ان کے حلیے پر اعتراض کرتا ہے، ان کے مدارس پر انگلی اٹھاتا ہے اور نہ ہی انہیں برا بھلا کہتا ہے۔

آج تک دنیا کے کسی جدید اور ماڈرن دانشور نے یہودیوں کو یہ مشورہ نہیں دیا آپ اپنے مدرسوں کو ماڈرن کر دیں۔ آپ ان کا ساڑھے تین ہزار سالہ پرانا سلیبس، کتابیں اور زبان تبدیل کر دیں، آپ اپنے "طالبان" کا حلیہ اور عادتیں بدل دیں۔ آج تک کسی نے ان کے مدرسوں کو فرسودہ اور پرانا نہیں کہا جبکہ یہ دنیا کے قدیم ترین مدارس ہیں۔"

چند قدم اور آگے:

وہ میری بات سن کر خاموش ہو گیا، میں نے اس سے کہا: "اب تم عیسائیوں کی طرف آؤ، تم دنیا کے تمام چرچوں کا دورہ کرو، تمہیں ہر چرچ کے ساتھ ایک مدرسہ ملے گا، مدارس کی یہ روایت دو ہزار سال پرانی ہے۔ ویٹی کن سٹی میں 18 سو سال پہلے مدرسہ بنا تھا، وہ مدرسہ آج تک قائم ہے۔ عیسائی یہودیوں سے دو قدم آگے ہیں۔ ان کے مشنری دنیا کے جس کونے میں گئے وہاں انہوں نے 3 قسم کے ادارے قائم کیے۔

ایک مذہبی مدارس، یہ ادارے چرچ کے ساتھ وابستہ ہوتے تھے اور ان کا سلیبس، ان کی

کتابیں، ان کے اساتذہ اور تعلیم دینے کا انداز تک سنٹرل چرچ طے کرتا تھا اور یہ ساری چیزیں دو ہزار سال پرانی ہیں۔ دوسرا یہ لوگ عام لوگوں کے لیے جنرل اسکولز بناتے تھے۔ یہ اسکولز کیتھڈرل، سینٹ جوزف یا سینٹ میری کے نام سے قائم کیے جاتے تھے۔ ان کے پرنسپل اور اساتذہ پادری ہوتے تھے اور ان میں دنیاوی تعلیم کی آڑ میں عیسائیت کی تعلیم دی جاتی تھی۔

ان تمام اسکولز کے اندر ایک چھوٹا سا چرچ ہوتا تھا جس میں تمام مذاہب کے بچوں کو لے جایا جاتا تھا اور ان کے سامنے عیسائی دعائیں پڑھی جاتی تھیں۔ یہ اسکول بھارت اور پاکستان سمیت دنیا کے ان تمام علاقوں میں آج تک موجود ہیں جو مغربی ممالک کی کالونی رہے ہیں اور تیسرا یہ لوگ ان علاقوں میں ہسپتال بنایا کرتے تھے۔ ان ہسپتالوں کا عملہ بھی چرچ سے متعلق ہوتا تھا۔ ان ہسپتالوں کے سپرنٹنڈنٹ عام طور پر پادری ہوتے تھے۔ آپ دنیا کے کسی ہسپتال میں چلے جائیں آپ دیکھیں گے وہاں لوگ نرس کو ''سسٹر'' کہہ کر بلا رہے ہوں گے۔

نرس کو سسٹر کیوں کہا جاتا ہے؟ اس کا پس منظر بھی بہت دلچسپ ہے۔ عیسائیت میں پادری کو فادر اور نن کو سسٹر کہا جاتا ہے۔ دنیا میں ہسپتالوں کا انسٹی ٹیوٹ چرچ نے قائم کیا تھا لہٰذا شروع شروع میں کلیسا کے مالکان تمام ننوں کو نرسنگ کی ٹریننگ دے کر انہیں ہسپتال بھجوا دیا کرتے تھے۔ یہ دس سے پندرہ سال تک ہسپتال میں مریضوں کی خدمت کرتی تھیں۔ یہ خواتین نن ہوتی تھیں چنانچہ مریض اور ان کے لواحقین انہیں سسٹر کہہ کر بلاتے تھے۔ یہ عمل اس قدر آگے بڑھ گیا کہ آج دنیا کی تمام نرسوں کو ''سسٹر'' کہا جاتا ہے۔ اسی طرح 1950ء تک ہسپتالوں میں ڈاکٹروں کو فادر کہا جاتا تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ شروع شروع میں پادری ہی ڈاکٹر ہوتے تھے۔

اسی طرح ہسپتالوں کا سارا عملہ سفید کوٹ پہنتا ہے۔ یہ سفید کوٹ پادریوں کی باقیات میں سے ہے۔ دنیا کے تمام ''فادر'' سفید گاؤن، سفید کوٹ یا سفید اچکن پہنتے ہیں۔ یہ لوگ جب چرچ میں ہوتے تھے تو کوٹ یا گاؤن کے بٹن بند رکھتے تھے لیکن جب چرچ سے نکل کر ہسپتال یا اسکول میں داخل ہوتے تھے تو یہ کوٹ کے بٹن کھول دیتے تھے۔ یہ کوٹ آہستہ آہستہ ہسپتالوں کی زندگی کا حصہ بن گئے لہٰذا کہنے کا مطلب ہے عیسائی چرچ، مدارس اور مذہبی تعلیمات کے معاملے میں

یہودیوں سے چند قدم آگے نکل آیا اور اس نے اپنی تعلیمات کو معاشرے کا باقاعدہ حصہ بنا دیا۔

مدارس میں یہ چیزیں رائج کیوں نہیں؟

اگر ہم عیسائیت کی دو ہزار سالہ تاریخ نکال کر دیکھیں تو پتا چلے گا ان دو ہزار برسوں میں چرچ کے ماحول، زبان، ثقافت، سلیبس اور کتابوں میں کوئی فرق نہیں آیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کھردری لکڑی کی میز اور کرسی استعمال کرتے تھے لہٰذا آج تک کلیساؤں میں کھردری لکڑی کی میزیں اور تختوں والی سخت کرسیاں پڑی ہیں اور تو اور آپ آمش لوگوں کی ثقافت دیکھ لیں: آمش لوگ 2 سو سال پہلے یورپ سے امریکا پہنچے، یہ لوگ امریکا میں رہ رہے ہیں لیکن ان کا طرز رہائش، بود و باش قدیم عیسائیوں جیسا ہے۔

یہ لوگ بجلی استعمال نہیں کرتے۔ ڈاڑھی رکھتے ہیں۔ سر ڈھانپ کر رکھتے ہیں۔ ان کی خواتین پورا جسم پوشیدہ رکھتی ہیں۔ ان لوگوں نے آج تک اپنے دیہات میں سڑک نہیں بننے دی۔ یہ لوگ موٹر گاڑیاں استعمال نہیں کرتے۔ شراب نہیں پیتے۔ جوا نہیں کھیلتے۔ سور نہیں کھاتے۔ مٹی کے برتنوں میں کھانا کھاتے ہیں۔ کھیتی باڑی کرتے ہیں اور اپنے بچوں کو روایتی طریقے سے تعلیم دیتے ہیں لیکن دنیا نے آج تک یورپ اور امریکا کے چرچوں پر انگلی اٹھائی اور نہ ہی آمش لوگوں کی روایات پر۔ لہٰذا مجھے سمجھ نہیں آتی دنیا کو یہودیوں کے مدارس بھی قبول ہیں اور اسے عیسائیوں کے مدارس پر بھی کوئی اعتراض نہیں لیکن مسلمانوں کے مدارس پوری دنیا کو تکلیف دے رہے ہیں۔

پوری دنیا ان کے مدارس کا کلچر اور سلیبس بدلنا چاہتی ہے۔ آج تک دنیا کے کسی دانشور نے یہودیوں اور عیسائیوں کو نہیں کہا: ''تم لوگ اپنی زبان، سلیبس اور مدارس تبدیل کرو۔'' انہیں کسی نے نہیں کہا: ''تم لوگ پرانی کتابیں پڑھانا بند کردو۔'' مجھے سمجھ نہیں آتی ایسا کیوں ہے؟

تم پوری دنیا گھوم کر دیکھو اور پھر مجھے بتاؤ کیا یہودیوں کے کسی سینی گاگ میں قائم کسی مدرسے میں کمپیوٹر، ملٹی میڈیا اور انگریزی زبان موجود ہے؟ تمہیں یہ جان کر حیرت ہوگی دنیا کے کسی یہودی مدرسے میں یہ ماڈرن آلات موجود نہیں ہیں۔ اسی طرح تم ویٹی کن سٹی سے لے کر لاہور کے کیتھڈرل تک جاؤ تمہیں یہ جان کر حیرت ہوگی دنیا کے کسی چرچ کے کسی مدرسے میں کمپیوٹر اور ملٹی

میڈیا نہیں لہٰذا پھر سوال پیدا ہوتا ہے اعتراض کرنے والے لوگ پہلے ان مدارس میں یہ چیزیں رائج کیوں نہیں کرتے؟ وہ وہاں یہ کلچر پیدا کیوں نہیں کرتے؟''

ایکشن ری ایکشن:

میرے نقاد دوست کے پاس میرے اس اعتراض کا کوئی جواب نہیں تھا۔ میں نے اس سے کہا: ''اگر تم مدارس کی تاریخ میں مسلم مدارس کی درجہ بندی کرو تو تمہیں یہ مدارس ماڈرن اور تازہ ملیں گے۔ یہودیوں کے مدارس اور ان میں دی جانے والی تعلیم ساڑھے تین سے ساڑھے چار ہزار سال پرانی ہے۔ عیسائی مدارس 2 ہزار سال سے قائم ہیں جبکہ مسلمانوں کے مدارس کو قائم ہوئے ابھی محض 14 سو سال ہوئے ہیں گویا یہ مدارس تازہ ترین بھی ہیں اور ماڈرن بھی۔''

اس نے ہنس کر پوچھا: ''لیکن پھر مسئلہ کیا ہے؟'' میں نے جواب دیا: ''مسئلہ مدارس کی تعداد اور مسلمانوں کا ایمان ہے۔ یہودیوں اور عیسائیوں کے مدارس اور ان میں تعلیم پانے والے طالب علموں کی تعداد میں اضافہ نہیں ہوا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ مسلمانوں کے مدارس بھی بڑھے ہیں اور ان کے طالب علم بھی۔

آج سے چودہ سو سال پہلے مسجد نبوی کے ایک چھوٹے سے چبوترے سے ان مدارس کا آغاز ہوا اور آج عالمِ اسلام میں لاکھوں کی تعداد میں ایسے چبوترے اور مدرسے موجود ہیں جن پر بیٹھ کر مسلمان اللہ کا کلام سنتے اور سمجھتے ہیں۔ ان چبوتروں اور مدرسوں سے فارغ التحصیل ہونے والے کروڑوں طالب علم اس وقت دنیا کا حصہ ہیں۔ دوسرا مسئلہ دنیا میں اسلام کا غلبہ ہے۔ پچھلے پچاس برسوں میں اسلام کے سوا دنیا کے تمام مذاہب کا سائز چھوٹا ہوا ہے۔ فرانس جیسے ملک میں دس سال میں اڑھائی سو چرچ بند ہوئے ہیں۔ امریکا میں دس سال میں ایک لاکھ عیسائی مسلمان ہوئے ہیں اور یورپ میں مسلمان دوسری بڑی طاقت بن کر ابھرے ہیں۔ دنیا کے تمام مذاہب کی تعلیمات پر عملدرآمد میں کمی آئی ہے لیکن اسلام دنیا کا واحد مذہب ہے جس کی تعلیمات پر عملدرآمد اور جس کے اثر و نفوذ میں اضافہ ہو رہا ہے۔ بہت سے غیر مسلم ایسے ہیں جن کو اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے اور دینی اداروں میں رہ کر دلی سکون حاصل ہوتا ہے۔

''دینی مدرسے میں وقت گزار کر سکون ملتا ہے'' یہ الفاظ ایک غیر مسلم خاتون ''الیگرا'' کے ہیں۔ سفید فام برطانوی خاتون الیگرا مسلمان نہیں مگر وہ ہر ہفتے لندن کے ایک اسلامی مدرسے میں بچوں کو ڈرائنگ کی تعلیم دینے جاتی ہیں۔ کئی برسوں سے بلا معاوضہ خدمات انجام دینے والی اس عیسائی خاتون کا کہنا ہے مسجد میں جا کر سکون ملتا ہے۔ ریڈرز ڈائجسٹ کے لیے لکھے گئے ایک مضمون کا ترجمہ پیش کرنا چاہتا ہوں جس میں انہوں نے اپنی روداد لکھی ہے۔

الیگرا کہتی ہیں:

الیگرا کہتی ہیں: ''میں مشرقی لندن کی ایک مسجد میں ہر ہفتہ جاتی ہوں۔ میں مسلم نہیں ہوں۔ میں وہاں ایک ٹیچر کی حیثیت سے جاتی ہوں۔ تمام دوسرے ٹیوٹر وہاں بچوں کو قرآن پڑھاتے ہیں لیکن میں وہاں ان بچوں کو آرٹ، ڈرائنگ اور بالواسطہ طور پر انگریزی زبان اور معلومات عامہ کی تدریس کا فریضہ انجام دیتی ہوں۔ جب میں یہ بات اپنی کمیونٹی میں سے کسی کو بتاتی ہوں تو میری اپنی کمیونٹی کو اس پر یقین نہیں آتا۔ میری کمیونٹی کے لحاظ سے مدرسہ ایک نامعقول جگہ ہے مگر مجھے یہاں نہ صرف سکون ملتا ہے بلکہ میں ان مسلمان بچوں کو پسند بھی کرتی ہوں جو لندن کی اس مسجد میں قرآن حفظ کر رہے ہیں۔

اس مسجد میں میرے کام کی مکمل ناموزونیت ہی مجھے کھٹکتی ہے لیکن یہ حقیقت بھی فوری اور بے لاگ ہے کہ بچے آپ کو پسند کرتے ہیں اور آپ بچوں کو پسند کرتی ہیں۔ یہاں تعلیم حاصل کرنے والے بچوں کی عمریں 5 سے 15 سال کے درمیان ہیں جو سب کے سب علم کے جویا اور خوب سے خوب تر کے متلاشی رہتے ہیں اور نئی نئی باتیں معلوم کرنے کا خود ہی اظہار بھی کرتے ہیں۔ میں گزشتہ 4 سال سے اس مسجد میں تدریس کے لیے آ رہی ہوں اور اب یہ مقام میرے لیے ایک پناہ گاہ بن چکا ہے۔

جب میں پینٹ برش کو صاف کر رہی تھی تو اچانک اپنے حجاب یا سر کے اسکارف کو دوبارہ کس کے باندھتے ہوئے خدیجہ نامی بچی نے مجھ سے پوچھا: مس! کیا آپ مسلم ہیں؟ اس کے باوجود کہ وہ سب ایک دوسرے سے بے حد مانوس اور قریب ہیں اور یہ بات بھی ہے کہ وہ سب اس سوال کا جواب پہلے ہی جانتے ہیں ان بچوں میں سے کوئی نہ کوئی بچہ اچانک رک جاتا ہے اور ایک بار پھر

ایسے سوال کو دہرانے لگتا ہے۔ دراصل بچے اس بارے میں یقین کامل نہیں چاہتے میں مسلم نہیں ہوں۔ ہر بار میں محسوس کرتی ہوں وہ حقیقی زندگی سے کتنے دور ہیں؟ مقبول عام نقطہ نظر تو یہی ہے بچوں کے لیے کھیل کے میدان اور دوسری سہولتیں ہوں اور اسی تصور کے تحت غیر مسلم ایسے اداروں کو تحقیر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اسی طرح ان کے نزدیک یہ بات بڑے تعجب کا باعث ہے کہ ایک کافر مسجد میں تدریس کے فرائض انجام دیتی ہے۔

سکون واطمینان کی جگہیں:

اکثر وبیشتر میرا جواب یہ ہوتا تھا میں انسان دوست ہوں۔ میرا حجاب ہمیشہ ڈھیلا ڈھالا ہی ہوا کرتا تھا۔ میں مسجد میں ننگے پیر ہی ہوتی تھی تاہم شلوار قمیص میں ہوتی تھی۔ یہ روایتی جنوبی ایشیا کا لباس ہوا کرتا ہے اور میں انہی جیسا لباس پہنا کرتی تھی۔ بعض بچے میرے جواب سے مطمئن نہیں ہوتے تھے تاہم اکثریت بات کی تہہ تک پہنچ جایا کرتی تھی۔ ایک بار باتونی لڑکیوں سے بات چیت کرتے ہوئے میں نے کہا کہ میرا ملا جلا پس منظر ہے اور میری فیملی کا تین مذاہب سے تعلق ہے۔ ایک لڑکی نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی روکی۔ اسے اس بات پر بڑی حیرت تھی کوئی شخص ایک سے زیادہ مذاہب کا پیروکار بھی ہوسکتا ہے۔ کسی دوسرے وقت میں رضوان نے پوچھا کہ مسجد میں تدریس کے لیے کیوں آئی ہوں؟ میں نے اسے بتایا میں بطور مہمان یہاں آئی ہوں۔ یہ بات سنتے ہی اس نے حیرت بھرے لہجے میں اوہ کی آواز نکالی اور کہا آپ تو یہاں سیاح کے طور پر آیا کرتی ہیں اور یہ حقیقت بھی ہے کہ مسجد تک آنے کے لیے مجھے اپنے آبائی شہر سے ایک بین البراعظمی سفر طے کرنا پڑتا تھا۔

یہ فاصلہ اگرچہ 24 کلومیٹر تھا لیکن یہ لاہور سے لندن تک کے 4000 میل کے فاصلے سے زیادہ تھا۔ میں نے کبھی باقاعدگی سے چرچ اٹینڈ نہیں کیا اور آج بھی اس مسجد کو زیادہ وقت دیتی ہوں جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میرا زیادہ وقت مسجد میں گزرتا ہے۔ یہ ایک ایسا مقام ہے جہاں میں بعض روحانی کیفیت اور خوشی محسوس کرتی ہوں۔ سچ یہ ہے کہ مجھے یہاں سکون ملتا ہے۔

اگرچہ میں قالین پر کاغذوں اور رنگوں کو الگ الگ کرنے اور ان کی درجہ بندی کرنے میں

مصروف ہوا کرتی تھی اور اس کام میں ہمیشہ تھکن ہو جایا کرتی تھی لیکن جونہی شام کی اذان آواز کانوں میں رس گھولنے لگتی تھی۔ مجھے بے حد سکون آجاتا اور یہ آواز بار بار مجھے روحانیت کی طرف دعوت دیتی اور یاد دہانی کراتی محسوس ہوتی اور بعض اوقات اللہ تعالیٰ سے مناجات اور استقامت طلب کرنے لگتی۔ میں اپنے کو مسلمان محسوس کرنے لگتی اور پھر میں یہ احساس کرتی کہ میرا عمل ہی عبادت، میری فرمانبرداری اور میرا اسلام ہے۔ میں ایک علامتی عیسائی ہونے کے باوجود اپنی ذمہ داریوں کی وجہ سے اپنے آپ کو ان سے علیحدہ محسوس کرتی تھی اور میرے بیگ میں جو مواد بھرا ہوا تھا اس کو دیکھ یہی تاثر ملتا تھا میں فی الواقع یہاں سے کوئی تعلق نہیں رکھتی لیکن عملی طور پر میں وہیں ہوا کرتی اور میں نے اس صورتِ حال سے مکمل طور پر سمجھوتہ کر رکھا تھا۔''

لیڈی ڈیانا سے ایوان ریڈلے تک:

اس طرح کے سیکڑوں واقعات ہیں کہ ہیں تو غیر مسلم مگر ان کو دلی اطمینان، راحت اور سکون اسلام اور اسلامی تعلیمات میں ملتا ہے۔ لیڈی ڈیانا کے بارے میں ہے وہ بھی قلبی لگاؤ اسلام سے رکھتی تھیں۔ بہت سارے غیر مسلموں نے اسلام کی روشنی کی طرف سفر کیا ہے۔ چند ایک واقعات آپ کی دلچسپی کے لیے لکھتا ہوں۔ یہ بھی ذہن میں رہے کہ ان افراد کو اسلام کے دامن میں لانے میں اہلِ مدارس کا کردار رہا۔

گزشتہ دنوں وسطی افریقہ کی ٹیم انٹرنیشنل باکسنگ ٹورنامنٹ میں شرکت کے لیے کراچی آئی تھی۔ ٹیم کے تمام باکسر عیسائی تھے۔ ٹیم کے کھلاڑیوں نے اسلامی ماحول اور تعلیمات سے متاثر ہونے کے بعد اسلام قبول کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ مقامی ہوٹل میں مفتی محمد نعیم نے انہیں کلمہ پڑھا یا اور ان کے اسلامی نام رکھے۔ چند دن پہلے کراچی میں ''عمانویل'' نامی پادری بھی اسلام قبول کر چکے ہیں۔ اس سے قبل پاکستانی مشہور کرکٹر محمد یوسف اسلامی تعلیمات سے متاثر ہو کر مشرف بہ اسلام ہوئے۔

2001ء میں برطانوی صحافی ''ایوان رڈلے'' نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ نائن الیون کے بعد جب سے عالمی طاقتوں کی طرف سے ''صلیبی جنگ'' کا اعلان کیا گیا ہے تب سے مغربی دنیا سے

ہزاروں نہیں لاکھوں کی تعداد میں عیسائی مسلمان ہوئے ہیں۔ ان اسلام قبول کرنے والوں میں درجنوں معروف و مشہور افراد بھی ہیں۔ آج کے پر آشوب دور میں جبکہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہمہ جہت جنگ جاری ہے۔ دنیا بھر کی کفریہ طاقتیں خصوصاً صہیونی، صلیبی اور برہمنی گٹھ جوڑ کی پروردہ قوتیں عالم اسلام کی واحد ایٹمی قوت پاکستان کے خلاف خم ٹھونک کر میدان میں اتر چکی ہیں، اسلام کی عالمگیر صداقت اور ناقابل تسخیر روحانی طاقت ان باطل قوتوں کے سامنے ناقابل یقین مزاحمت کی شاندار مثالیں قائم کر رہی ہے۔ اسے اسلام کی حقانیت کا ثبوت ہی کہا جا سکتا ہے۔ یہ سب نو مسلم اسلام کی حقانیت کو تسلیم کرتے ہوئے مسلمان ہوئے ہیں۔ انہیں کسی نے مجبور نہیں کیا وہ مسلمان ہوں۔ مغربی دنیا میں یہ بات کہی جاتی ہے اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے اور مسلمان فاتحین نے عیسائیوں اور دیگر مذاہب کے لوگوں کو زبردستی اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جبکہ زمینی حقائق اس کی یکسر نفی کرتے نظر آتے ہیں۔ غیر مسلموں کے اسلام کی طرف راغب ہونے کے بہت سے اسباب ہیں۔

اسلام کی بڑھتی ہوئی مقبولیت:

ایک سبب اس مادر پدر معاشرے سے تنگ آئے ہوئے افراد کا اسلام کی جانب راغب ہونا ہے جبکہ دوسری اہم وجہ ان مظالم اور ناانصافیوں کا ری ایکشن ہے جو سامراجی طاقتیں مسلمانوں اور عالم اسلام پر روا رکھے ہوئیں ہیں۔ کشمیر، فلسطین، بوسنیا، عراق، افغانستان اور دیگر مسلم ممالک میں کیا ہو رہا ہے؟ مسلمانوں کے لیے انصاف کہاں ہے؟ ڈاکٹر عافیہ صدیقی اس کی واضح مثال ہے۔ رواداری کے دعویدار امریکیوں نے متعدد بار گوانتانامو بے جیل میں قرآن کی توہین، عراقی جیل ابوغریب میں مسلمان مرد اور عورتوں سے بدترین بدسلوکی، افغانستان میں بگرام کے قید خانے میں عرب مسلمانوں پر انسانیت سوز مظالم، فلسطین میں مسلمانوں کی عبادت گاہوں پر بارود کی بارش، اسلامی عقائد اور شعائر اسلام کا مذاق اڑانا، ڈاڑھی کو دہشت گردی کی علامت سمجھنا، حجاب پر پابندی لگا کر مسلم خواتین کے جذبات مجروح کرنا، دنیا بھر میں ہونے والی ہر دہشت گردی کا الزام مسلمانوں کے سر تھوپنا اور مسلمانوں سے ساتھ امتیازی سلوک کرنا شامل ہے۔

''امریکی ایئرپورٹس پر مسلم ممالک کے شہریوں کی جامہ تلاشی کا فیصلہ کیا گیا ہے۔''مسلمانوں کے ساتھ یہ امتیازی سلوک کیوں؟ مزے کی بات ہے جو ممالک اسلام اور مسلمانوں کے زیادہ خلاف ہیں انہیں میں اسلام کی روشنی بڑھ رہی ہے۔ دنیا میں مسلمانوں کی تیزی سے بڑھتی تعداد سے مغرب اور امریکا انتہائی خوف زدہ ہیں۔ رپورٹ کے مطابق یورپ اور امریکا کی لوکل آبادی انتہائی کم ہوگئی ہے۔ آبادی کا حلیہ تبدیل ہونے سے مسلمان یورپ اور امریکا میں اکثریت میں آنے والے ہیں۔ چند سالوں میں یورپ میں مسلمان قوم اکثریت میں ہوگی۔ فرانس کے 20 سال سے کم عمر بچوں میں 30 فیصد مسلمان ہیں جبکہ یہ تناسب پیرس اور مارسیلز میں 45 فیصد ہے۔ جنوبی فرانس جو کبھی کیتھولک عیسائیت کا مرکز تھا، آج وہاں گرجوں سے زیادہ مسجدیں ہیں۔ 2027ء میں ہر پانچ میں سے ایک فرانسیسی مسلم ملک ہوگا۔ برطانیہ میں اس وقت 25 لاکھ مسلمان ہیں، یعنی مسلمانوں کی تعداد میں 40 گنا اضافہ ہو چکا ہے۔ برطانیہ میں آج جہاں مساجد ہیں وہاں 15 سال پہلے گرجے ہوتے تھے۔ نائن الیون کے بعد فرانسیسی اور انگریز آبادی میں اسلام قبول کرنے کی شرح 100 فیصد سے زیادہ ہو چکی ہے۔ روزانہ 3 سے 4 لوگ برطانیہ میں اور 4 سے 5 لوگ فرانس میں اسلام قبول کر رہے ہیں۔

ٹونی بلیئر کی سالی کا قبولِ اسلام:

ہالینڈ میں ہر روز پیدا ہونے والے بچوں میں آدھے سے زائد بچے مسلمان ہوتے ہیں۔ آج سے 10 سال بعد ہالینڈ کی آدھی آبادی مکمل طور پر مسلمان ہوگی۔ روس میں اس وقت 2 کروڑ 30 لاکھ مسلمانوں ہیں یعنی ہر پانچ میں سے ایک مسلمان اور جوانوں کی شرح ان میں زیادہ ہے۔ اس وقت روس کی فوج میں 40 فیصد مسلمان ہیں۔ وہ فوج جو کبھی آرتھوڈوکس چرچ کی نمائندہ تھی، اب تیزی سے مسلمان فوج بنتی جاری ہے۔ بیلجیم میں 25 فیصد مسلمان ہیں اور نئے پیدا ہونے والے بچوں میں 40 فیصد مسلمان ہوتے ہیں۔ صرف 17 سال بعد وہاں ہر تیسرا پیدا ہونے والا بچہ مسلمان ہوگا۔ امریکا سے شائع ہونے والے ایک جریدے کی رپورٹ کے مطابق متعدد امریکی ریاستوں میں قائم اسلامک مشن سینٹرز میں امریکی شہریوں کی ایک بڑی تعداد مسلمان ہونے

جاری ہے۔ 16 امریکیوں کے ایک گروپ نے کمیونٹی مسجد میں اسلام قبول کر بھی لیا ہے۔ مصدقہ رپورٹ کے مطابق 2005ء میں امریکا میں چار لاکھ افراد مشرف بہ اسلام ہوئے۔ اس وقت امریکا میں اسلام دوسرا بڑا مذہب بن چکا ہے۔

اسپین میں ایک لاکھ سے زائد لوگ اسلام میں داخل ہو چکے ہیں۔ 2002ء کی مردم شماری کے مطابق آسٹریا میں اسلام تیسرا بڑا مذہب شمار ہوتا ہے۔ گزشتہ دنوں خبر آئی تھی آسٹریلیا کی جیل میں 12 قیدیوں نے بیک وقت اسلام قبول کرلیا۔ فرانس میں اسلام تیزی سے پھیل رہا ہے۔ رپورٹ کے مطابق فرانس میں اسلام دوسرا بڑا مذہب ہو چکا ہے۔ ہالینڈ کی آبادی ایک کروڑ ساٹھ لاکھ کے قریب ہے جس میں 10 لاکھ مسلمان ہیں۔ تناسب کے لحاظ سے یورپ کے جس ملک میں سب سے زیادہ مسلمان ہیں وہ ہالینڈ ہی ہے۔ اگرچہ تعداد کے لحاظ سے مسلمان فرانس میں سب سے زیادہ ہیں لیکن آبادی کے تناسب کے حساب سے ہالینڈ میں مسلمان ہر یورپی ملک سے زیادہ تعداد میں بستے ہیں۔ تمام تر مخالفت کے باوجود اسلام ہالینڈ میں بہت تیزی سے پھیل رہا ہے۔ اسی طرح مختلف مسلم ممالک میں ڈیوٹی سرانجام دینے والے ہزاروں غیر مسلم اسلام قبول کر چکے ہیں۔ گزشتہ سال سعودی عرب میں تعمیراتی پروجیکٹ میں کام کرنے والے 660 چینی باشندوں نے بیک وقت اسلام قبول کیا تھا۔ اسی طرح اکتوبر 2010ء کو سابق برطانوی وزیراعظم ٹونی بلیئر کی سالی "لورین بوتھ" نے بھی اسلام قبول کر کے جو پیغام دیا ہے وہ ہر پڑھا لکھا طبقہ بخوبی سمجھتا ہے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد "لورین بوتھ" کا کہنا تھا: "اب میں شراب نہیں پیتی۔ نماز پڑھنے سے سکون ملتا ہے۔ حجاب پہن کر اپنے آپ کو محفوظ سمجھتی ہوں۔ قرآن کی تلاوت سے اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ میں اسلامی تعلیمات سے شدید متاثر ہوں۔"

اب "انجلینا جولی" کی باری ہے:

جس دن ٹونی بلیئر کی سالی نے اسلام قبول کیا اسی دن چینی کمپنی کے ایک اعلیٰ افسر نے بھی علی الاعلان اسلام قبول کر کے دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ ان دونوں کے اسلام قبول کرنے کے واقعے کو مغربی دنیا کے اخبارات نے شہ سرخیوں سے شائع کیا۔ ان کے قبولِ اسلام کی وجہ قرآن

پاک کا مطالعہ، غریبوں کی مدد، مظلوموں کی حمایت بنی ہے۔ حضرت عمر فاروق کے قبول اسلام کے واقعے سے لے کر ٹونی بلیئر کی سالی تک اکثریت کے اسلام قبول کرنے کا بنیادی سبب قرآن کا مطالعہ اور مظلوموں کی حمایت بنا ہے۔ شہزادی ڈیانا پر لکھی جانے والی کتاب "The Diana Choricles" کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے بلکہ یقین ہو جاتا ہے کہ وہ بھی مسلمان ہو گئی تھیں کیونکہ انہوں نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی سیرت اور قرآن پاک کا بغور مطالعہ کیا تھا۔ جس کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچیں کہ اگر کوئی مذہب مبنی برحق ہے تو وہ اسلام ہی ہے۔ لیڈی ڈیانا کو انہی لوگوں نے قتل کروایا جو نہیں چاہتے تھے کہ یہ اسلام قبول کرے۔

امریکا کی خوبرو اداکارہ اور اقوام متحدہ کی سفیر برائے خیر سگالی ''انجلینا جولی'' بھی غریبوں کی مدد کرتی ہیں۔ وہ افغانستان گئیں اور افغانوں کے غربت و افلاس زدہ بچوں کو دیکھ کر رونے پر مجبور ہوئیں۔ وہ فلسطین، افریقہ اور دیگر شورش زدہ علاقوں میں بھی گئی اور غریبوں کی بھرپور مدد کی۔ 2005ء میں پاکستان میں زلزلہ آیا تو پاکستان کا دورہ کیا۔ اس سال جب سیلاب اور طوفان نے پاکستان میں تباہی مچادی تو بھی متعدد بار پاکستان آئیں۔ متاثرہ علاقوں کا دورہ کیا اور پھر اپنی وسعت کے مطابق فنڈ دیے۔ گزشتہ دنوں پاکستان کے دورے پر آئیں تو ہمارے وزیراعظم نے پرتکلف عشائیہ دیا اور آخر میں گفٹ کے طور پر قرآن پاک دیا۔ واپس جانے کے بعد قرآن پاک کا تحفہ دینے پر انہوں نے خط کے ذریعے وزیراعظم گیلانی کا شکریہ ادا کیا۔ ہماری چھٹی حس بتا رہی ہے اگر انہوں نے سنجیدگی سے مطالعہ کیا تو عنقریب وہ بھی مسلمان ہو جائیں گی۔ کیونکہ غریبوں کی مدد کرنے والا، مظلوم قوموں کی حمایت کرنے والا اور قرآن کا بغور مطالعہ کرنے والا ابدی سچائی سے محروم نہیں رہتا۔ وہ ایک نہ ایک دن حقیقت کو پالیتا ہے۔ یہ قانون ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔

دنیا میں 1476233470 مسلمان آباد ہیں۔ جن میں سے ایک ارب ایشیا میں، 400 ملین افریقہ، 44 ملین یورپ میں اور 6 ملین امریکا میں رہتے ہیں۔ دنیا میں ہر پانچواں انسان مسلمان ہے۔ دیگر مذاہب کے ماننے والوں کی تعداد کے ساتھ مسلمانوں کا تناسب کچھ اس طرح سے بنتا ہے ہر ہندو کے مقابلے میں 2 مسلمان اور ہر یہودی کے مقابلے میں ایک سو مسلمان ہیں۔

مسلمانوں کی تعداد میں پہلے بتدریج اضافہ ہو رہا تھا لیکن نائن الیون کے بعد تیزی سے اضافہ ہونا شروع ہو گیا۔ روزانہ اوسطاً دنیا بھر میں اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد 1500 افراد سے زیادہ ہے۔ برطانیہ میں بچوں کے لیے ''محمد اور احمد'' نام مقبول ترین بن گئے ہیں۔ رواں برس برطانیہ میں پیدا ہونے والے 6928 بچوں میں سے 5991 بچوں کے نام ''محمد'' رکھے گئے ہیں۔ مقامِ مسرت ہے ان اسلام قبول کرنے والوں میں درجنوں معروف و مشہور افراد بھی ہیں۔ کرکٹر محمد یوسف، امریکی باکسر محمد علی کلے، ہمیرا نامی معروف عیسائی رہنما، برطانوی صحافی ایوان ریڈلے، ماہر تعلیم پروفیسر غازی احمد اور دیگر بے شمار حضرات و خواتین اسلام کی حقانیت کو تسلیم کرتے ہوئے مسلمان ہو چکے ہیں۔

اسلام کی اصل تصویر:

تقابلِ ادیان پر مطالعہ کرنے والی غیر جانبدار برطانوی مصنفہ اور اسکالر ''آرم اسٹرانگ'' نے اسی سچائی کو بیان کیا ہے: ''میں نے تیس سال تمام مذاہب کا مطالعہ کیا۔ میں سمجھتی ہوں اسلام تمام مذاہب کے لیے رہنما کردار ادا کرسکتا ہے۔'' ریاست ہائے متحدہ امریکا کے محکمہ تعلقات عامہ کی جاری کردہ رپورٹ بعنوان ''امریکا میں اسلام'' بھی پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ امریکی تھنک ٹینکس نے اپنی مشترکہ رپورٹس میں کہا ہے اگر اس طرح لوگ مسلمان ہوتے رہے تو 2015ء تک اسلام امریکا کا پہلا بڑا مذہب ہو جائے گا جو امریکا کے لیے خطرے کی علامت ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''ایک وقت ایسا آئے گا جب ہر کچے اور پکے گھر میں اسلام داخل ہو چکا ہو گا۔'' دنیا بھر کے اہم ترین افراد کا جوق در جوق دائرۂ اسلام میں داخل ہونے سے یہ بات واضح ہوتی جا رہی ہے وہ وقت آ پہنچا ہے۔ امریکی حکمرانوں نے امریکا کے اصل باشندوں ''ریڈ انڈین'' پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے۔ اپنے ہی وطن سے نکالنے کے لیے مار مار کر اتنا چلایا کہ آنسوؤں کی شاہراہیں بن گئیں، لیکن ظلم اور ناانصافی کا انجام ہمیشہ برا ہوتا ہے۔ بالآخر وہ وقت بھی آیا امریکا کا صدر، غلام اور مظلوم قوم سے تعلق رکھنے والا بن بیٹھا ہے۔

امریکا نے مسلم دنیا کے بے پناہ وسائل پر ڈاکہ مارا۔ مسلم دنیا کا تیل اور دیگر معدنیات

لوٹ لوٹ کر اپنے ہاں منتقل کیا اور یہ سلسلہ تا ہنوز جاری ہے۔ عراق سے تیل اور افغانستان سے نایاب پتھر اور دیگر قیمتی معدنیات امریکا منتقل کیے جا رہے ہیں۔ ظلم در ظلم یہ کہ مسلمانوں کو اس قدر مارا کہ رونے بھی نہ دیا، لیکن اب وقت آ پہنچا ہے خود امریکا میں اسلام پہلا بڑا مذہب بنے جا رہا ہے۔ آثار بتاتے ہیں وہ وقت دور نہیں جب ''وائٹ ہاؤس'' کی دہلیز اور دریچے سے اسلام کی کرنیں پھوٹ رہی ہوں گی۔ ان حالات میں مسلمانوں کے کرنے کے کام یہ ہیں کہ وہ اسلام کی اصل تصویر اور چہرہ دنیا کے سامنے لائیں۔ قرآن پاک کے تمام زبانوں میں ترجے کروا کر عام کریں۔ تشدد اور فرقہ واریت سے اجتناب کریں۔ مسلمان ملت واحدہ کا مظاہرہ کریں۔ نومسلموں کی بھرپور حوصلہ افزائی کریں۔ ان کے لیے قابلِ اعتماد ادارے قائم کیے جائیں تاکہ ان کی مشکلات ختم ہو سکیں اور جو لوگ نومسلموں کی ارتداد کی کوشش کرتے ہیں، اس کی روک تھام ہو سکے۔ اگر ہم یہ کام کر لیں تو پھر دیکھنا روحانی طور پر پیاسی اور بے چین دنیا کس طرح اسلام کا استقبال کرتی ہے۔

روشن مستقبل کی علامت:

تازہ ترین خبروں کے مطابق افغانستان میں طالبان کے خلاف برسرِ پیکار 31 سالہ امریکی فوجی ''والیس نیلسن'' نے بھی اسلامی تعلیمات سے متاثر ہو کر 2008ء میں اسلام قبول کر لیا تھا۔ طالبان نے 30 جون 2009ء کو پکتیا سے 23 سالہ امریکی افسر ''بووی رابرٹ برگڈال'' کو گرفتار کر لیا تھا۔ 25 دسمبر کو کرسمس کے موقع پر اس کی ویڈیو جاری ہوئی جس میں اس کو خوشی خوشی کھانا کھاتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ ہمیں اُمید ہے رہائی کے کچھ عرصے بعد یہ بھی اسلام قبول کریں گے۔ اگر اسی رفتار سے اسلام پھیلتا رہا تو یہ پہلا بڑا مذہب ہو جائے گا۔ اس بات کی تصدیق 220 ممالک سے مردم شماری کے اعداد و شمار اکٹھے کرنے والے ''فورم آن ریلیجن اینڈ پبلک لائف'' کی اس رپورٹ سے بھی ہوتی ہے جس میں کہا گیا ہے چند سال بعد اسلام دنیا کا پہلا بڑا مذہب بن جائے گا۔

ایک طرف مغرب کے پیاسے لوگ جوق در جوق حلقۂ بگوش اسلام ہو رہے ہیں جبکہ دوسری طرف اسلامی دنیا میں ان نومسلموں کو سنبھالنے والے فعال ادارے اور افراد نہیں ہیں۔ ہونا تو یہ

چاہیے تھا مسلمان دعوت و تبلیغ اور اپنے کردار کے ذریعے غیر مسلموں کو اسلام کی جانب مائل کرتے اور اسلامی ممالک کی حکومتیں اس میں اپنا حصہ ڈالتیں، لیکن اب جبکہ یہ چیزیں نایاب ہیں، غیر مسلم خاص اپنے مطالعے اور مشاہدے کی بنیاد پر اسلام کی تعلیمات کو سمجھ کر دائرہ اسلام میں آرہے ہیں تو ہمیں کم از کم ان کو سنبھالنے کی ذمہ داری تو نبھانی چاہیے۔

عالمی اداروں کی رپورٹوں کے مطابق مسجدوں، مدرسوں اور ڈاڑھیوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ''السلام علیکم'' بڑی تیزی سے ''ہیلو'' اور ''ہائے'' کی جگہ لے رہا ہے چنانچہ دنیا اس بات سے پریشان ہے۔ ان لوگوں کا خیال ہے اگر اسلام کے اس پھیلتے دائرے کو روکا نہ گیا تو شاید بیس پچیس برسوں میں یہ دائرہ پوری دنیا کو اپنی آغوش میں لے لے۔ شاید پوری دنیا مسلمان ہو جائے۔''

حیرت انگیز بات یہ ہے مغرب اور مغرب زدوں کے زہریلے پروپیگنڈے کے باوجود مدارس سے محبت کرنے اور مدارس کی عظمت کے قائل افراد پرکشش عمارتوں پر قائم عصری تعلیمی اداروں کا رُخ کرنے کے بجائے مدارس کی طرف ہی رخ کرتے ہیں۔ گزشتہ سال مدارس پر چھاپے مار کر بعض طلبہ کو گرفتار اور اکثر کو ہراساں کیا گیا مگر دینی طلبہ کے جذبوں اور عزم میں کسی قسم کی کوئی لغزش آئی نہ مدارس کے اساتذہ خوفزدہ ہوئے۔ مدارس سے گزشتہ سال 20 ہزار 127 علماء اور 57 ہزار 31 حفاظ بن کر فارغ التحصیل ہوئے اور نئے تعلیمی سال کے آغاز پر مدارس میں نئے طلبہ کا ہجوم نظر آرہا ہے۔ تمام مدارس میں داخلوں کی تعداد پوری ہونے کے باوجود طلبہ کا رش مسلسل بڑھ رہا ہے۔ مدارس کی بڑی بڑی درسگاہیں طلبہ سے بھری نظر آتی ہیں۔

ایک سروے کے مطابق مدارس میں مزید داخلوں کی گنجائش نہیں رہی۔ مصدقہ رپورٹ کے مطابق ملک بھر کے تمام دینی مدارس میں نئے تعلیمی سال کا باقاعدہ آغاز ہو گیا ہے۔ اس مرتبہ گزشتہ سال کے مقابلے میں 40 فیصد طلبہ و طالبات کا اضافہ ہوا ہے۔ وفاق المدارس کی جانب سے جاری کردہ ریلیز کے مطابق رواں سال کے لیے داخلوں میں مجموعی اضافہ 40 فیصد سے زائد رہا۔ درجنوں بڑے مدارس میں اُردو، انگلش اور عربی زبان پڑھانے کے علاوہ صحافت، بینکنگ، کمپیوٹر اور سائنسی حوالے سے خصوصی کورسز کا آغاز ہوا ہے جن میں ہزاروں طلبہ و طالبات شریک

ہیں ۔ یہ اسلام، مسلمانوں، علماء اور اہل مدارس کے روشن مستقبل کی علامت اور ضمانت ہے۔ ہم سمجھتے ہیں مدارس کی طرف رجحان کی بڑھنے کی ایک بڑی وجہ بدلتے حالات اور منفی پروپیگنڈا ہے۔ اب وہ دور نہیں رہا کہ کسی کے خلاف فرضی کہانیاں گھڑ کر عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکی جا سکے۔ زمانہ اور حالات یکسر بدل چکے ہیں۔

علماء محتاط ہو جائیں:

بعض ایشوز ایسے ہیں جن پر کوئی بھی عالمِ دین سیاسی بیان نہیں دے سکتا، اسے قرآن وسنت کے مطابق ہی جواب دینا پڑتا ہے، لہٰذا ہمارے اکابرین کے محتاط بیانات کے باوجود یہ نان ایشو بہت تیزی سے ایشو بنتے جا رہے ہیں۔ کل انگریزی کے ایک اخبار میں کالج کی دو بچیوں کی تصاویر چھپیں۔ یہ بچیاں مخلوط نظامِ تعلیم ختم کرنے پر احتجاج کر رہی تھیں۔ اب آپ بتائیے! کیا مخلوط نظام تعلیم ہی اس ملک کے سارے بگاڑ کی واحد وجہ ہے۔ گو اس سے انکار ممکن نہیں، جب اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما دیا تو پھر ہمارے پاس اگر، مگر، لیکن، چونکہ، چنانچہ کی گنجائش نہیں رہتی لیکن سوال یہ ہے کیا پردے اور مخلوط تعلیم کے علاوہ تمام مسائل حل ہو چکے ہیں؟ نہیں، ہرگز ہرگز نہیں۔ اس معاشرے میں ان سے کئی ہزار گنا گھمبیر مسائل موجود ہیں، مثلاً: اس ملک میں انصاف نہیں، آج بھی ہزاروں لاکھوں مقدمات عدالتوں میں زیر التوا ہیں، لوگوں کی نسلیں پیدا ہوئیں، جوان ہوئیں اور بوڑھی ہو کر مر کھپ گئیں، لیکن ان کے مقدموں کا فیصلہ نہیں ہوا۔

ہمارے پولیس کا نظام ایسا ہے ہر چھوٹے بڑے جرم کی جڑیں تھانوں اور چوکیوں میں پیوست ہیں۔ بڑے بڑے معززین اپنی انا، اپنا وقار اور اپنی عزتِ نفس تھانوں کچہریوں میں کھو دیتے ہیں۔ محکمہ مال ہے۔ آپ پاکستان کے کسی کونے، کسی گوشے میں ہوں، آپ رشوت دیے بغیر زمین کی نقل حاصل نہیں کر سکتے۔ چھوت چھات اور چھوٹے بڑے پر مبنی مشتمل ہندووانہ نظام ہے۔ یہاں کوئی عالی نسب دس قتل کر دے تو کوئی قانون اس کی طرف دیکھتا ہے اور نہ ہی کوئی قانون ساز جبکہ کوئی غریب آدمی سائیکل پر سوار ہو تو سائیکل سواری اس کا جرم بن جاتی ہے۔

تین تین، چار چار قسم کے نصاب ہیں۔ اعلیٰ طبقے کے لیے لندن سے کتابیں چھپ کر آتی ہیں

اور سنگاپور میں قائم امتحانی سینٹر ان کا امتحان لیتے ہیں۔ مڈل کلاس کے بچے زیادہ فیسیں دے کر پاکستانی اداروں میں ولایتی تعلیم حاصل کرتے ہیں اور لوئر مڈل کلاس اور مدرسے کے بچے امداد کے پیسوں پر پڑھتے ہیں۔ صحت کی سہولیات ناپید ہیں۔ سڑکیں نہیں ہیں۔ پوری سرکار کی رگوں میں رشوت کا کینسر ہے۔ بے روزگاری ہے۔ ملک میں ایک کروڑ 45 لاکھ نوجوان بے روزگار ہیں۔ میرٹ کا نام ونشان نہیں۔ بڑوں کے بچے نتائج کا اعلان ہونے سے پہلے برسرروزگار ہوتے ہیں اور اہل نوجوان ڈگریاں بغلوں میں دبائے مارے مارے پھرتے ہیں۔

یہ ہیں اس ملک کے اصل ایشوز لیکن ذرا غور کیجیے! اس عرصے میں کسی غیر ملکی صحافی نے مولانا فضل الرحمن سے یہ پوچھا اور نہ ہی قاضی صاحب سے کہ حضور آپ صوبوں میں انصاف کیسے قائم کریں گے؟ میرٹ کا نفاذ کیسے ہوگا؟ رشوت کیسے ختم کریں گے؟ تعلیم سے طبقاتی تقسیم کیسے ختم کریں گے اور تھانوں اور عدالتوں کو کیسے شفاف بنائیں گے؟ ہر کوئی ان سے پردے اور مخلوط تعلیم کے بارے میں پوچھ رہا ہے! کوئی ان سے پوچھے اگر کسی معاشرے میں سو فیصد پردہ ہو لیکن انصاف نہ ہو تو ہم اس معاشرے کو اسلامی کہہ سکتے ہیں، ہرگز نہیں کہہ سکتے۔ انصاف پہلے اور باقی چیزیں بعد میں۔

یہ اسلام کا فلسفہ ہے۔ اہل یورپ جان بوجھ کر ہمارے علمائے کرام کی توجہ بڑے مسائل سے ہٹا کر چھوٹے معاملات کی طرف لانا چاہ رہے ہیں۔ ان کی کوشش ہے ہمارے علمائے کرام پردے اور مخلوط تعلیم کے بارے میں کوئی بیان دیں، میڈیا اسے خوب اچھالے اور پھر دنیا بھر میں ان کے خلاف تحریک شروع ہو جائے، ان کی حکومت بننے سے پہلے ہی غیر مقبول ہو جائے۔ علمائے کرام محتاط ہو جائیں، اہل مغرب آپ کے ساتھ گیم کھیل رہے ہیں۔

حقیقت کیا ہے؟:

وہ آپ کے پہاڑ جتنے مینڈیٹ کو چٹانوں کے ساتھ ٹکرا کر چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کرنا چاہتے ہیں۔ آپ ان کے سامنے حکومتی نظام رکھیں، عدالتی مسائل رکھیں، بے روزگاری، لاقانونیت، رشوت اور عدم مساوات پر مبنی معاشرتی نظام رکھیں اور کہیں ''ہمارے ایشوز یہ ہیں، ہمارے مسائل یہ ہیں۔'' ہم پہلے ان کے ساتھ نبیٹیں گے، اگر ملک میں انصاف ہو گیا، بدامنی ختم ہو گئی، رشوت کی لعنت

ڈھل گئی اور میرٹ قائم ہو گیا تو ہمیں کسی کو پردے کا حکم دینے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔ اسلام کی فطری تعلیمات خود بخود لوگوں کے دل میں جگہ بنا کر ان کے کردار میں جھلکنے لگیں گی۔

ہم خواتین کی یونیورسٹیاں بنا دیں گے جو بچی اس میں پڑھنا چاہے وہ اس میں پڑھے، بات ختم۔ اس میں دو رائے نہیں کہ دینی مدارس میں ابلاغی تربیت کی اشد ضرورت ہے۔ مسلمان اس وقت دنیا کی تیسری بڑی طاقت ہیں۔ آبادی کے لحاظ سے یہ دنیا کے ایک تہائی لوگ ہیں۔ وسائل میں ان کا حصہ ایک چوتھائی ہے۔ یہ دنیا کی سب سے بڑی صارف مارکیٹ ہیں، لیکن پورے عالم اسلام میں ایک بھی اخبار، نیوز ایجنسی، میگزین اور ریڈیو نہیں جو یورپ اور امریکا تو رہا دور جو بیک وقت دس اسلامی ممالک میں سنا اور پڑھا جاتا ہو۔

اس وقت بھی اسلامی ممالک میں نیوز ویک، ٹائم، ایشیا ویک اور ریڈرز ڈائجسٹ جیسے جرائد کی مانگ لوکل میڈیا سے زیادہ ہے۔ ریڈرز ڈائجسٹ ہر مہینے دو کروڑ کی تعداد میں شائع ہوتا ہے اور یہ تعداد اسلامی ممالک کے میڈیا کی مجموعی تعداد سے زیادہ ہے، پورے اسلامی ممالک میں جتنے اخبارات اور جرائد شائع ہوتے ہیں اور ان جرائد اور رسائل پر جتنا کاغذ استعمال ہوتا ہے اتنا کاغذ صرف امریکا کے ایک شہر ہیوسٹن میں خرچ ہو جاتا ہے۔ دنیا پر اس وقت دس بڑی نیوز ایجنسیاں، 14 ٹیلی ویژن چینل اور 20 اخبارات و رسائل حکومت کر رہے ہیں اور یہ حقیقت ہے ان 44 اداروں میں سے کسی ایک ادارے کا تعلق بھی کسی اسلامی ملک سے نہیں۔ دنیا میں اس وقت 20 بڑے کالج اور یونیورسٹیاں ہیں جو ہر سال ہزاروں کی تعداد میں ابلاغی ماہر پیدا کرتے ہیں لیکن پوری مسلم دنیا میں ان جیسا ایک بھی ادارہ نہیں۔

اسلامی دنیا کی ابلاغیات کا حال:

دنیا میں اس وقت 50 میڈیا ٹائی ہیں ان میں سے صرف 2 کا تعلق اسلامی ممالک سے ہے اور یہ دو سٹیز بھی غیر ملکی اداروں کے کنٹرول میں ہیں۔ اسلامی دنیا کی ابلاغیات سے اس دوری کے تین بڑے نقصانات ہیں: ایک پروپیگنڈے کے سارے ہتھیار مغرب کے ہاتھ میں ہیں۔ وہ جو چاہتے ہیں اور جیسے چاہتے ہیں دنیا کے سامنے تصویر بنا کر پیش کر دیتے ہیں۔ اس ضمن میں آپ افغانستان

اور عراق کی مثال لیں۔ امریکا اور اس کے اتحادیوں نے ایک ماہ میں افغانستان پر اتنا بارود برسایا جتنا دوسری جنگِ عظیم کے دوران مجموعی طور پر استعمال ہوا تھا۔ اس جنگ کے دوران امریکا نے ایٹم بم جتنے مہلک بم استعمال کیے، ڈیزی کٹر اور بموں کی ماں تک چلا دی جس کے نتیجے میں افغانستان کے ایک لاکھ شہری شہید اور زخمی ہوئے۔ اتنی بڑی تباہی کے بعد امریکا افغانستان کے کچھ لوگوں کو پکڑ کر گوانتانا موبے لے گیا۔ امریکی فوج نے انہیں ایکسرے کیمپ میں رکھا، ان پر ظلم و ستم ہوئے۔

یہ ظلم و ستم یقیناً خوفناک تھے لیکن یہ کسی بھی طرح افغانستان میں مرے اور کچلے ہوئے لوگوں کے ساتھ ہونے والے سلوک سے زیادہ المناک نہیں تھے۔ افغانستان میں تو شبرغان میں جو کچھ ہوا اس کی داستانیں ہڈیاں پگھلا دیتی ہیں۔ امریکیوں نے وہاں کنٹینروں میں دو دو سو مجاہدین بھرے اور انہیں مرنے کے لیے صحرا میں چھوڑ آئے۔ لوگوں کو آگ میں زندہ جلا دیا گیا۔ لوگوں کے منہ میں پیٹرول بھر کر آگ لگا دی گئی۔

یہ مظالم گوانتانا موبے میں ہونے والی زیادتیوں سے کہیں خوفناک تھے، لیکن امریکی اور یورپی میڈیا نے دنیا کی توجہ افغانستان سے ہٹانے کے لیے گوانتانا موبے کو بھرپور کوریج دینا شروع کر دی۔ ایکسرے کیمپ کی اتنی خبریں، رپورٹیں اور فلمیں چلائی گئیں کہ لوگوں نے احتجاج کرنا شروع کر دیا۔ ان خبروں کے ردِعمل میں امریکی حکومت نے قیدیوں کو مراعات دینا شروع کر دیں انہیں صاف ستھرے کپڑے، بستر اور وضو کے لیے پانی دیا جانے لگا۔ ان کے لیے حلال گوشت کا بندوبست کیا گیا کیمپ میں اذان اور نماز کا اہتمام ہونے لگا اور آخر میں ان لوگوں کو عدالت میں اپیل کی اجازت دے دی گئی۔

مغربی میڈیا ان مراعات کے بارے میں خبریں شائع کرتا رہا۔ اس کا یہ نتیجہ نکلا لوگ افغانستان میں برسائے جانے والے بارود کو بھول گئے۔ لوگوں نے ان ایک لاکھ معذوروں اور مُردوں کو بھی بھلا دیا جو امریکی گولیوں اور گولوں کا رزق بن گئے تھے اور وہ امریکا کی انسان دوستی، انسانی حقوق کی پاسداری اور قانون پرستی پر واہ واہ کرنے لگے۔ اسی طرح امریکا نے عراق کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ ہزاروں لاکھوں عراقی پچھلے ایک برس میں شہید اور معذور ہوئے۔ دنیا

کی مضبوط ترین اکانومی بیٹھ گئی۔ امریکی اعداد و شمار کے مطابق عراق جنگ میں عراق کے 10 لاکھ بچے معذور ہوئے لیکن امریکی میڈیا! اُف، امریکا نے عراق کا ایک بچہ اُٹھایا جس کی دو ٹانگیں اور ایک ہاتھ اُڑ گیا تھا۔ امریکی فوج اسے امریکا لے کر گئی۔ اس کو مصنوعی ہاتھ پاؤں لگائے اور پھر اسے عالمی میڈیا کے سامنے پیش کر دیا۔ میڈیا نے امریکا کی انسان دوستی اور معذور پرستی کی واہ واہ سے آسمان سر پر اُٹھالیا۔ صرف ایک بچے کے تین مصنوعی اعضاء کے ذریعے امریکا نے لوگوں کے حافظے سے عراق پر برسایا جانے والا بارود اُڑا دیا۔

تصویر کا اصل رخ:

عراق کی سڑکوں پر گرا خون اور عراقی تاریخ پر تباہی اور بربادی کے پڑے چھینٹے دھو دیے۔ آج امریکی مائیں ان دس لاکھ معذور عراقی بچوں کے آنسو تو بھول چکی ہیں جو امریکی بموں اور گولیوں کا شکار بنے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے معذور ہو گئے لیکن وہ اس بچے کے تین مصنوعی اعضاء کی تعریف کرتے نہیں تھکتے جسے امریکی فوج نے اپنے پروپیگنڈے کی توپوں کا بارود بنا دیا تھا۔ آج امریکا کے تمام اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی ویژن چینل روزانہ عراق میں کام کرنے والے امریکی فوجیوں کی رپورٹیں جاری کرتے ہیں۔

ان رپورٹوں میں امریکی فوجیوں کو فلاح عامہ کے کام کرتے دکھایا جاتا ہے۔ یہ فوجی کہیں کسی بزرگ عراقی شہری کو سڑک پار کرا رہے ہوتے ہیں۔ کہیں عراقی بچوں کے ساتھ کرکٹ کھیل رہے ہوتے ہیں اور کہیں بیماروں میں مفت ادویہ تقسیم کر رہے ہوتے ہیں۔ یہ فلمیں اور رپورٹیں یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتی ہیں امریکی فوج عراق میں فلاح عامہ کے بہت کام کر رہی ہے، لیکن جس میڈیا سے یہ رپورٹیں نشر ہوتی ہیں وہ میڈیا یہ بھول جاتا ہے اس عراق میں وہ "فلوجہ" بھی ہے جس پر امریکا قہر بن کر ٹوٹ رہا ہے جس میں اب تک ایک لاکھ بے گناہ لوگ مر چکے ہیں۔

دنیا عراق میں مہربانیاں تقسیم کرنے والے امریکیوں کی اس اصل تصویر سے ناواقف ہیں۔ لوگ واقف بھی کیسے ہو سکتے ہیں کہ دنیا کا کوئی میڈیا لوگوں کے سامنے یہ اصل تصویر پیش ہی نہیں کر رہا۔ یورپ، امریکا اور مشرق بعید میں صرف یہودی چینل دیکھے جاتے ہیں۔ صرف یہودی

اخبارات اور رسائل بکتے ہیں جبکہ مسلمانوں کے چینلوں اور جرائد کی یورپ تک رسائی ہی نہیں، لہٰذا اس دوری کا پہلا نقصان یہ ہے مسلمانوں کا مظلوم دنیا کے سامنے مظلوم ثابت نہیں ہوتا۔ ظالم لوگ صرف میڈیا کے ذریعے اپنے ظلم کو رحم اور محبت کی شکل دے دیتے ہیں۔ وہ جس خنجر سے مسلمان کا گلا کاٹتے ہیں اس خنجر پر ذرا سا شہد لگا کر اسے متبرک بنا دیتے ہیں۔

میڈیا کا کمال:

اس دوری کا دوسرا نقصان کاروبار ہے، اہلِ مغرب میڈیا پر اشتہاری مہم چلاتے ہیں اور اس مہم کے ذریعے اپنی مصنوعات کو اسلامی معاشروں کا حصہ بنا دیتے ہیں۔ آپ مشروبات سے لے کر لباس تک دیکھیے آپ کو پوری مسلم دنیا مغربی کمپنیوں کی خریدار نظر آئے گی اور تیسرا بڑا نقصان ثقافت ہے۔ مغربی ممالک نے میڈیا کو استعمال کر کے پوری اسلامی دنیا کی ثقافت کو یورپی رنگ دے دیے ہیں۔ آج لوگ عید پر بھی جب دوسروں کے گھر جاتے ہیں تو کیک اور پھول لے جاتے ہیں۔ سعودی عرب تک میں سالگرہ اور برتھ ڈے منائے جاتے ہیں۔ کرسمس، ویلنٹائن ڈے اور نیو ایرنائٹ منائے جاتے ہیں۔ لوگ لمبی چھٹیوں اور ویک اینڈز پر جاتے ہیں اور عربی زبان تک میں انگریزی کے لفظ شامل ہو چکے ہیں۔ یہ کیا ہے؟

یہ سب میڈیا کا کمال ہے۔ یہ سب اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کا کرشمہ ہے۔ طب کا ایک اُصول ہے کہ آپ جراثیم کو جراثیم اور وائرس کو وائرس ہی سے مار سکتے ہیں۔ یہ فارمولا صرف طب تک محدود نہیں۔ زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی یہی اُصول کارفرما ہے۔ ہتھیار کا مقابلہ ہتھیار ہی سے ہوتا ہے، جنگوں کا خاتمہ جنگوں ہی سے ممکن ہے اور طاقت کا جواب بھی طاقت ہی ہوتی ہے۔ میڈیا کا مقابلہ بھی میڈیا ہی سے ممکن ہے۔

ہٹلر کے پروپیگنڈا ماسٹر گوئبلز نے کہا تھا: ''آپ لاؤڈ اسپیکر کو لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے ہی شکست دے سکتے ہیں۔'' اخبار کا مقابلہ اخبار اور ریڈیو کا مقابلہ ریڈیو ہی کر سکتا ہے مگر بدقسمتی سے ایک تو اسلامی ممالک مجموعی طور پر یورپی میڈیا کا مقابلہ نہیں کر سکتے اور دوسری طرف اسلامی ممالک میں جو چھوٹا موٹا اور لولا لنگڑا میڈیا موجود ہے اس میں بھی مذہبی طبقے کا حصہ نہ ہونے کے

برابر ہے۔ آپ پاکستان ہی کو لے لیجیے، پاکستان میں 1100 کے قریب اخبارات اور جرائد نکلتے ہیں لیکن ان میں مذہبی جماعتوں، اداروں اور مدرسوں کے اخبارات نہ ہونے کے برابر ہیں۔

پاکستان کی 18 یونیورسٹیوں میں ابلاغیات کے شعبے ہیں لیکن ان شعبوں میں مذہبی طبقے کا ایک بھی طالب علم دکھائی نہیں دیتا، نہ ہی میری معلومات کے مطابق پورے پاکستان کے کسی مدرسے میں ابلاغیات کی تربیت کا اہتمام ہے۔ اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی ویژن چینلز کی اندرونی حالات اس سے بھی پتلی ہے۔ آپ وہاں جا کر دیکھیں تو آپ کو پورے کے پورے دفتر میں کوئی باریش شخص نظر نہیں آئے گا۔ ابلاغی اداروں میں نماز کے وقت کوئی نمازی اور رمضان میں کوئی روزے دار نہیں ملتا۔ ان لوگوں کو یہ تک پتا نہیں ہوتا کہ شعبان پہلے آتا ہے یا رمضان، لہٰذا اس لادینیت سے وہی کچھ برآمد ہوتا ہے جو ہو سکتا ہے۔ یہ لوگ پاکستان کے اندر بیٹھ کر مغرب کی سفارت کرتے ہیں، لادینی طاقتوں کے گماشتے اور جاسوس کا کردار ادا کرتے ہیں۔ جب علمائے کرام نے صحافت جیسے جدید شعبوں کا پروگرام شروع کیا تو ان لوگوں کے لیے میرے دِل سے دُعا نکلی۔

مغربی یلغار کا جواب مگر کیسے؟

ایسے اخبارات اور رسائل کی جتنی ضرورت اس وقت تھی وہ پاکستان کے کسی عہد میں نہیں تھی۔ ان دو اخبارات نے پاکستان میں ابلاغی فحاشی اور ابلاغی ابتری کا نہ صرف راستہ روکا بلکہ انہوں نے طاغوتی طاقتوں کی شرانگیزیوں کا ڈٹ کر مقابلہ بھی کیا۔ آج یہ دو اخبارات جہاں ایک نئی روایت کے امین بن چکے ہیں وہاں انہوں نے اسلامی ثقافت اور دینی فکر کے گرتے ہوئے پرچم کو بھی تھام رکھا ہے۔ آج یہ اس ملک میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی بنیاد بن چکے ہیں۔ ان اخبارات کے بعد ضرورت تھی کہ دینی اور مذہبی طبقے کو ابلاغی ضروریات اور صحافتی تکنیک سے متعارف کرایا جائے۔ انہیں بتایا جائے وہ کام جو دس لاکھ فوج اور 40 لاکھ توپیں مل کر نہیں کر سکتیں وہ کام صحافی کے قلم سے چٹکی بجاتے ہوئے کیسے ہو جاتا ہے؟ جس تبدیلی کا راستہ ملک اور معاشرے صدیوں تک دیکھتے رہتے ہیں، جس خواب کی تعبیر کئی نسلوں کی پلکوں پر جمی رہتی ہے، اسے چند کتابیں، اخبارات کے چند صفحے، چند نقشے اور چند تصویریں کس طرح

حقیقت بنا دیتی ہیں؟ وہ کون سی طاقت، کون سی قوت ہوتی ہے جو قوموں کے حوصلے توڑ دیتی ہے اور وہ کون کون سے لفظ اور ان لفظوں کے استعمال کے کون کون سے ڈھنگ ہوتے ہیں جو ٹوٹے حوصلوں کو فولاد بنا دیتے ہیں؟

ہمیں یہ جان کر خوش گوار حیرت ہوئی جامعۃ الرشید اور چند دیگر مدارس مدرسے کے نوجوانوں کو ابلاغیات کا کورس بھی کروا رہے ہیں اور صرف کتابی کورس ہی نہیں عملی تربیت کا اہتمام بھی ان اخبارات میں کروا رہے ہیں۔ کاش! اس ملک کے تمام علماء اور مدرسے کے طالب علم ایسے کورسز کر سکتے۔ یہ حضرات اس قابل ہو سکتے یہ مغرب پر ابلاغی حملہ بے شک نہ کر سکتے لیکن یہ ان حملوں، ان چالوں کو سمجھ ضرور سکتے۔ یہ اتنا ضرور معلوم کر سکتے، فلاں خبر، فلاں فقرہ اور فلاں آواز کیوں سنائی گئی تھی اور طاغوتی طاقتیں اس خبر اور اس خبر کے اس فقرے سے کیا کیا فوائد حاصل کریں گے؟ کاش! ہمارے تمام دین دار لوگ میڈیا کے ماہر ہوتے۔ اگر ایسا ہو جائے تو ہم مغرب کی یلغار کا جواب نہ سہی، رُخ تو پھیر سکتے ہیں۔

اب پچھتائے کیا ہوت:

نوجوان فضلاء اس ضرورت کو سمجھیں۔ اس تقاضے کے لیے خود کو تیار کریں جو ان کے در پر دستک دے رہا ہے۔ دینی مدارس میں تعلیمی سال ختم ہو رہا ہے۔ ہزاروں طلبہ فارغ التحصیل ہوں گے۔ ان میں اکثر کو اپنے مستقبل کی فکر ہوگی۔ ان کو اپنے میدانِ کارزار کا انتخاب کرنا ہوگا۔ کوئی تدریس کرنا چاہتا ہے۔ کسی کو خطابت کا شوق ہے۔ کوئی اسکول کالج میں عربی ٹیچر لگنے کا متمنی ہے۔ کوئی اپنے نجی کاروبار کو سہارا دینا چاہتا ہے۔ کوئی ایسی تحریکوں کا مستقل کارکن بننا چاہتا ہے جو اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے برسرِ پیکار ہیں۔ کوئی جدید طرز کا اسکول مدرسہ کھولنا چاہ رہا ہے۔ کوئی دعوت و تبلیغ میں اپنی زندگی کھپانے کے لیے تیار ہے۔ کسی کو کچھ بھی سمجھ نہیں آ رہا اور وہ حیران و پریشان ہے۔

ایسا یقیناً اسی کے ساتھ ہوتا ہے جس کو اپنے استاذ یا والدین کی بددعا لگی ہوتی ہے یا پھر اس نے اپنے تعلیم کے زمانے میں غیر نصابی سرگرمیوں میں اپنا قیمتی وقت ضائع کیا ہوتا ہے۔ دورانِ تعلیم اگر

کوئی اس کا خیر خواہ اس کے فائدہ کی بات کرتا تو اس کو وہ اپنا "دشمن" سمجھتا تھا۔ بعض طالب علموں کو ایسی سرگرمیوں کا چسکا ہوتا ہے جو ان کے لیے مفید نہیں ہوتیں اور ان کو ہوش اس وقت آتا ہے جب تعلیم مکمل کرنے کے باوجود "فارغ" ہوتے ہیں تو ان کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا۔

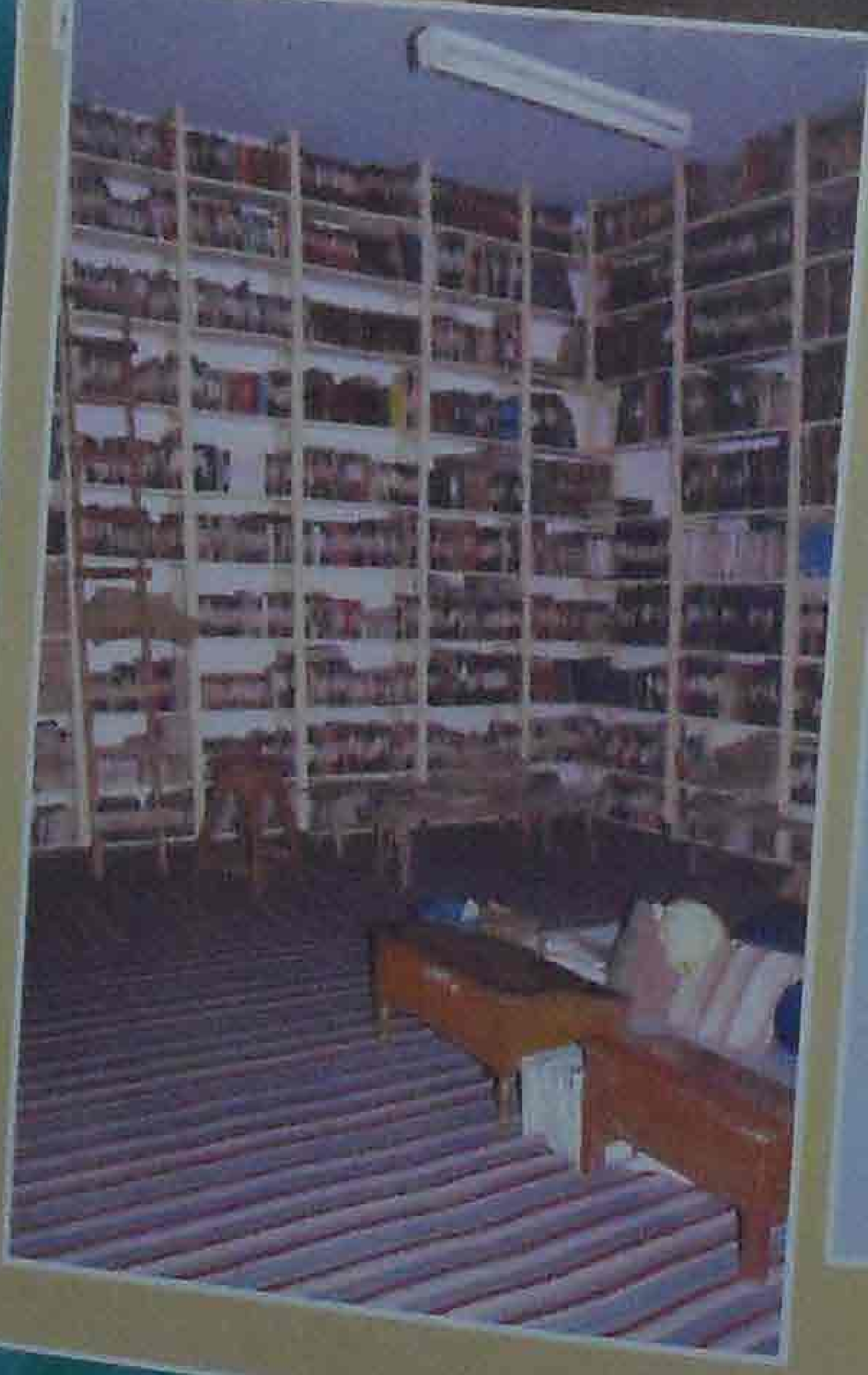
میں بذاتِ خود ایک ایسے شخص کو جانتا ہوں جو دورانِ تعلیم نقصان دہ سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا رہا بلکہ قیادت کرتا رہا۔ اپنے ہم کلاسوں اور دور اندیش اساتذہ کے سمجھانے اور تنبیہ کرنے کے باوجود باز نہ آیا...... یہاں تک کہ اس کی فراغت کا وقت آگیا۔ رسمی طور پر اس کے سر پر دستارِ فضیلت تو سج گئی لیکن اندر سے وہ کھوکھلا اور جاہل ہی تھا۔ اب اگر وہ کسی مدرسے میں تدریس کے لیے درخواست دیتا ہے تو وہ مسترد کردی جاتی ہے۔ اگر کسی مسجد میں امام لگ جائے تو مقتدیوں کی صحیح رہنمائی نہیں کرسکتا۔ اگر کسی چھوٹے موٹے رسالے میں پروف ریڈر کے لیے قسمت آزمائی کرتا ہے تو اس کی اُردو املاء اور ترقیم میں ایسی ناقابلِ اصلاح غلطیاں ہیں کہ اسے نااہل قرار دیدیا جاتا ہے۔

اب وہ کھیتی باڑی کا کام کررہا ہے اور زراعت کے احکام ومسائل یاد نہ ہونے کی وجہ سے اسے بھی شریعت کے مطابق نہیں کرسکتا ورنہ وہ کھیتی باڑی کرنے والوں کی رہنمائی کے فرائض تو انجام دے سکتا تھا۔ آج وہ کفِ افسوس ملتا ہے اور اس وقت کو یاد کرکے حسرت کے ساتھ کہتا ہے: کاش! میں اپنے شفیق اساتذہ اور خیر خواہ ساتھیوں کی بات مان لیتا۔ محنت کرکے کچھ حاصل کرلیتا۔ علم سے اپنا دامن بھرلیتا لیکن اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت!

سید احمد شہید کے چشم وچراغ:

عزیز طالب علم ساتھیو! باقی سب کام تو فارغ التحصیل ہونے کے بعد کیے جاسکتے ہیں لیکن تعلیم...... جی ہاں تعلیم...... بعد میں اس طریقے سے مکمل نظم وضبط کے ساتھ ہزار جتن کے باوجود حاصل نہیں کی جاسکتی۔ تجربات اور مشاہدات میں اس کی کئی مثالیں مل سکتی ہیں۔ لہٰذا زیر تعلیم طلبہ سے بصد خلوص اور دست بستہ التجا ہے کہ خدارا! اپنا قیمتی وقت ضائع مت کیجیے۔ اپنے آپ کو تباہی سے بچائیے۔ قوم کے ایک ایک پیسے اور اپنے ایک ایک لمحے کی قدر کیجیے۔ اپنے آپ کو علمی لحاظ سے



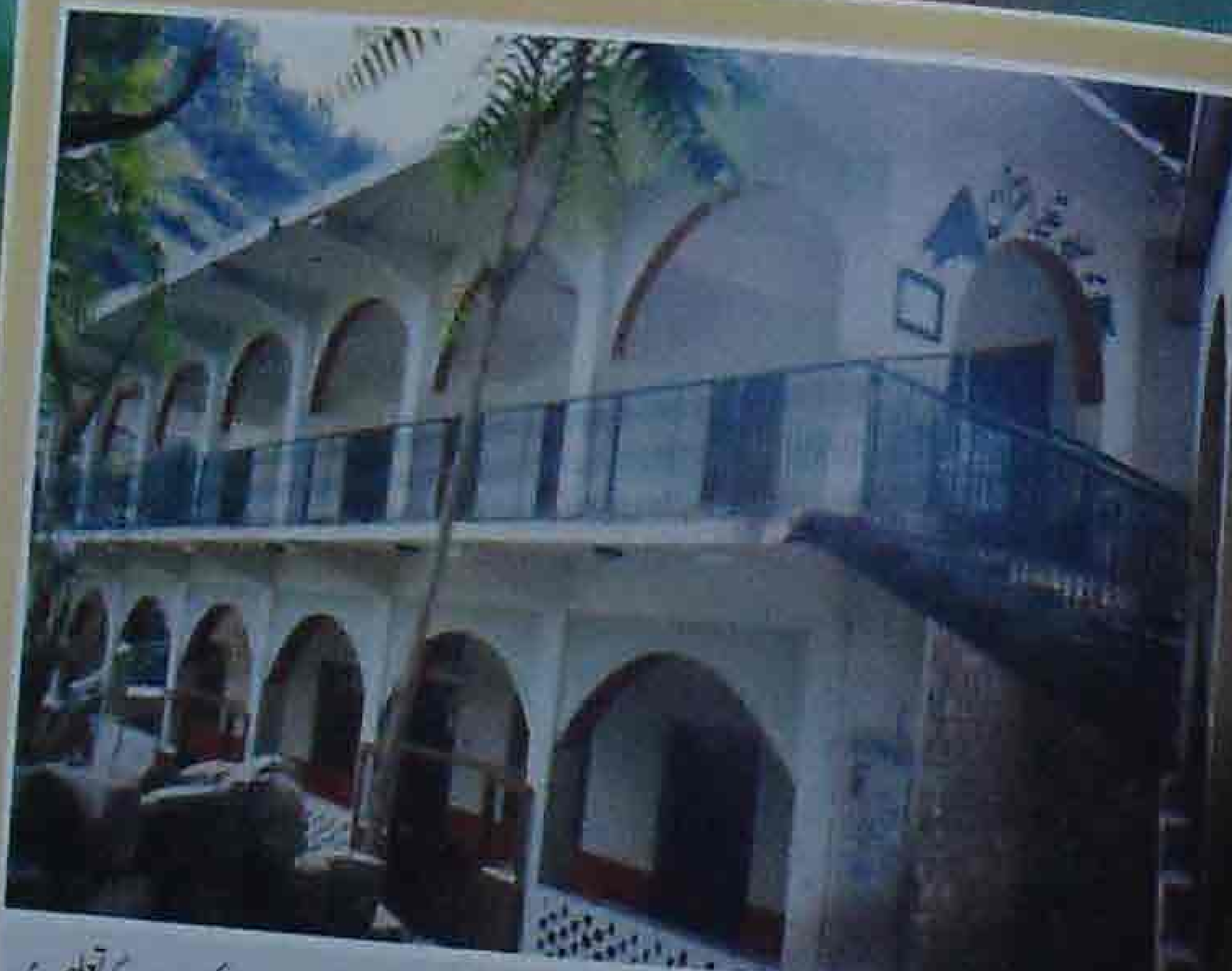


ملتان کے مشہور ادارے ''جامعہ قاسم العلوم'' کا مرکزی دروازہ اور کتب خانہ۔ کتب خانے میں سلیقے سے لگی ہزاروں کتابیں طلبہ کے ذوق مطالعہ اور سلیقے کی آئینہ دار ہیں۔





''جامعہ مفتاح العلوم'' سیلائٹ ٹاؤن کی مرکزی عمارت اور مسجد۔ اسے سرگودھا شہر کے چند بڑے مدارس میں شمار کیا جاتا ہے۔



آزاد کشمیر ضلع باغ کی مشہور درسگاہ "مدرسہ عربیہ تعلیم القرآن"۔ یہاں پر شعبہ حفظ اور چند ابتدائی درجوں کی تعلیم دی جاتی ہے۔



"جامعہ اسلامیہ راولپنڈی"۔ صدر بازار کے مرکزی علاقے میں واقع یہ ادارہ مدتوں سے توحید و سنت کی ترویج کے لیے کوشاں ہے۔





"جامعہ منظور الاسلامیہ لاہور" کے ہوسٹل اور لائبریری۔ نظم وسلیقے کی ان عکسی شہادتوں کو کون جھٹلا سکتا ہے؟

مضبوط، مستحکم اور نا قابلِ تسخیر بنانے کی کوشش کیجیے۔ اپنے آپ کو جواہرِ علمی سے مزین کیجیے کیونکہ قیمتی جوہر کی قدر ہر جگہ اور ہر زمانے میں ہوتی ہے۔ یہ جہاں جاتا ہے ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے۔

بعض فضلائے کرام اپنے آپ کو دور اندیش اساتذہ کے حوالے کر دیتے ہیں کہ وہ جہاں چاہیں ہماری صلاحیت کے مطابق لگا دیں۔ جو چاہیں ہمارے لیے میدان منتخب کریں اور ہونا بھی ایسا ہی چاہیے چنانچہ ایسے ہی فضلاء کامیاب نظر آتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اصحابِ صفہ کی جہاں چاہتے، جیسے چاہتے، جس شعبے میں ضرورت اور کھپت ہوتی تشکیل فرمادیا کرتے تھے اور جن کی تشکیل کی جاتی تھی وہ بھی اسی میں خوشی محسوس کرتے تھے کیونکہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ اس وقت اسلام ہم سے یہی تقاضا کر رہا ہے۔ اُمت کی ضرورت یہی ہے۔

جب تک یہ سلسلہ چلتا رہا اس وقت تک قال اللہ وقال الرسول پڑھنے والوں کو فراغت کے بعد اپنے کیریئر کی کوئی فکر نہیں ہوتی تھی۔ ماضی قریب میں بھی کسی حد تک یہ طریقہ جاری تھا۔ علامہ محمد یوسف بنوری، مفتی محمد شفیع دیوبندی، مفتی ولی حسن ٹونکی اور مفتی رشید احمد لدھیانوی رحمہم اللہ بھی اپنے شاگردوں کی دین کے تقاضوں کے مطابق ہی تشکیل کیا کرتے تھے۔ وہ حضرات سوچتے تھے کہ گردوپیش، ملکی اور عالمی سطح پر اس وقت کہاں کہاں، کس کس شعبے میں تقاضا ہے چنانچہ اس تقاضے کے مطابق اپنے شاگردوں کو اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق ''مسلح'' اور اوصاف حمیدہ سے مزین کر کے اُتارتے تھے۔ ان کے ساتھ ولی اللہ، صاحب نسبت اور دور اندیش اساتذہ کی دُعائیں اور دوائیں دونوں ہی ہوتیں۔ وہ شاگرد بھی اپنے اساتذہ کی ''لاج'' رکھنے کے لیے ہر وقت اسی کام میں جتے رہتے۔ یہاں تک کہ کامیابی ان کے قدم چوم لیتی۔ اس سلسلے میں آپ تاریخ کا ایک حوالہ پڑھیے۔ مولانا ڈاکٹر حکیم عبدالعلی صاحب، مفکر اسلام مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ کے بڑے بھائی اور ان کے مربی تھے۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں: ''وہ اپنی بہت سی خصوصیات وکمالات کی وجہ سے ایک نادر روزگار شخصیت تھے، جس میں قدیم وجدید تہذیب وثقافت اور مشرقی ومغربی علوم کا نہایت حسین ودلآویز امتزاج نظر آتا ہے۔ جو''مرج البحرين يلتقيان، بينهما برزخ لا يبغيان'' کی

ایک عملی تفسیر تھا۔ ان کی زندگی میں مسلمان نوجوانوں، مدارس کے فضلا اور عصری جامعات و یونیورسٹیوں کے فارغین اور ملی اداروں کے سربراہوں کے لیے بہت سے سبق اور قابل تقلید نمونے ہیں۔''مولانا عبدالعلی صاحب ندوہ کو پورے برصغیر پاک و ہند میں یہ منفرد اعزاز حاصل تھا کہ وہ بیک وقت فاضل ندوۃ العلماء، فاضل دیوبند، طبیہ کالج کے سند یافتہ حکیم، بی ایس سی، اس کے بعد کنگ جارج میڈیکل کالج لکھنؤ سے ایم بی بی ایس کے ڈگری یافتہ تھے۔ برصغیر کے مشہور و معروف عالمانہ، عارفانہ اور مجاہدانہ پس منظر رکھنے والے نامور خانوادۂ سید احمد شہید کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے والد ماجد حکیم عبدالحیی صاحب نے ان کی بڑی عمدہ تربیت کی تھی۔

تعلیم کے ساتھ تربیت بھی:

اس خط سے اندازہ لگایئے جو والد ماجد نے اپنے نوعمر بیٹے نو سالہ عبدالعلی کو لکھا ہے جب ان کو خبر ملی انہوں نے قرآن شریف ختم کرلیا ہے اور فارسی کے بجائے عربی شروع کردی ہے۔''جان پدر! میں نے سنا ہے قرآن شریف تمہارا ختم ہوگیا۔ الحمد للہ اس سے زیادہ خوشی کس بات سے ہوسکتی ہے؟ یہ بھی سنا تم نے میزان شروع کی ہے۔ تمہارے اس شوق و رغبت سے طبیعت خوش ہوئی۔ خدا نظر بد سے بچائے، مگر ابھی میزان پڑھنے کا وقت نہیں آیا۔ اس پر وقت زیادہ صرف ہوگا اور آئے گا نہیں۔ تم فوراً میزان چھوڑ دو اور بجائے اس کے اصول فارسی شروع کرو۔ میں اس کو بھیجتا ہوں، صبح کو پہلے تلاوت قرآن شریف کی مکتب میں جاکر کرو۔ ربع سے کم نہ ہو۔ اس کے بعد اصول فارسی پڑھو اور دوسرے وقت فارسی کی اور برابر لکھتے رہو کہ کس قدر رہوئی؟ اصول فارسی کو سمجھ کر پڑھنا اور زبانی یاد کرنا، علاوہ اس کے اپنا خط درست کرو اور فارسی رقعے لکھو۔ ان سب باتوں میں ایسی محنت کرو کہ ان سے جلد فراغت ہوجائے، پھر عربی شروع کرائی جائے گی۔ حساب سیکھنے میں محنت کرو، اب تم نے نہیں لکھا کہ حساب میں کون سے قاعدہ سیکھتے ہو؟''

حکیم عبدالحیٔ صاحب ندوۃ العلماء میں اپنی ذمہ داریوں کی وجہ سے اکثر سفر میں رہتے تھے۔ اس لیے ہونہار صاحبزادے کو اس کے دادا یعنی اپنے والد (جو فارسی کے جید عالم، ادیب و انشاء پرداز اور اعلیٰ درجے کے خوش خط تھے) کے پاس بھیجا جائے تاکہ عبدالعلی ان سے پورا استفادہ

کر سکیں۔ چنانچہ اس خط میں آپ کو یہ فکر نمایاں نظر آئے گی۔ ''نورِ چشم عبد العلی سلمہ! تمہارا خط آیا، خوشی ہوئی، اس مرتبہ تم نے بہت دیر میں خط بھیجا۔ میں اچھا ہوں اور تمہاری کامیابی اور عمر و اقبال وعلم وعمل کے لیے دُعا کرتا ہوں۔ تمہاری تعلیم کے متعلق جو میں نے لکھا ہے، اس پر رائے بریلی جا کر عمل کرنا۔

اب تمہاری مکتبی تعلیم کا وقت گزر گیا ہے، اب تمہیں طالب علمانہ طریقے پر پڑھنا چاہیے۔ اگر تم نے والد ماجد دام ظلہ سے خاطر خواہ فائدہ اُٹھایا تو تم سے زیادہ خوش قسمت کوئی نہیں ہو سکتا۔ اس زمانے میں فارسی اُٹھتی جاتی ہے اور میرے نزدیک وہ بہت ضروری چیز ہے۔ خدا کی مہربانی سے تم کو اس کے حاصل کرنے کا عمدہ موقع ہے۔ والد ماجد سے بہتر اس کا جاننے والا دور دور تک کوئی نہیں۔ تم ان کی ایسی اطاعت کرنا کہ وہ تم کو دل سے پڑھائیں۔ واقعات نویسی کی مشق بھی کرنا اور وصلی پر خط کی مشق بھی کرنا۔ باقی عربی وحساب مولوی محمد احسن صاحب سے پڑھنا وسیکھنا۔ بریلی کے لڑکے بڑے کھلنڈرے ہیں، تم دل بہلانے کو کھیلنا، مگر اتنا نہیں جس سے حرج ہو۔'' تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت بھی جاری رہی۔ ہونہار بچہ، باپ سے دور ہے مگر فکر وخیال سے محو نہیں۔ ذرا اس خط کو پڑھیے اور بتایئے کہ کس قدر قیمتی نصائح ہیں جو ایک سن رسیدہ اور سرد گرم چشیدہ والد اپنے معصوم بچے کو کر رہے ہیں۔

یہ بڑی نعمت ہے:

معلوم نہیں تم نے پنج گنج اور ''انوار سہیلی'' کتنی پڑھ لی؟ مطالعہ میں دل لگتا ہے یا نہیں؟ اس کا پورا خیال رکھو کہ دوران مطالعہ مطلب پوری طرح واضح ہوتا جائے۔ استاذ پر تکیہ کرنا نادان بچوں کا کام ہے۔ تم کو اللہ تعالیٰ نے حوصلۂ بلند عطا کیا ہے، اس لیے ایک مطلوب پر قناعت نہ کرنا بلکہ ہمیشہ مافوق پر نظر رکھنا اور عورتوں اور نوعمروں کی صحبت سے پرہیز کرنا۔ مرشد کی اولین نصیحت یہ ہے کہ صحبت ناجنس سے ہمیشہ دور رہنا۔ جگر پارۂ من! ادب کو ہر کام میں ملحوظ رکھنا چاہیے کہ یہی اقبال مندی وترقی کی کلید ہے۔ اپنے کو بے ادبی وبدتمیزی کا عادی بنانا بہت معیوب اور شریف زادوں سے معیوب تر ہے۔ خدا سے ہمیشہ اس کی دُعا کرتے رہنا چاہیے کہ ادب کی توفیق دے۔ خوش خطی،

تصحیح املا اور انشا تمہارے لیے بہت اہم چیز ہے۔ اس سے غفلت نہ ہونی چاہیے۔''

اس طریقے سے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے والا بچہ ندوۃ العلماء پہنچتا ہے جو اس کا گھر ہی تھا کہ والد صاحب اس کے نظام اور روح رواں تھے۔ ندوہ سے فراغت کے بعد والد صاحب نے فقط اتنی دینی تعلیم پر اکتفا کافی نہ سمجھا۔ ان کو شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب اور دیوبند کے دیگر اکابر ومشائخ سے استفادہ کرنے کے لیے دارالعلوم دیوبند بھیجنا ضروری سمجھا۔ چنانچہ اب نوجوان عبدالعلی دیوبند آ گئے۔ یہاں بھی والد صاحب ان کو پند ونصائح اور درد دل وسوز جگر سے معمور محبت نامے بھیجتے رہے۔ ذرا ان خطوط کو دیکھیے جو خط نہیں دل کے ٹکڑے معلوم ہوتے ہیں۔ دیوبند پہنچے کے بعد یہ پہلا خط معلوم ہوتا ہے:

''تم کو وہاں بھیجنے کا پہلا مقصد یہ ہے مجھ سے کچھ دنوں علیحدہ رہو اور زمانہ کے نشیب وفراز کو سمجھو۔ دوسرے مولانا محمود حسن صاحب کی صحبت سے فائدہ اٹھاؤ۔ تیسرے دینیات کا اکتساب بطریقہ احسن، چوتھے تمہاری بے زبانی کم ہو اور وعظ کہنے کی جرات وسلیقہ پیدا ہو۔ اگر ان مقاصد کے حاصل کرنے میں تم کو کامیابی نہ ہوئی تو میرے لیے بڑی کوفت اور رنج وصدمہ کا باعث ہوگا۔ اللہ تمہاری مدد کرے اور علم وعمل میں تم کو مجھ سے بدر جہا بہتر وبالاتر ترقی عطا فرمائے۔ سحر خیزی اور جماعت کا التزام محبت وشوق سے کرو۔ یہ بڑی نعمت ہے۔''

دارالعلوم سے فراغت کے بعد:

ایک دوسرے خط میں جس پر دیوبند کے ڈاکخانہ کی 15 جنوری 1911ء کی مہر ہے، لکھتے ہیں:

''اپنی ترقی تعلیم کی طرف متوجہ رہو۔ کچھ حرج نہیں اگر ''نسائی'' نہیں ہوئی ''توضیح تلویح'' مقدمات اربعہ تک ضرور پڑھو۔ زیادہ ضروری کتابیں یہ ہیں: بخاری شریف، بیضاوی، مطول، ہدایہ۔ بخاری شریف مولانا محمود حسن صاحب سے پڑھنا، اُمید ہے کہ ترمذی کے بعد وہ بخاری پڑھائیں گے۔ باقی کتابیں جو پڑھ رہے ہو تمام ہو جائیں تو مندرجہ بالا کتابوں کے پڑھنے کا خیال رکھنا، بعد مطالعہ ومذاکرہ کے زیادہ وقت طلبہ سے مختلف مسائل پر مباحثہ کرتے رہو۔ اس سے فائدہ ہوگا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ اور وعظ کہنے کی مشق کرو، نماز پڑھانے کی عادت ڈالو، تمہیں وہاں بھیجنے کا مقصد یہی ہے کہ

جھجک نکل جائے۔ خدارا! مجھے نا اُمید نہ کرنا۔ میں نے اللہ کے بھروسے پر بہت سی توقعات تم سے وابستہ کر لی ہیں۔ مولانا محمود حسن کی ذات قدسی نمونہ سلف ہے، ان کے اخلاق کا مطالعہ رکھو۔"

ایک اور خط میں لکھتے ہیں: "تم منجملہ دیگر اسباق کے ترمذی شریف اور توضیح وتلویح پر زیادہ محنت کرنا اور مطالعہ اچھی طرح کرنا۔ وہاں جانے اور سفر کی زحمت اُٹھانے کا ماحصل یہی ہے۔ فتویٰ نویسی بہت توجہ سے کرنا اور فرائض کی تخریبوں کو خوب ذہن پر چڑھالینا۔ وہاں تقریر کے جو جلسے ہیں، ان میں بھی باضابطہ شریک ہونا اور تقریر ووعظ کی مشق کرنا۔" دارالعلوم دیوبند میں شیخ الہندؒ، مولانا انورشاہ کشمیریؒ اور دیگر اکابر ومشائخ سے دورہ حدیث پڑھ کر یہ فاضل نوجوان فارغ ہو چکا۔ اب کچھ عصری تعلیم کے حصول کا شوق ہوا۔ چنانچہ لکھنؤ واپس آ کر عصری تعلیم میں مشغولیت ہوئی اور بی ایس سی کی ڈگری بڑے اعزاز سے حاصل کی۔ اب ان کے سامنے وہی مرحلہ درپیش تھا جو آج کے نوجوان فضلا اور نئے فارغ التحصیل ہونے والوں کو ہوتا ہے کہ دینی خدمت کے لیے کون سی راہ اختیار کی جائے؟ مولانا حکیم ڈاکٹر عبدالعلی صاحب نے اپنے والد کو دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہونے کے بعد ایک خط لکھا تھا۔

اگرچہ خط کے مندرجات کے مطابق ان کی تشکیل نہ ہو سکی اور انہوں نے میڈیکل کالج میں جا کر ڈاکٹری مکمل کی۔ پھر عملی زندگی کی طرف آئے مگر ایک نوجوان فاضل کے خیالات، احساسات اور جذبات کی ترجمانی یہ خط کرتا ہے اور ساتھ ساتھ ایک پختہ سوچ اور راسخ عزم کا بھی غماز ہے۔ "اپنی آیندہ طرز ماند وبود کے متعلق چار پانچ برس سے غور کر رہا ہوں اور اصولاً میں وہی سمجھتا ہوں جو جناب ارشاد فرماتے ہیں یعنی مقصد زندگی حیات اخروی ہے اور دنیا مزرعۂ آخرت ہے۔ اگر دنیا سے مقصود آخرت ہو تو حصول دنیا کے لیے کوشش بھی باعث ثواب ہے۔ اس حیثیت سے معاملات بھی عبادات بن جاتے ہیں۔ پھر بھی دونوں میں وہی فرق ہے جو زمین وآسمان میں ہے۔ ایک مقصود ہے اور دوسرا مقصود کا آلہ۔ اگر منطقی دلائل سے قطع نظر بھی کر لیا جائے تو عرفانِ الٰہی وحیات دنیاوی میں جو کچھ نسبت ہے وہ قلب سلیم سے کسی وقت مخفی نہیں۔

سب سے بڑی چیز:

عرفانِ الٰہی کے بعد ایک انسان کا سب سے پہلا فریضہ یہ ہے کہ اپنے اوقات خدائے عزوجل کی رضا جوئی میں صرف کرے اور حقیقت میں یہ عرفان کامل کے لیے ایک امر لازم ہے۔ طلب معاش اس حیثیت سے ضروری رہے گی جس حد تک یہ رضا جوئی کے لیے کارآمد ہو، اس کے بعد اگر رضا جوئی میں مخل نہ ہو تو مباح ہوگی اور اگر اوقات عزیز کو ضائع کرے تو حرام ہوگی۔ رضا جوئی کے لیے جن اعمال کی ضرورت ہے ان میں بھی فرق مراتب ہے۔ سب سے مقدم وہ اعمال ہیں جو محض ذکر الٰہی وتزکیہ باطن پر مشتمل ہیں۔ مثلاً: صوم وصلوٰۃ، حج وتلاوت، اس کے بعد وہ اعمال ہیں جو اعلائے کلمۃ اللہ وہدایت خلق پر مشتمل ہیں۔ مثلاً: جہاد واستعداد للحرب و وعظ وتذکیر، اس کے بعد وہ اعمال ہیں جو عامہ مسلمین کے منافع دنیاوی پر مبنی ہیں۔ مثلاً: زکوٰۃ وصدقات وصلہ رحم وتعلیم۔

میرے خیال میں ہر مسلمان کو اپنی زندگی میں اس فرق مراتب کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ یہ ترتیب معتدل ومتوسط حالات کے لیے ہے۔ غیر معمولی حالات میں اس میں تغیر کرنا ہوگا۔ مثلاً جس وقت صنف دوم یا سوم کی عبادات زیادہ ضروری ہو جائیں تو صنف اول کی عبادات میں اتنا تغیر کرنا ہوگا کہ ان میں سے فرائض وسنن ادا کرنے کے بعد جو کچھ وقت بچے وہ صنف دوم وسوم میں صرف کیا جائے، لیکن صنف اول کا وہ حصہ جو صنف دوم وسوم کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ مثلاً: ذکر قلب وتلاوت، وہ کسی حال میں نہ چھوڑنا چاہیے۔ دوسرے یہ کہ کسی خاص صنف کے زیادہ ضروری ہونے کی حالت میں تمام اعمال میں خواہ وہ دنیاوی ہوں یا دینی، اسے پیش نظر رکھنا چاہیے اور ان کا انتخاب اس طرح کرنا چاہیے کہ حتی الامکان تمام اعمال کم از کم ضمناً ہی اس صنف کی عبادات کے لیے معین ہوں۔

تذکیر وتعلیم ہمیشہ سے ضروری رہی ہے اور جتنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بُعد زمانی بڑھتا گیا ہے اسی قدر زیادہ ضروری ہوتی گئی ہے لیکن یہ اصول کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ وہی تذکیر مفید ہو سکتی ہے جس کی جانب مخاطب کا نفس متوجہ کیا جا سکے۔ عوام بلکہ خواص کے نفوس بھی امور حاضرہ دنیاوی کی جانب آسانی سے متوجہ ہو جاتے ہیں کہ یہ تقاضائے فطرت ہے اس لیے حکمت

الٰہی اس کی مقتضی ہوئی کہ اس اُمت کے لیے جس کو بھوائے "کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر" ہدایت کا کام سپرد کیا گیا تھا، غلبہ وتفوق فی الارض وعلو بھی لازم کر دیا گیا نہ اس لیے کہ "اکراہ فی الدین" ہو بلکہ اس لیے کہ نفوس امم اس اُمت کی تقلید پر آمادہ ہو جائیں۔ ان کی تذکیر پر توجہ کریں، کیونکہ اہل دنیا جن کے نزدیک دنیا ہی سب سے بڑی چیز ہے۔ کسی کا دنیاوی غلبہ دیکھ کر اسے ہر امر میں اپنے سے بہتر سمجھنے لگتے ہیں یہاں تک کہ اس کے مذہبی اور ذہنی تفوق پر بھی ایمان لے آتے ہیں۔

تیسری قسم کے علوم:

سلیمان علیہ السلام نے سبا کے قاصدوں کو دکھانے کے لیے اپنی عظمت اسی لیے ظاہر کی تھی اور ملکہ سبا کا تخت منگوالینا بھی اسی پر مبنی تھا۔ نیز اسے صرح ممرد میں لے جانا بھی اسی غرض سے تھا کہ وہ اپنے آپ کو ذہنی حیثیت سے بھی حضرت سلیمان علیہ السلام سے کمتر سمجھے اور جس طرح اس نے کانچ کو پانی سمجھنے میں غلطی کی اور اس غلطی کا احساس کیا اسی طرح آفتاب پرستی کی غلطی کا بھی احساس کرلے۔ چنانچہ اس غلطی کے احساس کے بعد ہی اسے اس غلطی کا بھی احساس ہو گیا اور وہ ایمان لے آئی۔ معجزات کا بہت بڑا فائدہ بھی یہی تھا کہ ان کی وجہ سے انبیاء کی عظمت نمایاں ہو جاتی تھی اور قوم کے نفوس ان کے کلام پر غور کرنے کے لیے تیار ہو جاتے تھے۔ اس زمانے کے حالات دیکھتے ہوئے یہ اظہر من الشمس ہے کہ صنف دوم کی عبادات کی اہمیت بڑھ گئی ہے اور ان میں بحکم "واعدوا لھم ما استطعتم من قوۃ" استعداد کی اہمیت سب سے زائد ہے۔

اس وقت کے حالات اس کے مقتضی ہوئے ہیں قتال کی فرضیت استعداد کی طرف منتقل ہو جائے۔ اس لیے مسلمانوں کے تمام اعمال میں یہ اصول کی طرف منتقل ہو جائے۔ اس لیے مسلمانوں کے تمام اعمال میں یہ اصول پیش نظر رہنا چاہیے اور اپنی اپنی ہمت کے مطابق اپنے تمام اعمال میں خواہ وہ معاش کے لیے ہوں، خواہ معاد کے لیے اس کی اعانت کرتے رہنا چاہیے۔ مطلق علم ایک صفت مستحسن ہے۔ اسی طرح تمام علوم طبع سلیم کو مرغوب ہیں، لیکن ان میں سے بعض عملی حیثیت سے انسان کے جسمانی ومادی ترقی کے لیے ضروری ہیں۔ بعض روحانی ترقی اور تزکیۂ باطن

کے لیے اور بعض تفریح طبع کے لیے۔ تحصیل علوم کے احکام پر موقوف ہیں لیکن جو عام تزکیہ باطن کے لیے ضروری ہیں۔ مثلاً: علوم قرآن وحدیث وسیرت ان سے بہر حال شغل رکھنا ضروری ہے۔ جن حالات میں استعداد کی اہمیت بھی بڑھ جائے گی۔ انہیں حالات میں ان علوم کی اہمیت بھی بڑھ جائے گی۔ جن پر استعداد موقوف ہے۔ مثلاً: کیمیا اور ریاضی وطبیعات والسنہ وتاریخ واقتصاد وصناعات وغیرہ استعداد فرض کفایہ ہے۔ اس لیے ان علوم کی تحصیل بھی فرض کفایہ ہو جائے گی۔ جب تک ان علوم کے ماہروں کی تعداد کفایت کی حد تک پہنچ جائے تمام افراد پر اس کا بار رہے گا۔

تیسری قسم کے علوم مثلاً: ادب وشعر بھی بعض وقت مؤکد ہو جاتے ہیں اور بعض وقت مکروہ۔ جب باعث اضاعت وقت ہو جائیں تو مکروہ ہو جائیں گے اور جب ان سے فرائض ومؤکدات کے لیے ذہن کو تیار کرنے کا کام لیا جائے تو مؤکد ہو جائیں گے۔ میں اپنے لیے جو راستہ اختیار کرنا چاہتا ہوں وہ انہیں اصول پر مبنی ہے۔ سب سے پہلے میں تزکیہ نفس، احسان کو ضروری سمجھتا ہوں، اس کے لیے میری یہ خواہش تھی مولانا محمود حسن صاحب سے بیعت کروں اور حسب ضرورت ان کی خدمت میں رہوں۔ اب میں ان کی واپسی کا منتظر ہوں لیکن معلوم نہیں کل کیا ہو۔ اس لیے اس کے متعلق میں جناب سے مشورہ چاہتا ہوں۔ میری ذاتی خواہش ان کے بعد مولانا محمد علی صاحب سے ہے، لیکن مولانا محمود حسن صاحب کے علاوہ اور کسی بزرگ سے میں اسی وقت بیعت کروں گا جب کچھ روز صحبت میں رہ کر مجھے اطمینان قلب حاصل ہو جائے۔

اسسٹنٹ پروفیسری کی اُمیدیں:

تحصیل معاش میں کم وقت معاش کے لیے فیصلہ کرنے سے پہلے مجھے اس کا لحاظ رکھنا چاہیے صرف ہو اور حتی الامکان شدید دماغی محنت نہ برداشت کرنی پڑے تاکہ میں اپنا دماغ اس سے بہتر کاموں میں لگا سکوں۔ بہتر تو یہ ہے کسی خاص مقام یا شخص یا حکومت کا مجھے پابند نہ ہونا پڑے۔ ڈاکٹری میں حسب ذیل وجوہ سے پسند نہیں کرتا۔ اول، اگر برابر پاس ہوتا جاؤں تو پانچ برس مجھے ابتدا کے لیے چاہییں۔ دوم، بہترین قوائے دماغی اس کی تحصیل میں ضائع ہو جائیں گے۔ سوم، مطلب کی کامیابی کی صورت میں اگر ایمان داری سے کام کروں تو نہ وقت بچے گا نہ دماغ۔ جناب

نے محکمۂ تعلیم کی ملازمت کی جانب اشارہ فرمایا ہے، لیکن ٹریننگ کالج کی مدت تعلیم چھ مہینے نہیں بلکہ دوسال ہے۔ اس کے بعد بھی پروفیسری کی اہلیت نہیں پیدا ہوسکتی وہ تو ایم ایس سی پاس کرنے کے بعد صرف کثرت مطالعہ پر موقوف ہے۔ اگر محض خدمت علم مدنظر ہوتی تو میں اپنی عمر اس میں صرف کرتا اور مجھے اُمید تھی نئے نتائج حاصل کرتا، مگر مقصود دین ہے۔ اس لیے اس علم پر جو دین کا وسیلہ نہ ہو، قناعت نہیں کی جاسکتی۔

اگر ٹریننگ کالج میں ایل ٹی پاس کروں تو ہیڈ ماسٹر ہوسکتا ہوں لیکن یہاں مجھے مدرسے کے علاوہ وقت صرف کرنا ہوگا۔ اس کے علاوہ دنیاوی حیثیت سے بھی یہ دونوں جگہیں زیادہ مفید نہیں یعنی اس صوبے میں دو گورنمنٹ کالج ہیں۔ ایک الہ آباد میں دوسرا بنارس میں۔ وہاں مجھے پروفیسری کی کوئی اُمید نہیں۔ اس لیے وہاں انگریز ہی پروفیسر ہوتے ہیں یا ایسے ہندوستانی جو جرمنی وغیرہ کے تعلیم یافتہ ہوں۔ اس لیے مجھے اسسٹنٹ پروفیسری کی اُمید ہوسکتی ہے، مگر دستور یہ ہے کہ حتی الامکان وہ انگریز پروفیسر اپنے شاگردوں ہی کا انتخاب کیا کرتے ہیں اور کالجوں یا اسکولوں میں ملازمت کروں تو تھوڑی تنخواہ پر بہترین وقت، عمر اور دماغ صرف کرنے کے بعد بھی پنشن نہیں مل سکتی۔ محکمۂ تعلیم کے علاوہ اور کسی صیغہ میں مستقل طور پر ملازمت کرنے پر طبیعت راغب نہیں ہے۔ میرے خیال میں تیسری صورت سب سے بہتر ہے۔ یعنی میں مطب کروں لیکن اسی پر اقتصار کرلینا بہتر نہیں معلوم ہوتا۔

اللہ سے بہرحال اُمیدیں ہیں لیکن توکل فعل قلب ہے نہ کہ فعل جوارح۔ اگر تزکیہ باطن سے توکل حاصل ہوجائے تو اور پیشے اس میں مضر نہیں ہوسکتے۔ اگر نہ حاصل ہو تو اور اعمال کے ترک سے توکل پیدا نہیں ہوسکتا۔ اس لیے میں مطب کے ساتھ ہی دوسرا شغل بھی رکھنا چاہتا ہوں۔ یعنی ہندوستانی دواخانہ کے طرز کی دکان اور انگریزی دواسازی یا صابن سازی کا کارخانہ۔ اس میں غالباً جناب خیال فرمائیں وقت زیادہ صرف ہوگا لیکن میرا خیال اس کے برعکس ہے۔ اگر صحیح طریقے پر کام کیا جائے تو محض نگرانی سے سب کام چل سکتے ہیں۔ ابتدا میں جس وقت کام چھوٹے پیمانے پر ہوگا تو مجھے بہ حیثیت صناع کیمیائی کے بعض جزئیات کی براہِ راست نگرانی کرنی ہوگی۔ اس کے بعد

جب میں معمولی درجہ کے کیمیا دانوں کو مقرر کرسکوں گا تو میں مشیر کیمیائی کی حیثیت سے ان کے کام پر نظر رکھوں گا اور محض تجارتی نگرانی ضروری ہوگی۔ عملی تجربے سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

نصاب میں کوئی خامی نہیں:

میرے عظیم استاذ نے میری تشکیل ایک ایسے شعبے میں کردی جس کا نام بھی میں نے پہلی دفعہ سنا تھا چنانچہ میں نے خوش نصیبی سمجھتے ہوئے اس شعبے میں بھرپور محنت کی یہاں تک کہ آج وہ اس شعبے کے انچارج ہیں اور کہتے ہیں: ''قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید'' اللہ والے جو کچھ کرتے اور سوچتے ہیں وہ ''دیکھ، سوچ اور سمجھ'' کر کرتے اور کہتے ہیں۔ مفتی رشید احمد لدھیانوی رحمہ اللہ نے دین کے کئی ایسے شعبے جو کہ اس زمانے میں متروک ہو چکے تھے۔ ان شعبوں میں اپنے شاگردوں کی تشکیل کرکے ان کے احیا کا کام کیا۔ چونکہ یہ دنیا دارالاسباب ہے۔ اس میں وہی لوگ کامیابی سے ہمکنار ہوتے ہیں جو محنت، اخلاص، ایمانداری اور جرأت کے ساتھ حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں۔ اس میں سب سے اہم کردار وقت کا ہے۔ وقت کا صحیح استعمال ہی کسی کو آئن اسٹائن، کسی کو نیوٹن، کسی کو ایڈیسن، کسی کو البیرونی، کسی کو مفکرِ پاکستان اور کسی کو مفتی اعظم بنا دیتا ہے۔ اسی طرح ان کے شاگردوں نے وقت کو صحیح استعمال کرتے ہوئے جدوجہد جاری رکھی اور آج کامیابیاں ان کے قدموں میں ہیں۔ لوگ ان سے راہنمائی لینے پر مجبور ہیں۔

اس وقت بدی کی طاقتیں اسلام اور اس کے محافظوں کو کچا چبانا چاہتی ہیں۔ اس کے لیے وہ اپنی ایجنسیاں، اپنا میڈیا اور دیگر تمام وسائل و ذرائع کا بھرپور استعمال کر رہے ہیں۔ آج ''الکفر ملۃ واحدۃ'' کا عملی مظاہرہ ہو رہا ہے۔ یہ حق و باطل کا آخری معرکہ معلوم ہوتا ہے۔ ان کے مفکرین بند کمرے میں جو سازشیں بُنتے ہیں، میڈیا کے ذریعے دوسرے دن عوام کے ذہنوں میں وہ میٹھے زہر کی صورت انڈیل دی جاتی ہیں۔ دینی مدارس اور علمائے کرام کے خاتمے کو وہ اپنا مقصدِ حیات بنا چکے ہیں۔ وہ انفرا اسٹرکچر جوان کے تھنک ٹینکس نے تیار کیا تھا آج اس میں منظم طریقے سے رنگ بھرے جا رہے ہیں۔ ایسے حالات میں فارغ التحصیل ہونے والے ہونہاروں پر بڑی کٹھن ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ آج تک تو ہمارے اساتذہ نے دشمن کے ہر حربے کا توڑ پیش

کرتے ہوئے اور ان کی تدبیروں کے مقابلے میں تدبیریں کرتے ہوئے اسلام اور اسلام کے قلعوں کا تحفظ کیا اور اس تحفظ میں اپنی جانوں کے نذرانے تک پیش کیے مگر دینِ اسلام پر آنچ نہ آنے دی۔ آج یہ بھاری ذمہ داری مستقبل کے معماروں کے کندھے پر آپڑی ہے۔ لہٰذا اسلام اور اس کے رکھوالوں کے نام کی لاج رکھتے ہوئے یہ نبھانی ہی پڑے گی کیونکہ ہمارے اسلاف نے چودہ سو سال سے دینِ اسلام کو صحیح صورت میں اصل خدوخال کے ساتھ ہم تک پہنچادیا ہے۔

مدارس کے خلاف مغربی یلغار:

ہمیں یاد ہے 2008ء میں مفتی ابولبابہ شاہ منصور نے "مدارس کے خلاف یلغار اور ہماری ذمہ داریاں" کے عنوان سے دینی مدارس کے طلبہ سے خطاب کیا تھا۔ موقع کی مناسبت سے اس کی چیدہ چیدہ باتیں یہاں نقل کرنا چاہتا ہوں۔ مفتی صاحب نے کہا تھا: "صورتِ حال اس وقت یہ ہے دینی اداروں کی طرف عوام اور خواص، اپنوں اور غیروں، دوستوں اور دشمنوں سب کی توجہ بڑھتی جارہی ہے۔ جب دشمن نے دینی اداروں کے خلاف پروپیگنڈا شروع کیا، منفی ذہن سازی شروع کی، ان کا وقار مجروح کرنے کی کوشش کی...... تو چونکہ ان اداروں کے بانیان اور منتظمین کی نیت میں اخلاص کامل تھا...... اس لیے اس پروپیگنڈے کا اثر صرف ان لوگوں کے ذہن پر پڑا جن کے دل پہلے سے داغ داغ تھے۔ جن حضرات کے دل میں ایمان کی روشنی تھی وہ اس سے بچے رہے۔

مغرب اس وقت مدارس کے خلاف تین طرح کی کوشش کر رہا ہے۔ پہلی کوشش یہ ہے دنیا والے اہلِ مدارس سے ایسے ہی بیزار، اور یہ دنیا والوں کے لیے ایسے ہی نامانوس ہوجائیں جیسے کہ خود ان کے یہاں عیسائی مذہبی ادارے معاشرے پر اپنی گرفت کھوچکے ہیں اور روز بروز بے بس ولاچار ہوتے جارہے ہیں۔ عیسائیت کا کردار مغربی دنیا میں صرف اتوار کی سروس تک ہے۔ صرف اس دن گناہوں کے زائل کرنے کے لیے چھینٹے دینے پر اور فیس بھرنے تک ہے۔ وہ چاہتے ہیں مذہب اسلام کے نام لیوا اور اس کے داعی بھی مساجد تک محدود ہوجائیں۔

درود، نذر و نیاز کے علاوہ ان کا معاشرے میں کوئی کردار نہ ہو۔ اس رواں دواں زندگی، جیتے جاگتے معاشرے اور ہر پل بدلتے عالم سے ان کو کوئی سروکار نہ ہو۔ ان کو متحرک و فعال زندگی سے

کاٹ کر آثارِ قدیمہ کی سی حیثیت دلا دی جائے۔ کیا ہم اور آپ یہ ذلت برداشت کر سکتے ہیں؟ کیا ہمارے اکابر کا طرزِ عمل ایسے مواقع میں یہی رہا تھا؟ ہرگز ایسا نہیں تھا۔ اہلِ مغرب اور ان کے ہمنوا چاہتے ہیں سارا معاشرہ ایک اور انداز میں سوچے اور اہلِ مدارس اپنی زندگی کا مقصد کسی اور چیز کو بنا کر چل رہے ہوں۔ یہ اہلِ مدارس ایک ایسے گوشے میں محصور کر دیے جائیں جہاں ان کی بات سمجھنے اور سننے والا کوئی نہ ہو۔

اس کے مقابلے کا طریقہ یہ ہے آپ اپنے شعبۂ تعلقات عامہ کے کردار کا ازسرِنو جائزہ لیں۔ پبلک ڈیلنگ ایک مستقل فن ہے۔ آپ عوام سے کٹ کر نہ رہیں، ان میں نفوذ کریں اور ان کے ساتھ رابطے استوار کریں اور مدارس کی نافعیت اور اہل مدرسہ کی اہمیت اور مدارس کے نصاب ونظام کے معیار اور کارکردگی سے ان کو آگاہ کریں اور ان کو یہ باور کرائیں ہم آپ کی ضرورت ہیں۔ ہمارے بغیر آپ کی دنیا بھی نہیں چل سکتی اور آخرت تو کبھی بن ہی نہیں سکتی۔ وہ آپ کو معاشرے سے کاٹنا چاہتے ہیں۔ آپ اس معاشرے پر چھا جائیں۔ آپ ثابت کریں ہم ایک زندہ جاوید پیغام کے داعی ہیں اور ہم جب حیاتِ جاوداں کی دعوت دیتے ہیں تو خود اپنے پاس ایک زندہ جاوید پروگرام بھی رکھتے ہیں۔ اس بات کو مدِنظر رکھتے ہوئے اب عوام سے اپنے تعلقات استوار کرنے کے لیے ہمیں اپنے اداروں میں فنی بنیادوں پر ''شعبہ تعلقاتِ عامہ'' قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ تعلقاتِ عامہ چونکہ ایک باقاعدہ فن ہے اس لیے اس نصاب میں یہ بھی رکھا گیا ہے۔ پوری امید ہے کہ اس کے بے حد اچھے نتائج دیکھے جا سکیں گے۔

اور ہماری ذمہ داریاں:

دوسری کوشش مغرب کی یہ ہے مدارس کو جن راستوں سے، جن ذرائع سے وسائل حاصل ہوتے ہیں، اس کا انہوں نے بڑی باریک بینی سے جائزہ لیا ہے، بڑی دقتِ نظر سے سروے کیا ہے یہ مدارس اپنی ذاتی آمدنی نہیں رکھتے، ان کے مقابلے میں چلنے والے عصری ادارے کروڑوں کے بجٹ پر چلتے ہیں مگر اس طرح مثبت نتائج نہیں دیتے جس طرح یہ بے سروسامان ادارے نتائج دیتے ہیں۔ ان کے پاس اپنے بجٹ کو پورا کرنے کے لیے کوئی خاطر خواہ، کوئی مستقل نظام نہیں

ہے۔ اس کے باوجود یہ چل رہے ہیں، فروغ بھی پا رہے ہیں، ترقی بھی کر رہے ہیں۔ نئے سے نئے مختلف النوع ادارے وجود میں بھی آ رہے ہیں اور نتائج بھی دے رہے ہیں۔ یہ حیرت انگیز بات ہے۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحابِ صفہ کے ساتھ بیٹھنے کا معجزہ ہے۔ مغرب کی سمجھ میں نہیں آتا یہ کیسے چلتے ہیں؟ انہوں نے ان کا جائزہ لینے کے بعد ظاہری وسائل کو منجمد کرنے کے لیے بند کمروں میں وہ منصوبے بنائے ہیں جو دنیا کھلی آنکھوں سے دیکھ رہی ہے۔

انہوں نے دیکھا لوگ کس طرح ان دینی اداروں پر اعتماد کرتے ہیں اور کیسے اپنے اموال کو اپنی آخرت کا ذخیرہ بنانے کے لیے ان لوگوں پر خرچ کرتے ہیں اور کس طرح بغیر کسی منصوبہ بندی کے اتنے بھاری اخراجات پورے کر رہے ہیں؟ ان کی کوشش ہے مدارس کے وسائل منجمد کیے جائیں۔ لہٰذا ہمیں مدارس کے لیے مستقل بنیادوں پر سوچنا پڑے گا۔ مدارس کے لیے وسائل کیسے حاصل کیے جائیں؟ مدارس کس طرح اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جائیں؟ اس وقت سے پہلے یہ سب کام ہمیں کرنا پڑے گا جب دشمن کوشش کرے گا کہ خدانخواستہ ان کے پاؤں کاٹ دیے جائیں۔ وسائل حاصل کیسے کیے جاتے ہیں؟ ان کو منظم کیسے کیا جاتا ہے؟ کم وسائل کو بہترین مقاصد حاصل کرنے کے لیے کیسے خرچ کیا جاتا ہے؟ یہ ساری "تنظیم" ایک فن ہے جو اس کورس کا حصہ ہے۔

ہم دنیا کے علوم سے مرعوب نہیں لیکن ان میں سے اپنے مطلب اور کام کی چیزوں کی نفی کرنا یقیناً دانشمندی نہیں۔ ہم یہ نہیں چاہتے مدارس کی فضا ان چیزوں سے آلودہ ہو جائے جن چیزوں نے عصری اداروں کو آلودہ کر رکھا ہے اور جن چیزوں نے عصری اداروں میں استاذ اور شاگرد کے مقدس تعلق کو ختم کر دیا ہے۔ درسگاہ کے تقدس کو پامال کر دیا ہے اور تعلیم اور تعلم کے اعلیٰ مقاصد کو انہوں نے روند ڈالا ہے۔ ان چیزوں کو ہم قطعاً مدارس میں نہیں لانا چاہتے۔ ہم مدارس کی روایات اور اساسی اقدار کا تحفظ چاہتے ہیں۔ اسی پر جیے رہنا چاہتے ہیں، اسی پر زندہ رہنا چاہتے ہیں اور اسی پر مرنا چاہتے ہیں۔ ہم کسی قیمت پر اپنا تعلق اپنے اکابر اور اپنے اسلاف سے نہیں کاٹ سکتے۔ اپنے اس نظریے کو کسی قیمت پر نہیں چھوڑ سکتے۔ ہم ہر حال میں اس پر فخر کرتے ہیں اور اللہ سے ہماری عاجزانہ دعا ہے ہمیں ہمیشہ اسی پر فخر کرنے کی ہمت دے۔ مرتے دم تک علما کے ساتھ رکھے

اور آخرت میں علماء کے ساتھ ہمارا حشر کرے۔ یہ ہمارا اصل نظریہ، عقیدہ اور ایمان ہے لیکن ملائیت خادم نہیں ہونی چاہیے، مخدوم ہونی چاہیے۔ یہ دنیا کو نیچے قدموں میں گر کر نہ دیکھے، یہ اوپر جا کر اس کا نظارہ کرے۔ یہ ہماری تمنا اور اصل ہدف ہے۔

بوریا نشین اور تخت نشین:

تیسری بات وہ دنیا کو یہ باور کرانا چاہتے ہیں اہلِ مدارس اس دنیا کے لوگ نہیں ہیں۔ یہ اس دنیا کا نظام نہیں چلا سکتے۔ یہ آسمان کے اوپر کی بات کر سکتے ہیں۔ زمین سے نیچے پر بھی گھنٹوں گھنٹوں بات کر سکتے ہیں لیکن زمینی حقائق کا حل ان کے پاس کوئی نہیں ہے۔ دنیا جن مسائل کا حل چاہتی ہے یہ ان کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں رکھتے۔ یہ زمانے کی قیادت نہیں کر سکتے۔ یہ نظام نہیں چلا سکتے۔ لہٰذا آپ اس مصرف بے جا میں آپ اپنی اولاد، عطیات، افرادی وسائل کیوں خرچ کرتے ہیں؟ آپ ان کو محبت وعقیدت کا مقام کیوں دیتے ہیں؟ ان کے سفید کپڑوں کا بھرم کیوں رکھتے ہیں؟ انہوں نے حسد اور بغض کی وجہ سے اپنی انگلیاں دانتوں تلے چبا ڈالیں۔ وہ دنیا کو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ یہ لوگ فرسودہ روایات کے امین ہیں اور دقیانوسی نظریات کے حامل ہیں۔ یہ اس دنیا کے نظام کے نہیں ہیں۔ اگر کبھی شب برات، جمعرات میں ان سے کوئی کام پڑ جائے تو ہاتھ چوم کر، نذرانہ دے کر ان سے عقیدت کا اظہار کر لو۔ آگے کی اُمید کوئی ان سے نہ رکھے۔ ان میں کوئی تنظیم نہیں، ان میں اجتماعیت نہیں۔ ان میں اس دنیا کے چیلنج کا سامنا کرنے کی کوئی صلاحیت نہیں۔ اہلِ مغرب اس بات کا پروپیگنڈا زبردست طریقے سے چلا رہے ہیں۔

ایک اور بات سنیے! مغربی حکومتیں اگر مسلمان حکومتوں سے کام لیتیں تو چونکہ ہم بے سروسامان ہیں، بوریا نشین لوگ ہیں اس لیے یہ بھی بہت تھا لیکن انہوں نے مسلمان حکمرانوں کو بیچ سے ہٹا کر ہمیں براہِ راست ہدف بنایا۔ جب انہوں نے براہِ راست ہدف بنایا تو یہ بھی ان کے لیے بہت تھا۔ ہمارے پاس تھا کیا؟ سوائے رات کو آنسوؤں کے دو قطرے بہانے کے کچھ نہیں۔ دنیا کی کون سی طاقت ہمارے پاس ہے؟ یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ نہ ہوتا۔ اگر اصحاب صفہ سے ہماری نسبت نہ ہوتی۔ ہمارے اکابر کی دُعائیں نہ ہوتیں اور اللہ نے ان بوریا نشینوں سے

ان تخت نشینوں کو شکست نہ دلوانی ہوتی تو ہمارے پاس تو اور کچھ نہ تھا۔

انہوں نے مدارس پر براہِ راست حملے کے بعد آپس میں اتحاد بھی کرلیا۔ ہماری دشمنی نے ان کی باہمی دشمنیاں ختم کردی ہیں۔ ہم مسکینوں کے خلاف دنیا کی تمام طاقتیں ایک ہوچکی ہیں۔ پھر انہوں نے اسی پر بس نہیں کیا، چھوٹے چھوٹے شیطان بھی اپنے ساتھ ملائے۔ بہت سی ایسے صحافی ہیں جن کا کام ہی یہ ہے کہ ٹوپی، عمامہ، سفید کرتہ ان چیزوں کے خلاف ذہن بنائیں۔ بہت سی این جی اوز کو ٹارگٹ دیا گیا ہے کسی طرح سے مدرسہ والوں کا کوئی عیب تلاش کرو، اس کی جو چاہو قیمت ہم سے وصول کرلو لیکن ان لوگوں کو معاشرے میں دنیا والوں کے سامنے کسی طرح گرادو۔ یہ دنیا کو باور کرانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اس کے مقابلے میں اہل حق کو بھی کتاب وسنت سے راہنمائی لینی چاہیے ایسے وقت میں کیا کیا جاتا ہے؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا طریقہ دیکھنا چاہیے، اکابر کا طرزِ عمل دیکھنا چاہیے، اسلاف کی سوانح میں تلاش کرنا چاہیے کہ ایسے لمحات میں انہوں نے کیا کیا؟

سال بہ سال، دن بدن:

ایسے وقت میں انہوں نے اپنا تعلق مع اللہ مضبوط کیا، توجہ الی اللہ میں رسوخ پیدا کیا اور توکل علی اللہ کر کے انہوں نے اپنی خامیوں کا جائزہ لیا اور اگر ان کے بارے میں کوئی بات درست کہی جارہی ہے تو فوراً اس کو ختم کردیا اور پھر اس کے بعد انہوں نے دنیا پر ثابت کردیا تم جو کچھ کہہ رہے تھے، غلط تھا، جھوٹ تھا، پروپیگنڈا تھا۔ اصل بات یہ ہے نبی علیہ السلام جنہوں نے قلیل ترین وقت میں ایک انقلاب آفرین نظام دنیا کو دیا، ان کے ورثا اگر دنیا کا نظام نہیں چلا سکتے تو دنیا کا کوئی نظام پھر چل ہی نہیں سکتا۔

اس بات کی بھی تربیت کی جائے گی کہ تنظیم کیسے کی جاتی ہے؟ افرادِ کار کا چناؤ اداروں کے لیے کیسے کیا جاتا ہے؟ کسی کی استعداد، رجحانات، میلانات کو سامنے رکھتے ہوئے اس کو منتخب کرنا، پھر اس کے مزاج کے مطابق کام تفویض کرنا پھر اس کی نگرانی کرنا اور کم وقت میں کم وسائل خرچ کر کے کم افراد کو استعمال کر کے دین کی سربلندی کا کام زیادہ سے زیادہ کرنا۔ یہ کس طرح کیا جاتا ہے؟ یہ اس کورس کا حصہ ہے۔

جب ہم نے سمجھا اس وقت ہمارے ساتھ یہ ہو رہا ہے اور مستقبل میں ہمارے ساتھ یہ کچھ ہونے والا ہے تو ہم نے غور و فکر کیا کہ اس کا حل کیا ہے؟ اس کا مقابلہ یوں ہو سکتا ہے کہ دنیا جس چیز کو معتبر سمجھتی ہے۔ اصل اعتبار ہماری چیز کا ہے لیکن اگر دنیا میں کسی ایسی چیز کو معتبر سمجھا جاتا ہے جو مباح ہے تو ہمیں چاہیے کہ ہم اسے اپنالیں۔ مثلاً: کچھ لوگ دنیا کو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ ان کے مالیات کا نظام شفاف نہیں ہے۔ آپ دنیا کو بتائیں کہ آپ کے اعلیٰ ترین ساکھ رکھنے والے اداروں میں جو آڈٹ، جانچ پڑتال کا طریقہ کار ہے اس سے کہیں زیادہ بہتر نظام ہمارے ہاں ہے۔ آپ کے ہاں لاکھوں روپے کی تنخواہیں لینے والے چار پانچ سال تک اپنے حسابات کو منظم کر کے نہیں دکھا سکتے اور ہم بوریا نشینوں کے پاس ایسے ''بوریا نشین'' موجود ہیں جو سال بہ سال تو کیا دن بدن کا حساب بھی آپ کو دکھا سکتے ہیں۔

کرنے کے اصل کام:

وہ دنیا کو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ ان کے ہاں وسائل بے جا مصارف میں بے دھڑک خرچ ہوتے ہیں۔ آپ دنیا کو بتایئے ہمارے فلاحی منصوبے تو اس پورے معاشرے کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ سماج کا کون سا شعبہ ہے جہاں ہماری خدمات نہیں ہیں۔ جو بھی جس وقت بھی چاہے ہمارے دعوے کو حقیقت سے موازنہ کر کے سچ کو جھوٹ سے الگ کر سکتا ہے۔

اس دنیا میں وہ فنون..... علوم نہیں فنون۔ علم تو صفتِ خاصہ اللہ تعالیٰ کی ہے اور ان دلوں میں اُترتا ہے جس کو اس ذاتِ گرامی سے نسبت ہو جس پر روح الامین وحی لے کر آیا ہے۔ علم تو مقدس چیز ہے۔ اس مقدس چیز کا اطلاق ہم یہاں پر کر کے جہاں دنیا کی حقیر آسائشوں کے پیچھے رینگنے والے کیڑے جس کو سیکھتے سکھاتے ہیں اور پھر علم کا نام دیتے ہیں، ہم اسے علم نہیں کہہ سکتے۔ ان کے اس جراثیم زدہ اور آلودہ ماحول میں فنون ہی سکھائے جاتے ہیں۔

ان فنون کو سیکھنے کا ایک طریقہ تو یہ تھا ہم اپنے فضلا کو یہ فنون سیکھنے کے لیے عصری اداروں میں بھیجیں لیکن خطرہ یہ تھا کہ ہم ان کو وہاں اس لیے بھیجتے کہ ہمارے غموں کا مداوا کریں۔ پتا چلا وہ ''درد لا دوا'' وہاں سے لے کر آیا۔ وہاں کے جراثیم ساتھ لے آیا۔ دوسرا طریقہ یہ تھا آپ ماحول

اپنا رکھیں جہاں اعمال کی پابندی ہو، ذکر و تلاوت کی مسحور کن صدائیں ہوں، صبح و شام کے مسنون اورادہوں اور جہاں تربیت بھی ہو۔ جہاں پر نگرانی بھی ہو، جہاں خانقاہی ماحول بھی ہو۔ پھر آپ انہی فنون کے ماہرین کو لے کر علمائے کرام کی زیرِ نگرانی اس کے نصاب میں کانٹ چھانٹ، قطع و برید کر کے ان کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال کر اپنے مزاج اور نظریے سے ہم آہنگ کر کے اسی ماحول میں وہ چیز سکھائیں جو ہیں کام کی لیکن انہیں سیکھنے کے لیے عصری تعلیمی اداروں میں جانے کے بعد بندہ کسی کام کا نہیں رہتا۔

میرے اور آپ کے کرنے کا کام یہ ہے ہم نیت کو دیکھیں، کام کو دیکھیں، کردار کو دیکھیں، مقاصد کو دیکھیں۔ اگر اکابر کے طرزِ عمل پر چل کر انہی کے مقصدِ زندگی کو، انہی کے مشن کو لے کر آگے بڑھا جا رہا ہے اور جدید وسائل سے استفادہ کرتے ہوئے کوشش کی جا رہی ہے کہ ہمارے دعوت کے کام کو چار چاند لگ جائیں تو ہمیں بھی پھر اس مشن میں ہمسفر بن جانا چاہیے۔ آپ اپنے اساتذہ کرام سے رہنمائی لیں، ان سے مشاورت کریں، ساتھ میں اس کی جانچ بھی کریں کہ مستقبل میں اگر مدارس کو، دینی اداروں کو ایسے افراد کی ضرورت پڑتی ہے جو دنیا والوں کو ان کی زبان میں جواب دے سکیں تو کیا ہم باہر سے ایسے لوگوں کو لائیں گے جو ہماری زبان نہیں سمجھتے، ہمارے مزاج کو نہیں سمجھتے، جو ہماری ترجمانی نہیں کر سکتے یا پھر ہم اپنے اندر سے ایسے لوگ پیدا کریں جو اس فرضِ کفایہ کو ادا کر سکیں جو اس فرضِ عین کے لیے ممد و معاون ہے۔ جس کی ادائیگی کا ذمہ اللہ نے ہم پر ڈالا ہے۔ کون سی بات بہتر ہے اس کا فیصلہ آپ خود کر لیں؟"

ایک جامع کمالات شخصیت سے ملاقات:

انڈیا سے ایک مفکر، محدث، مفسر، مفتی، صاحب نسبت ولی اللہ، دور اندیش اور جامع کمالات شخصیت حضرت مولانا انظر شاہ ابن مولانا انور شاہ کشمیری کراچی کے ایک معروف دینی ادارے میں تشریف لائے ہوئے تھے۔ جب میں وہاں پہنچا تو ان کے گرد اہل علم کا ہجوم تھا اور آپ علمی موتی اور جواہر بکھیر رہے تھے۔ جب عالمی حالات کے تناظر میں تعلیم پر بات چیت شروع ہوئی تو میں نے موقع مناسب پا کر یہ سوال کر دیا: "کیا دینی مدارس کے موجودہ نصاب میں تبدیلی ہونی

چاہیے؟'' آپ نے اپنے مخصوص انداز سے مسکراتے ہوئے فرمایا: ''اس کے دو جواب ہیں۔ایک الزامی دوسرا تحقیقی۔الزامی جواب تو یہ ہے کہ اسی نصاب سے ''اشرف علی تھانوی، انور شاہ کشمیری، حسین احمد مدنی، قاسم نانوتوی، شبیر احمد عثمانی، یوسف بنوری، شفیع دیوبندی...... تمام بڑی بڑی سرکردہ شخصیات بنی ہیں لہٰذا اس نصاب میں کوئی خامی نہیں ہے۔

دوسرا تحقیقی جواب یہ ہے قرآن، حدیث اور فقہ میں تو بالکل تبدیلی نہیں ہونی چاہیے کیونکہ یہ تینوں علوم مقصودہ ہیں۔البتہ موجودہ حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے باقی نصاب میں کمی بیشی اور تبدیلی کی جاسکتی ہے اور آپ اس کو ''نصاب کی تبدیلی کا نام نہ دیں'' بلکہ ''اضافاتِ علوم جدیدہ'' کا نام دیا جائے کیونکہ ''نصاب کی تبدیلی'' کے لفظ سے خواہ مخواہ تشویش پیدا ہوتی ہے۔''

یاد رکھیں! اگر ہم نے ضروری جدید علوم کے اضافے نہ کیے تو دنیا ہمیں مسترد کر دے گی۔آج دینی مدارس کے طلبہ اور علما کو جن چیلنجز کا سامنا ہے وہ پہلے شاید کبھی نہ تھا۔لہٰذا اس کے مقابلے کے لیے ہمارے فضلائے کرام کو گلوبلائزیشن دور کے تقاضوں کو سمجھنا ہوگا۔اس کے لیے سب سے بہتر صورت یہ ہے کہ آپ اپنے آپ کو ایسے دوراندیش اساتذہ کے سپرد دیں جن کی نظریں عالمی حالات پر مرکوز ہیں ورنہ آپ کو کوئی نہ کوئی مشغولیت تو مل ہی جائے گی لیکن دین کے تقاضے کو پورا نہ کرنے کے مرتکب ضرور ہوں گے۔ان تقاضوں کو سمجھنے کے لیے دین کے رہنماؤں نے کئی طریقے بتلائے ہیں۔انہیں میں سے میڈیا پر کفار کا کنٹرول توڑنے کے لیے ''صحافت کے میدان'' میں آنے کی ضرورت ہے۔

بقاء کا راز کس میں مضمر ہے:

آج کی دنیا کی باتیں سمجھنے کے لیے ''انگلش لینگویج'' کو فروغ دینا ہوگا۔اپنے کاموں کو منظم کرنے کے لیے کمپیوٹر سے واقفیت حاصل کرنا ہوگی۔آج سے چند سال بعد انگلش اور کمپیوٹر سے نابلد شخص جاہل شمار ہوگا۔معیشت کو جائز طریقے سے مستحکم کرنے کے لیے ''اسلامی بینکاری'' کا ادراک از حد ضروری ہے۔موثر اور مقتدر حلقوں اور عہدوں تک رسائی کے لیے دنیا کے جدید معاشی نظام کی سوجھ بوجھ حاصل کرنا وقت کی پکار ہے۔فضلائے کرام میں سے کون کون ہیں جو

وقت کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے آئیں اور دشمنوں کے ناپاک منصوبوں کو خاک میں ملانے والوں میں شامل ہو جائیں۔

اس وقت جبکہ عالمی اور حکومتی سطح پر دینی مدارس، علمائے کرام وطلبہ اور وفاق المدارس کے خلاف یورشیں، شورشیں اور سازشیں ہو رہی ہیں۔ایک مخصوص لابی ہر قسم کی ٹیکنالوجی سے مسلح ہو کر دینی مدارس، طلبہ، علماء اور وفاق المدارس کے مابین نفرت کا بیج بونے کے لیے میدان میں اُتر چکی ہے۔ وفاق المدارس کو اپنے ایجنٹوں کے ذریعے بدنام کروایا جا رہا ہے۔ علماء اور طلبہ کے اجلے کردار کو داغدار کرنے کی مہم عروج پر ہے۔ میڈیا دینی مدارس کے خلاف زہر اُگل رہا ہے۔ ایسے حالات میں سب سے زیادہ ضرورت آپس میں اتحاد و اتفاق، اپنے بڑوں اور وفاق المدارس پر مکمل اعتماد کی ہے۔

ہمارے اساتذہ، بڑے اور وفاق المدارس جو بھی فیصلہ کریں ہمیں قبول ہونا چاہیے۔ اسی میں ہم سب کی بہتری، فلاح اور بقا کا راز مضمر ہے۔ ورنہ مغرب تو ہمیشہ اسلام دشمن رہا ہے، وہ ہر وقت مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی کوششوں میں رہتا ہے لیکن دکھ اور افسوس کا مقام یہ ہے ہم نے خود علمائے کرام کی تضحیک اور مذاق اڑانا شروع کر دیا۔ ہم نے ان کی عزت اور احترام کرنا چھوڑ دیا اور پاکستانی معاشرے میں انہیں جو مقام حاصل تھا ہم نے اس سے انہیں محروم کر دیا۔ یقین کیجیے یہ وہ لوگ تھے جن کو نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم نے انبیاء کا وارث کہا تھا لیکن ہم اپنے دشمنوں کے پھیلائے گئے پروپیگنڈے سے اس قدر متاثر ہو چکے ہیں کہ ہم نے امت کے ان وارثوں کو نفرت کا نشان بنا دیا اور ان پر ان کی زندگی تنگ کر کے رکھ دی۔

علماء کے خلاف منفی پروپیگنڈا:

آج میں جب 20، 25 برس پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے مغربی طاقتوں نے جس انداز سے ہمارے علماء کے خلاف زہریلا پروپیگنڈا شروع کر رکھا ہے۔ اگر یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا تو ہمارے معاشرے کو تباہی سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔ اگر ہم اپنے گرد و پیش میں ہی علماء حضرات کی خدمات کا جائزہ لیں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے یہ حضرات اپنا کردار کماحقہٗ ادا کر رہے

ہیں۔آپ صرف اتنا دیکھ لیں ہمارے ملک میں 17 ہزار سے زائد مدرسے ہیں۔ان مدرسوں میں لاکھوں بچے مفت دینی و دنیاوی تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور ان لاکھوں بچوں کو خوراک و رہائش کی سہولیات بھی مفت فراہم کی جاتی ہیں لہٰذا ان لاکھوں بچوں کا بوجھ صرف علمائے کرام نے اٹھا رکھا ہے جبکہ آپ کسی بھی عالم دین کی زندگی کا مطالعہ کر کے دیکھ لیں۔ ہر عالم دین ہم میں سے ہر شخص سے کہیں مہذب، باعمل اور باکردار ہوتا ہے۔

وہ ایک عام مسلمان سے زیادہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات پر عمل کرتا ہے اور حقوق اللہ کے ساتھ حقوق العباد کو بڑی اہمیت دیتا ہے جبکہ آپ پوری اسلامی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں۔آپ کو کوئی ایک بھی عالم دین ایسا نہیں ملے گا جس نے کرپشن سے قومی خزانہ لوٹا ہو۔وہ شراب پیتا اور سپلائی کرتا رہا ہو۔وہ جوئے میں ملوث رہا ہو یا قحبہ خانوں اور ڈسکوز میں بیہودگی برپا کرتا رہا ہو لہٰذا میں یہ سب دیکھ کر کہہ سکتا ہوں علماء حضرات عام شہریوں سے کہیں بہتر، مہذب اور بااخلاق ہوتے ہیں لیکن افسوس اس بات کا ہے ہم نے ان لوگوں کو دہشت گرد اور ''انتہا پسند'' ڈکلیئر کرنا شروع کر دیا ہے۔

میں جب بھی حکومت کی طرف سے دھماکوں یا خودکش حملوں کا ذمہ دار مولوی حضرات کو قرار دیتے ہوئے دیکھتا ہوں تو میرا دل خون کے آنسو روتا ہے اور میری آنکھوں کے سامنے مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا مفتی شفیع، مولانا تقی عثمانی اور ان جیسی دیگر بیسیوں شخصیات گھومنے لگتی ہیں۔

میرے سامنے اس ملک کے ان تمام طالب علموں اور اساتذہ کے چہرے آ جاتے ہیں جن کی پیشانیوں پر محراب کے نشان ہیں اور جن کی انگلیاں تسبیحوں کے دانے ٹٹول ٹٹول کر کھردری ہو گئی ہیں۔ میں سوچتا ہوں آج ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کے ان وارثوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کر رہے اور جب کل ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش ہوں گے تو ان کو کیا منہ دکھائیں گے؟ یقین کیجیے اگر ہم نے آج علمائے کرام کا کھویا ہوا مقام دوبارہ بحال نہ کیا تو ہمارا معاشرہ تباہ ہو جائے اور تاریخ ہمیں کبھی معاف نہیں کرے گی۔ نہ جانے کیوں مجھے ڈر سا لگتا ہے

کہ کفریہ طاقتیں ہمارے علمائے کرام کے خلاف منفی پروپیگنڈا کر کے امت مسلمہ کے دلوں میں ان کے لیے نفرت پیدا کر رہی ہیں شاید وہ ہمارے جسموں سے روح محمدی نکال لینا چاہتی ہیں۔ گزشتہ سال ''اتحاد تنظیمات مدارس دینیہ پاکستان'' نے کراچی میں ایک علماء کنونشن منعقد کیا۔ یہ کنونشن جامعہ بنوری ٹاؤن میں منعقد ہوا اور اس میں تنظیمات مدارس کے ساتھ مذہبی جماعتیں بھی شامل تھیں۔

نظریاتی سرحدوں کے محافظ:

یہ کنونشن دینی مدارس میں پڑھنے والے غیر ملکی طلبہ کی پاکستان بدری، حکومت کی طرف سے مدارس کے بورڈ کو تسلیم نہ کرنے، حکومت کی طرف سے مدارس کی تسلیم شدہ اسناد کو غیر مؤثر بنانے، علما اور طلبہ کی گرفتاریوں اور حکومت کے بعض دوسرے غیر منصفانہ اقدامات کے خلاف تھا۔ اس کنونشن میں متحدہ مجلس عمل کے رہنماؤں اور مدارس کے اساتذہ کرام نے خطاب کیا۔'' میں نے جب یہ خبر پڑھی تو یقین کریں مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ مجھے محسوس ہوا 58 برس بعد ہی سہی لیکن ٹھیک فیصلہ کیا ہے، جب تک ہم لوگ اکٹھے نہیں ہوتے ہم اپنی آواز حکومت تک پہنچا سکتے ہیں اور نہ ہی بیرون ملک موجود طاقتوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔

میں نے محسوس کیا یہ اچھی شروعات ہیں۔ اگر یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا تو شاید وہ وقت آ جائے جب مدارس نیکی کی متحد اور مضبوط طاقت بن جائیں۔ میں پیشے کے لحاظ سے صحافی ہوں لہٰذا میں جانتا ہوں اس وقت علمائے کرام اس ملک کی تیسری بڑی طاقت ہیں۔ آپ پاکستان کے کسی شہر کے کسی محلے میں چلے جائیں، آپ کسی گلی میں جھانک لیں، آپ کو وہاں مسجد ضرور ملے گی اور اس مسجد میں ایک چھوٹا سا مدرسہ بھی ہو گا۔ پچھلے برس امریکی سفارتخانے نے پاکستان میں ایک سروے کرایا تھا، اس سروے کے ذریعے پتہ چلا پاکستان کا ہر چوتھا شخص باریش ہے۔

ایک سروے کے مطابق پاکستان کے 97 فیصد گھروں میں کوئی نہ کوئی باریش شخص موجود ہے۔ وہاں کوئی نہ کوئی نمازی ضرور ہوتا ہے۔ پاکستان میں سب سے زیادہ چھپنے والی کتاب قرآن مجید ہے اور پاکستان کے سو فیصد گھروں میں قرآن مجید موجود ہے۔ پاکستان میں آج بھی صلح

صفائی، جرم اور غلطی کے فیصلے قرآن مجید پر ہوتے ہیں۔ اس سروے میں پتا چلا پاکستان میں ہر سال نمازیوں اور مسجدوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ پاکستان کا تاجر، صنعت کار، بیوروکریٹ اور سیاستدان طبقہ بھی تیزی سے مذہب کی طرف متوجہ ہو رہا ہے۔ پاکستان میں ہر سال عمرے اور حج کے خواہش مندوں میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ پاکستان کے لوگ ہر سال 70 ارب روپے خیرات کرتے ہیں اور اس رقم کا 80 فیصد حصہ دینی مدارس، مساجد اور طلبہ کو جاتا ہے، لہٰذا امریکی ایمبیسی کا کہنا تھا پاکستان سے مذہب کا اثر و نفوذ ختم کرنا ممکن نہیں۔

میں اس سروے سے اتفاق کرتا ہوں کیونکہ میں ذاتی طور پر جانتا ہوں جب تک مقامی مسجد کا تعاون حاصل نہیں ہوتا ہمارے ملک میں کونسلر تک کامیاب نہیں ہوسکتا چنانچہ اتنی بڑی فورس ہو لیکن وہ ملک میں اپنے فکری اور نظریاتی مفادات کی حفاظت نہ کرسکے، یہ عجیب لگتا ہے لیکن اس کی وجہ بڑی واضح ہے کہ یہ فورس چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بٹی ہوئی ہے، یہ طاقت تقسیم ہے لہٰذا ہم اس سے آج تک کوئی بڑا کام نہیں لے سکے۔ علمائے کرام سے درخواست کرتے ہیں وہ اس سلسلے کو جاری رکھیں، وہ اپنے اس اتحاد کو مضبوط بھی بنائیں اور اسے مؤثر بھی کریں تاکہ ہم اس ملک کی نظریاتی اور فکری سرحدوں کی حفاظت کرسکیں۔

ایک لاکھ چالیس ہزار طلبہ:

یقین کیجیے! ہمارا دشمن ہم پر ایک بڑے لشکر جرار کے ذریعے حملہ آور ہے۔ اگر ہم آج اس کے خلاف صف آرا نہ ہوئے تو یہ لوگ ہمیں بہا لے جائیں گے اور کل ہمارا نام تک باقی نہ ہوگا۔ ایسی کوششیں ''وفاق المدارس'' کے اسٹیج سے ہونی چاہیے۔ کیونکہ ''وفاق المدارس'' ایک تاریخ ساز ادارہ ہے۔ یہ ایک ایسا ادارہ ہے جسے 1959ء سے علمائے کرام چلا رہے ہیں اور آج تک اس میں کسی قسم کی بدعنوانی کا ایک بھی واقعہ پیش نہیں آیا۔ یہ دنیا کا واحد تعلیمی ''بورڈ'' ہے جس میں نقل نہیں ہوتی اور نہ ہی طالب علم اپنے پرچے کی دوبارہ پڑتال کی درخواست دیا کرتے ہیں۔ میں نے جب وفاق المدارس کا نظام دیکھا تو سوچا لوگ ان لوگوں کے بارے میں کہتے ہیں یہ لوگ نظام نہیں بنا سکتے۔ میں نے سوچا مغرب کے دانشور کس قدر مغالطے اور غلط فہمی کا شکار ہیں۔ مدارس کی عظیم

طاقت 45 سال پہلے تک مختلف ٹکڑیوں میں بٹی ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے 1957ء میں اس وقت کے اکابرین کے دلوں میں اس منتشر قوت کی شیرازہ بندی کا منصوبہ ڈالا اور انہوں نے ''وفاق المدارس العربیہ پاکستان'' کے نام سے ایک خالص دینی اور علمی تنظیم کی بنیاد رکھ دی۔

ہماری تحقیق کے مطابق ''وفاق المدارس العربیہ پاکستان'' کا پہلا اجلاس 18، 19 اکتوبر 1957ء کو جامعہ خیر المدارس ملتان میں ہوا۔ اس کی صدارت مولانا خیر محمد جالندھری رحمہ اللہ نے فرمائی۔ اس اجلاس میں ''وفاق'' کے دستور کی منظوری کے علاوہ تین سال کے لیے عہدیداران کا انتخاب ہوا۔ اس اجلاس میں حضرت مولانا خیر محمد جالندھری، حضرت مولانا یوسف بنوری، حضرت مولانا شمس الحق افغانی، حضرت مولانا مفتی محمود اور حضرت مولانا مفتی محمد عبداللہ رحمہم اللہ کو وفاق المدارس کی مختلف ذمہ داریاں سونپی گئیں۔ ''وفاق المدارس'' نے دینی مدارس کے تحفظ اور ارتقاء، اہلِ علم کے درمیان رابطہ، نظامِ تعلیم اور امتحانات میں یکجہتی، جامع نصاب کی ترتیب، اسناد کے اجراء اور جدید وقدیم علوم کو عصری تقاضوں کے مطابق ڈھالنے اور اپنانے میں بڑا کردار ادا کیا۔ اس وقت کراچی سے پشاور تک 7 ہزار سے زائد دینی مدارس ''وفاق المدارس العربیہ'' سے ملحق ہیں۔ ہر سال ایک لاکھ چالیس ہزار کے قریب طلبہ وطالبات ''وفاق'' کے امتحانات میں شرکت کرتے ہیں۔ صرف 2004ء میں ''وفاق'' کے تحت امتحان دینے والے طلبہ اور طالبات کی تعداد ایک لاکھ 60 ہزار تھی جبکہ ''وفاق'' سے ملحق مدارس میں زیرِ تعلیم طلبہ وطالبات کی تعداد 8 لاکھ سے زائد ہے۔ ''وفاق المدارس'' کے زیرِ اہتمام ہونے والے امتحانات کی یہ خصوصیت ہے کہ یہ آزاد کشمیر سمیت ملک کے چاروں صوبوں میں ایک ہی تاریخ اور ایک ہی وقت میں منعقد ہوتے ہیں اور دارالحکومت سے لے کر معمولی قصبے تک ایک ہی نصابِ تعلیم کے تحت لیے جاتے ہیں۔ نصابِ تعلیم کی اس وحدت کی بدولت نہ صرف چھوٹے بڑے تمام اداروں کے طلبہ کو آگے بڑھنے کا موقع ملتا ہے بلکہ ملکی سطح پر ان کے درمیان مسابقت اور اُمورِ خیر میں آگے بڑھنے کے جذبات بھی پیدا ہوتے ہیں۔ اس وقت دینی مدارس کے نظم وضبط، تعلیم وتدریس اور نظامِ امتحانات میں ایسی بہت سی خوبیاں ہیں جو ''وفاق المدارس'' کے قیام سے قبل نہ تھیں۔

ساڑھے چار سو مراکز:

اس وقت ایسی فعال اور مربوط تنظیم کی مثال پوری دنیا میں نہیں ملتی۔ بنگلہ دیش، بھارت، برما اور افغانستان پاکستان کے پڑوسی ممالک ہیں۔ ان میں بھی ہزاروں کی تعداد میں دینی مدارس ہیں لیکن یہ امتیاز صرف پاکستان کو حاصل ہے یہاں کے مدارس ایک مربوط تعلیمی نظام سے وابستہ ہیں۔ یہ کتاب وسنت کی ترویج واشاعت اور شعائرِ اسلام کے تحفظ وبقا کے لیے ہم آواز ہیں۔ وفاق المدارس کا امتحانی نظام بذاتِ خود ایک تاریخ ہے۔ اگر یورپ غیر جانبداری سے اس نظام کا تجزیہ کرے تو میرا دعویٰ ہے وہ وفاق المدارس کو ''گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ'' میں شامل کرلے گا۔ وفاق کا امتحانی نیٹ ورک شاید دنیا کا سب سے بڑا نیٹ ورک ہو۔ ملک کے چاروں صوبوں، دارالحکومت، آزاد کشمیر، شمالی علاقہ جات اور فاٹا میں یہ نیٹ ورک قریباً ساڑھے چار سو مراکز برائے طلبہ کتب اور تقریباً ہزار مراکز برائے طلبہ حفظ پر مشتمل ہے۔

ان مراکز میں 25 ہزار کے قریب کتب کے طلبہ اور 21 ہزار کے قریب طلبہ حفظ کے امتحانات دیتے ہیں۔ اس نیٹ ورک کی ایک زبردست خصوصیت یہ ہے اس کے تمام مراکز امتحان میں ہر مرحلہ تعلیم کے لیے ''ایک ہی پرچہ'' تیار ہوتا ہے۔ یہ پرچہ کراچی، لاہور، پشاور، کوئٹہ، اسلام آباد، مظفر آباد اور گلگت کے طالب علم یکساں طور پر حل کرتے ہیں۔ امتحانی سال کے پہلے مرحلے میں مختلف جامعات کے سرکردہ مدرسین کو وفاق کی امتحانی کمیٹی مختلف پرچوں کی تیاری کے متعلق خطوط جاری کرتی ہے جس میں نہایت رازدارانہ انداز اختیار کیا جاتا ہے اور اس میں متعلقہ شخص سے بھی رازداری کی درخواست کی جاتی ہے۔ یاد رہے ایک ایک پرچہ کی تیاری متعدد حضرات سے کرائی جاتی ہے اور متعلقہ مدرسین اپنے اپنے پرچے تیار کر کے ناظمِ اعلیٰ وفاق کے نام ارسال کردیتے ہیں۔ ناظمِ اعلیٰ ان تمام پرچوں کے متعلق اپنے دیگر رفقاء کمیٹی سے مشورہ کرتے ہیں اور اس کے بعد بعض مکمل اور بعض کے کچھ اجزا منتخب کرلیے جاتے ہیں جبکہ بعض کو بالکل مسترد کر کے کمیٹی ازخود تیار کرتی ہے۔

یہ طریقہ کار اس لیے اختیار کیا جاتا ہے تاکہ کوئی بھی پرچہ تیار کنندہ اپنے پرچے کو حتمی نہ سمجھے

اور یوں اس میں خیانت کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔اس طرح یہ پرچے صدر وفاق کی نگرانی میں کتابت اور پھر طباعت کے مراحل سے گزر کر چھ تھیلیوں میں بند کردیے جاتے ہیں اور اس کے بعد ملک بھر میں معتمدین وفاق تک بائی ہینڈ پہنچائے جاتے ہیں۔معتمد امتحان شروع ہونے سے کچھ دیر قبل انہیں لے کر مراکز امتحان تک پہنچ جاتا ہے۔ہال میں موجود معاون نگران اور نگرانِ اعلیٰ جمع ہوکر پرچوں کا پیکٹ طلبہ کو دکھلا کران کی سیل کھولتے ہیں اور پرچہ طلبہ میں تقسیم کردیا جاتا ہے۔ وفاق المدارس میں نگرانِ اعلیٰ کے علاوہ معاونین کا تقرر پچیس طلبہ پر ہوتا ہے گویا سو بچوں کے لیے چار نگرانوں کا تقرر ہوتا ہے۔نگرانِ اعلیٰ کا کام وفاق اور متعلقہ جامعہ سے رابطہ، امتحان کے حوالے سے نظم وضبط، طلبہ ومعاونین پر نگاہ کے علاوہ امتحانی مرکز کی مکمل مسئولیت ہوتا ہے۔معاونین کا کام شرکاءِ امتحان کی نگرانی ہے۔

مدارس کا امتحانی طریقہ کار:

یہ حضرات اپنی روزانہ کی کارگزاری ڈاک کے ذریعے مرکزی دفتر بھیجتے رہتے ہیں اور سینٹر سے متعلق تمام اُمورِ وفاق سے مہیا کردہ ایک فائل میں درج کرتے رہتے ہیں جو بعد میں مرکزی دفتر وفاق بھیجی جاتی ہے۔اسی طرح یہ حضرات امتحان کا مقررہ وقت ختم ہوتے ہی پورے ملک کے طلبہ سے جوابات کی کاپیاں لے لیتے ہیں اور ناظم امتحان ان کاپیوں کے بنڈل سیل کر کے اسی وقت وفاق کو رجسٹری کردیتا ہے۔

مرکزی ناظم امتحان فوراً کاپیوں کی جانچ پڑتال کرتا ہے۔کسی طالب علم نے پرچے پر اپنا نام، رول نمبر یا کوئی اور علامت لکھ دی ہو تو وہ اس پر سیاہی پھیر دیتا ہے۔اس کے بعد وہ اصلی رول نمبر اور نام وغیرہ کی چٹ کاپی سے الگ کر کے اس پر فرضی رول نمبر لکھ دیتا ہے۔اسی طرح تمام مرکزوں سے آئی ہوئی کاپیوں کے رول نمبر بدل کر اور خلط ملط کر کے بنڈل بنا کے ممتحن کے پاس بھیج دیتا ہے۔

اب اگر ممتحن بھی چاہے تو وہ کسی طالب علم یا کسی خاص مدرسے کے طالب علموں کی کاپیاں نہیں نکال سکتا لہٰذا ممتحن تمام کاپیوں پر صرف طالب علم کی محنت واستعداد کے مطابق نمبر لگاتا ہے۔

یہ ایسا مکمل نظام ہے جس میں کسی طالب علم یا کسی مدرسے کے ساتھ کسی قسم کی ناجائز مراعات کا امکان باقی نہیں رہتا۔ اس کا ثبوت یہ ہے بارہا ایسا ہوا کہ اول دوم سوم نمبر پر آنے والے طلبہ بالکل گم نام مدارس سے تعلق رکھنے والے تھے۔

پرچوں کی چیکنگ کا نظام بھی بہت زبردست ہے۔ کتب کے امتحان ختم ہونے سے پہلے مختلف مدارس و جامعات سے تین سو کے لگ بھگ افراد پرچے چیک کرنے کے لیے وفاق کے متعین کردہ دفتر پہنچ جاتے ہیں۔ جہاں مامور دفتری عملہ یہ پرچے مخصوص ترتیب کے ساتھ ان کے حوالے کرتا رہتا ہے۔ چیکنگ کے بعد یہ لوگ پرچے واپس کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد دفتری عملہ رجسٹر میں موجود اصل رول نمبر کے سامنے اس کے نمبر لگاتے رہتے ہیں۔

اک یادگار اجتماع:

پرچہ چیک کرنے والے درجہ وار ٹولیوں میں دفتر میں تشریف فرما ہوتے ہیں جن پر ہر کلاس کے اعتبار سے ایک ایک نگران ہوتا ہے جو وقتاً فوقتاً اپنے ماتحتوں کے چیک کردہ پرچہ جات دوبارہ چیک کرتا ہے تاکہ اندازہ ہو کہ چیک کرنے والے صحیح نمبر لگا رہے ہیں جبکہ ان نگرانوں پر نگرانی کرنے کے لیے صدر وفاق بنفس نفیس وہاں موجود رہتے ہیں۔ پس منظر کے طور پر یاد رہے وفاق المدارس العربیہ نے 1960ء میں پہلا امتحان لیا۔ 2004ء تک یہ ادارہ 8 لاکھ 84 ہزار چھ سو 43 طلبہ و طالبات کو اسناد دے چکا ہے۔ اسناد حاصل کرنے والے طلبہ اور طالبات کی تفصیل کچھ یوں ہے: درجہ عالیہ بنین 1960ء سے 2004ء تک 50085 طلبہ۔ درجہ عالیہ بنین 1985ء سے 2004ء تک 37609 طلبہ۔ درجہ خاصہ بنین 1983ء سے 2004ء تک 61477 طلبہ۔ درجہ عامہ بنین 1984ء سے 2004ء تک 87038 طلبہ۔ شہادۃ الدراسات الدینیہ 2004ء میں شروع ہوا اس کے 118 طلبہ نے سند لی۔ کل طلبہ کی تعداد 346513 بنتی ہے۔

اسی طرح خواتین کے سلسلے میں درجہ عالیہ بنات 1994ء سے 2004ء تک 19713 طالبات۔ درجہ عالیہ بنات 1994ء سے 2004ء تک 99567 طالبات اور شہادۃ الدراسات الدینیہ 2004ء میں شروع ہوا جس میں 235 طالبات نے سند حاصل کی۔ طالبات کی کل تعداد

194454 بنتی ہے۔ اگر ہم طلبہ اور طالبات کی تعداد کو ملا کر دیکھیں تو یہ 540967 ہو جاتی ہے جبکہ اس کے علاوہ وفاق نے 1982ء میں تحفیظ القرآن الکریم کا سلسلہ شروع کیا۔ اس کے سلسلے میں وفاق نے 2004ء تک 343676 حفاظ کو اسناد دیں، اگر ہم ان کو بھی اس میں جمع کرلیں تو یہ تعداد 884643 بن جاتی ہے۔

وفاق المدارس العربیہ 1957ء میں شروع ہوا اور 2004ء تک اس کے رجسٹرڈ مدارس کی تعداد 6058 تھی۔ اسلام آباد کے 75 مدارس رجسٹرڈ ہیں۔ بلوچستان کے 437۔ پنجاب کے 2152۔ سرحد کے 1240۔ سندھ کے 2031 اور آزاد کشمیر کے 123 مدارس رجسٹرڈ ہیں۔ وفاق المدارس کے موجودہ صدر حضرت مولانا سلیم اللہ خان مہتمم جامعہ فاروقیہ کراچی ہیں۔ ناظم اعلیٰ مولانا محمد حنیف جالندھری ہیں۔ انہوں نے مدارس کے خلاف جاری حالیہ مہم کے دوران دوسرے مکاتب فکر کے ارباب کو ساتھ ملا کر جو کردار ادا کیا، وہ قابلِ رشک ہے۔ وفاق المدارس کی مجلس عاملہ ملک کے 27 ممتاز علمائے کرام پر مشتمل ہے جن میں مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب، مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر صاحب، مولانا انوار الحق صاحب، مولانا فضل الرحیم صاحب اور مفتی غلام قادر صاحب جیسے جید علما شامل ہیں۔

اعلیٰ تعلیم کے 196 منصوبے:

وفاق المدارس کا نظام آئیڈیل سسٹم ہے۔ ایک رپورٹ کے مطابق پوری دنیا میں اس وقت تعلیم کے 921 نظام کام کر رہے ہیں۔ ان 921 نظاموں میں کوئی ایسا نظام نہیں جس پر آج تک کرپشن، لوٹ کھسوٹ، غلطی اور فریب کا الزام نہ ہو۔ حد تو یہ ہے آکسفورڈ اور کیمبرج تک کے تعلیمی نظاموں پر نقل اور نمبروں میں ردوبدل کے اسکینڈل سامنے آئے۔ پچھلے سال کسی نے پینٹا گون کے کمپیوٹر میں گڑبڑ کر کے ہزاروں کارکنوں کے نمبر آگے پیچھے کر دیے تھے۔ سیاٹل، لندن اور فرینکفرٹ تک میں ایسی ایسی خرابیوں اور فریب کاریوں کے اسکینڈل سامنے آتے رہے کہ انسان دنگ رہ جائے لیکن اس دنیا میں، ان حالات میں "وفاق المدارس" کے نام سے ایک ایسا ادارہ بھی موجود ہے جو دیانت داری اور نظم وضبط میں اپنی مثال آپ ہے۔

یہ کوئی چھوٹا اعزاز نہیں لیکن اس کے باوجود دُنیا اس ادارے کے نظام کو تسلیم نہیں کرتی۔ کیوں؟ اس ''کیوں'' کا جواب حاصل کرنے سے پہلے پاکستان کے دو تعلیمی نظاموں کا جائزہ لیتے ہیں۔ ایک رپورٹ کے مطابق پاکستان میں اس وقت ایک لاکھ 56 ہزار ایک سو پرائمری اسکول ہیں۔ 28 ہزار 7 سو 16 مڈل اور 16 ہزار 59 ہائی اسکول ہیں جبکہ فیڈرل گورنمنٹ کے تحت 94 ہزار 7 سو 5 پرائمری، 53 ہزار 3 سو 90 مڈل اور 33 ہزار 6 سو 44 ہائی اسکول ہیں۔

ان اسکولوں میں اس وقت ایک کروڑ 74 لاکھ 15 ہزار 2 سو 40 پرائمری، 40 لاکھ 35 ہزار 40 مڈل اور 16 لاکھ 58 ہزار 2 سو 99 ہائی اسکول کے طالب علم پڑھتے ہیں۔ وفاقی حکومت اس وقت 15 ہزار 9 سو 90 کالج چلارہی ہے جبکہ باقی ملک میں 607 ووکیشنل، 939 جنرل اور 374 پروفیشنل کالج ہیں۔ ان کالجوں میں 9 لاکھ 95 ہزار 3 سو 49 طالب علم پڑھ رہے ہیں۔ اس وقت پاکستان میں 45 یونیورسٹیاں ہیں، ان یونیورسٹیوں میں 3 لاکھ 88 ہزار 6 سو 68 طالب علم پڑھتے ہیں۔ ملک میں 30 پرائیویٹ یونیورسٹیاں ہیں جن میں 16 ہزار 4 سو 10 طالب علم تعلیم حاصل کررہے ہیں۔ ان کے علاوہ ملک میں تعلیم بالغاں کے ایک ہزار 9 سو 15 سینٹر ہیں۔ یہ سینٹر 34 اضلاع میں کام کرتے ہیں، ان میں 51 ہزار 8 سو طالب علم تعلیم حاصل کررہے ہیں۔ ان تمام اداروں میں اس وقت 4 لاکھ 35 ہزار 7 سو 42 پرائمری، 2 لاکھ 46 ہزار 5 سو 35 مڈل اور 2 لاکھ 87 ہزار 4 سو 94 ہائی اسکول کے اساتذہ کام کررہے ہیں جبکہ یونیورسٹیوں میں 10 ہزار اساتذہ ہیں۔ پاکستان کی حکومت ان تمام اداروں اور اساتذہ پر سالانہ ایک کھرب 11 کروڑ 50 لاکھ اور 15 ہزار روپے خرچ کرتی ہے۔ یہ پاکستان کے کل بجٹ کا ایک اعشاریہ 80 فیصد بنتا ہے۔ حکومت آنے والے بجٹ میں صرف اعلیٰ تعلیم پر 11 ارب روپے خرچ کرے گی۔ ملک میں اس وقت اعلیٰ تعلیم کے 196 منصوبے چل رہے ہیں۔

دینی اداروں کے پانچ بورڈز:

اس بجٹ میں حکومت مدارس کے لیے بھی ایک ارب روپے رکھ رہی ہے۔ جب آپ حکومت کے تعلیمی سلسلے کا مطالعہ کریں تو آپ کو یہ دیکھ کر حیرت ہوگی حکومت اتنے وسیع پیمانے پر

اخراجات اوراتنے لمبے چوڑے انتظامات کے باوجود 60 برسوں میں صرف 35 فیصد شرح خواندگی حاصل کرسکی ہے جبکہ اس شرح خواندگی کا معیار بھی انتہائی پست ہے۔ اس وقت دنیا کے 21 ادارے پاکستان کے تعلیمی نظام کا مطالعہ کررہے ہیں اور ان تمام اداروں کی ایک رائے ہے:

”پاکستان کا تعلیمی نظام انتہائی پسماندہ اور غیر معیاری ہے۔“

حد تو یہ ہے پاکستان کی سب سے بڑی یونیورسٹی جامعہ پنجاب کا شمار ایشیا کی یونیورسٹیوں میں 68 ویں نمبر پر ہوتا ہے جبکہ ہماری یونیورسٹیوں کے اساتذہ تک یورپ اور امریکا کی یونیورسٹیوں کے امتحانات میں فیل ہوجاتے ہیں۔ دنیا کہتی ہے پاکستان کا تعلیمی نظام آج تک پاکستان کو تعلیم دے سکا اور نہ ہی تربیت۔ اس نظام کے پاس ڈگریوں کی شکل میں صرف کاغذ کے ٹکڑے ہیں۔ اس کے پاس قابلیت ہے اور نہ ہی تربیت۔ پاکستان کے سرکاری نظام تعلیم کے ساتھ ساتھ ایک دوسرا نظام تعلیم بھی ہے۔

یہ مدارس کا نظام تعلیم ہے جس کے پاس نہ اچھی عمارات ہیں، نہ امریکی اور یورپی یونیورسٹیوں کے پڑھے اساتذہ ہیں اور نہ ہی بجٹ لیکن اس کے باوجود یہ ادارے نہ صرف پڑھے لکھے نوجوان پیدا کررہے ہیں بلکہ نئی نسل کی تربیت بھی کررہے ہیں۔ یہ ادارے نوجوانوں کے دلوں میں دین، ملک اور معاشرے کی محبت پیدا کرتے ہیں۔ یہ ان کی تربیت کرتے ہیں، یہ انہیں علم اور عمل دونوں قسم کی دولت سے سرفراز کرتے ہیں۔ آپ اگر ان مدارس کا جائزہ لیں تو آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی اس وقت ملک میں دینی اداروں کے پانچ بورڈز ہیں۔

ان بورڈز میں 13 ہزار چھوٹے مدارس رجسٹرڈ ہیں، ان 13 ہزار مدارس میں 20 سے 25 لاکھ طالب علم پڑھتے ہیں جبکہ پورے ملک میں خواتین کے دس ہزار مدارس ہیں۔ ان مدارس میں قرآن مجید حفظ کرایا جاتا ہے، اس کے ساتھ پرائمری، مڈل اور ہائی اسکول کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ ملک میں جمعیت تعلیم القرآن ٹرسٹ کے 1500 مدارس ہیں جن میں 637 مدارس آزاد کشمیر، شمالی علاقہ جات اور پنجاب میں کام کررہے ہیں۔

یہ ملک بھر کی 60 جیلوں میں قیدیوں کے لیے ایک ہزار کلاسیس چلا رہا ہے۔ یوں صرف ایک

ٹرسٹ ایک لاکھ طلبہ کو تعلیم دے رہا ہے۔ پچھلے ایک عشرے سے ملک بھر میں اقرأ طرز کے مدارس کام کررہے ہیں، ان مدارس کی تعداد بھی 20 ہزار سے زائد ہے۔ صرف کراچی شہر میں 10 ہزار ایسے مدارس ہیں جو دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ بچوں اور بچیوں کو پرائمری لیول کی تعلیم دیتے ہیں۔ مڈل لیول کے 8 ہزار مدارس ان کے علاوہ ہیں۔

اقرأ طرز کے مدارس میں اقرأ روضۃ الاطفال زیادہ معروف ہے۔ خدام القرآن ایک ہزار سے زائد چھوٹے بڑے مدارس چلا رہی ہے، آپ کسی شہر میں چلے جائیں آپ کو وہاں ان جماعتوں کے مدارس ملیں گے۔ ایک اندازے کے مطابق دیوبندی مکتبہ فکر کے وفاق المدارس میں مجموعی طور پر 8 ہزار 3 مدارس رجسٹرڈ ہیں۔ ان مدارس میں حفظ کے ساتھ ساتھ ایم اے تک تعلیم بھی ممکن ہے جبکہ تمام مسجدوں میں چھوٹے بڑے مدارس قائم ہیں، ان کی تعداد ہزاروں نہیں لاکھوں میں چلی جاتی ہے۔

ایک سو پانچ بڑے مدارس کا تعارف:

قارئین! یہاں پر ہم پاکستان بھر کے ایک سو پانچ بڑے اور اہم ترین مدارس کا تعارف پیش کرنے جارہے ہیں۔

''جامعہ دارالعلوم کراچی''۔ اس عظیم الشان بین الاقوامی ادارے کے بانی مفتی اعظم پاکستان مولانا محمد شفیع رحمہ اللہ ہیں۔ آپ دارالعلوم دیوبند سے 1916ء میں فارغ التحصیل ہوئے۔ فراغت کے بعد 1943 تک اپنے مادر علمی ہی میں تدریس کے فرائض انجام دیے۔ 1948ء میں ہجرت کرکے پاکستان آگئے۔ 1949ء میں حضرت مفتی اعظم پاکستان مولانا محمد شفیعؒ نے جامع مسجد باب الاسلام آرام باغ، کراچی میں مدرسہ امدادالعلوم کے نام سے حفظ و ناظرہ کا ایک دینی ادارہ قائم کیا، جسے 1951ء میں نانک واڑہ کراچی میں منتقل کیا اور تعلیم جاری رکھی۔ جب اس ادارے میں طلبہ زیادہ ہوگئے تو ایک بڑی جگہ کی تلاش ہوئی۔ بالآخر شرافی گوٹھ کورنگی کراچی میں 65 ایکڑ زمین ملی جو حاجی ابراہیم صاحب دادا بھائیؒ اور حاجی عبداللطیف باوانیؒ کی کرم نوازی و دریادلی کا نتیجہ ہے۔ 17 / مارچ 1957ء میں مدرسہ دارالعلوم یہاں منتقل ہوا اور اب تک یہاں

قائم و دائم ہے۔ دارالعلوم کراچی کے چند مشہور وقدیم اساتذہ کرام یہ ہیں۔ مفتی رشید احمد لدھیانویؒ۔ مولانا عاشق الٰہی بلند شہریؒ۔ مولانا اکبر علی سہارنپوریؒ۔ مولانا قاری رعایت اللہؒ۔ مولانا امیر الزمان کشمیریؒ۔ مفتی بشیر احمد کشمیریؒ۔ مولانا سحبان محمودؒ۔ مولانا غلام محمدؒ۔ مولانا شمس الحق جلال آبادیؒ۔ مولانا بدیع الزمانؒ۔ مفتی ولی حسن ٹونکیؒ۔ مولانا محمد ادریس میرٹھیؒ اور مولانا سلیم اللہ خان صاحب ہیں۔ دارالعلوم کے موجودہ مہتمم اور صدر مفتی محمد رفیع عثمانی اور شیخ الحدیث مفتی محمد تقی عثمانی ہیں۔ ''جامعہ دارالعلوم کراچی'' شان وشوکت، تعمیر، نظم ونسق اور تعلیم کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہے۔ اس میں کوئی اس کا ہمسر اور ثانی نہیں۔

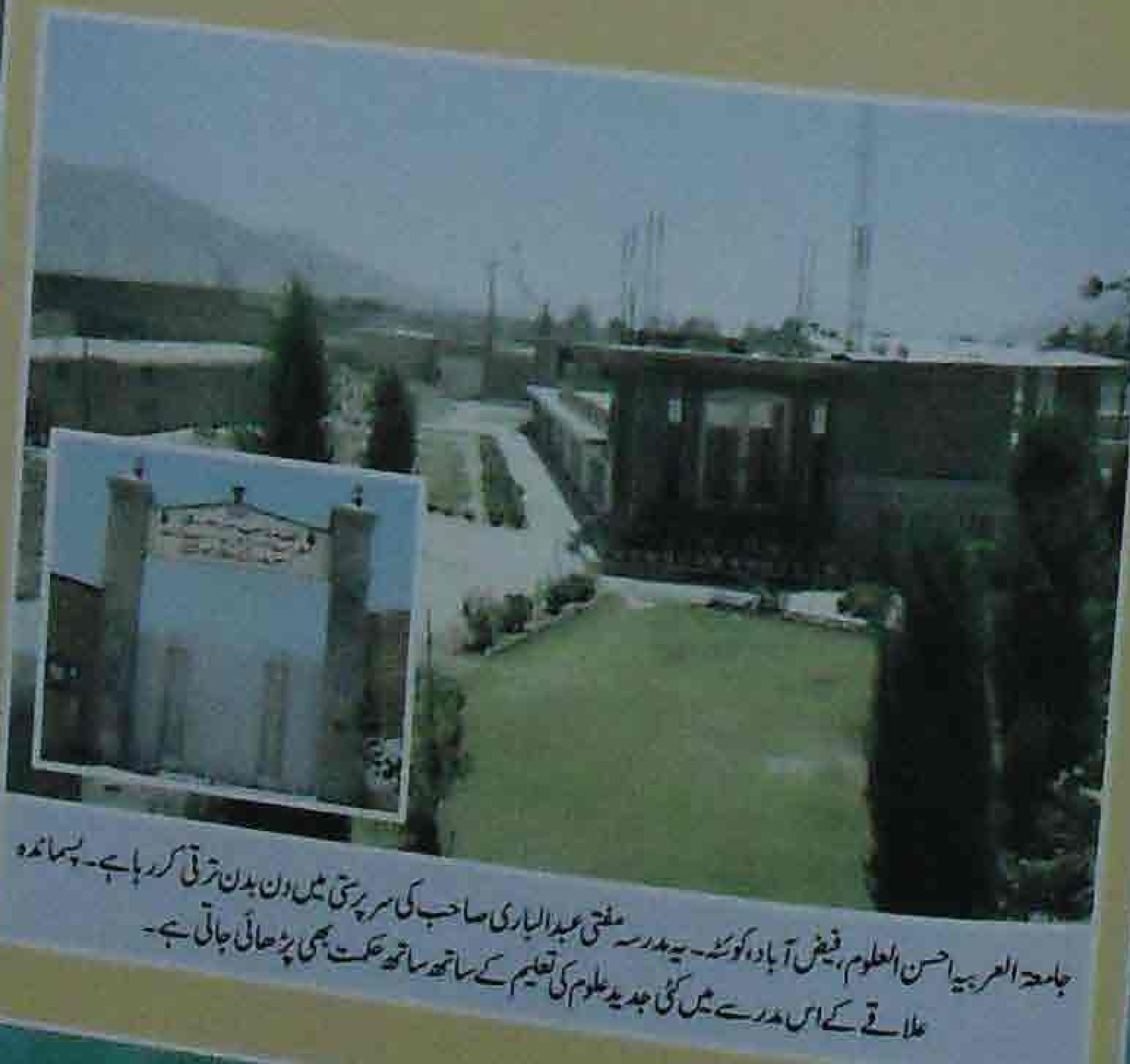
''جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن، کراچی''۔ اس کے بانی مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ ہیں۔ حضرتؒ نے ''دارالعلوم الاسلامیہ ٹنڈوالٰہ یار'' سے علیحدہ ہونے کے بعد اپنا ادارہ قائم کرنے کی غرض سے درجہ تکمیل کا اعلان فرمایا تاکہ فارغ التحصیل طلبہ کو مزید خصوصی تعلیم دی جائے۔ اس اعلان پر کئی فضلاء جمع ہوگئے اور حضرتؒ نے اگست 1954ء میں درس کا آغاز ''جامع مسجد نیو ٹاؤن کراچی'' کے صحن میں کیا۔ یوں ایک عظیم الشان ادارے کی بنیاد پڑی۔ عام مدارس میں ابتدائی درجات کی ابتدا پہلے ہوتی ہے لیکن یہاں اوپر والے درجات کی ابتدا پہلے ہوئی۔ بانی جامعہ نے شروع میں اس ادارے کا نام ''المدرسۃ العربیہ'' رکھا۔ چونکہ اس نام سے ایک ادارہ پہلے ہی سے چل رہا تھا۔ اس لیے ایک عرصہ کے بعد ''المدرسۃ العربیہ الاسلامیہ'' نام رکھا گیا۔ بیس سال تک یہ نام رہا۔ اس کے بعد اس کا نام ''جامعۃ العلوم الاسلامیہ'' رکھا گیا، اب یہی نام چل رہا ہے۔ اب اس ادارے میں اعدادیہ سے لے کر دورۂ حدیث، تخصص فی الفقہ اور تخصص فی الحدیث تک جملہ دینی علوم کی اعلیٰ تعلیم ہوتی ہے۔ پورے کراچی میں 22 کے لگ بھگ اس کی شاخیں ہیں۔ ہر شاخ مستقل ادارہ ہے جہاں موقوف علیہ تک تعلیم ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے پاکستان کا سب سے بڑا ادارہ یہی ہے۔ 17 راکتوبر 1977ء میں بانی جامعہ کا انتقال ہوا۔ اس کے بعد مجلس شوریٰ نے مولانا احمد الرحمٰن کو مہتمم مقرر کیا۔ مفتی احمد الرحمٰن کے انتقال کے بعد مجلس شوریٰ نے مولانا ڈاکٹر محمد حبیب اللہ مختار کو مہتمم بنادیا۔ 2 رنومبر 1997ء میں مولانا حبیب اللہ مختار اور جامعہ کے ایک سنیئر

ترین استاذ مولانا مفتی عبدالسمیع کو شہید کردیا گیا۔ ان کی شہادت کے بعد مجلس شوریٰ نے مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر صاحب کو مہتمم بنادیا جواب تک مہتمم اور شیخ الحدیث ہیں۔ جامعہ کے چند باکمال اساتذہ کے نام یہ ہیں۔ مولانا سید مصباح اللہ شاہؒ۔ مفتی ولی حسن ٹونکیؒ۔ مولانا محمد ادریس میرٹھیؒ۔ مولانا عبدالقیوم چترالیؒ۔ پاکستان میں بھٹو خاندان کے متعلق مشہور ہے اس خاندان کے جتنے افراد کو سفاکانہ انداز میں قتل کیا گیا کسی اور حکمران خاندان کے اتنے افراد کو قتل نہیں کیا گیا۔ اسی طرح پاکستان کے دینی مدارس میں سے ''جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن، کراچی'' کے جتنے علماء کو بہیمانہ انداز میں شہید کیا گیا اتنے کسی اور دینی ادارے کے افراد شہید اور قتل نہیں ہوئے۔ بطور نمونہ جامعہ ہذا کے چند شہدا کے نام پیش خدمت ہیں۔ مولانا حبیب اللہ مختارؒ، مفتی عبدالسمیعؒ، سید محمد بنوری بن مولانا محمد یوسف بنوری، مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ، مفتی نظام الدین شامزئیؒ، مفتی جمیل خانؒ، مفتی سعید احمد جلالپوریؒ۔ روشن حقیقت یہ ہے کہ جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن، کراچی'' کی جتنی قربانیاں ہیں اتنی کسی اور ادارے کی نہیں۔

''جامعہ اشرفیہ لاہور۔'' اس جامعہ کے بانی وموسس حضرت مولانا مفتی محمد حسن امرتسریؒ بن مولانا اللہ داد ہیں۔ آپ 1922ء میں دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہوئے۔ فراغت کے بعد امرتسر ہی میں مدرسہ غزنویہ اور مدرسہ نعمانیہ میں قیام پاکستان تک درس وتدریس کی خدمات سرانجام دیں۔ قیام پاکستان کے بعد حضرت مفتی صاحبؒ اور مدرسہ نعمانیہ کے اکثر خدام لاہور آگئے اور مول چند بلڈنگ نیلا گنبد لاہور میں مدرسہ نعمانیہ کی نشاۃ ثانیہ کا آغاز کیا۔ 1955ء کو یہ مدرسہ فیروز پور روڈ لاہور منتقل ہوگیا اور مدرسہ کا نام اپنے پیر ومرشد مولانا اشرف علی تھانویؒ کی نسبت سے ''جامعہ اشرفیہ'' رکھا گیا۔ یہاں پر ابتدائی درجات سے لے کر دورۂ حدیث تک تعلیم دی جاتی ہے۔ جامعہ کے موجودہ مہتمم مولانا فضل الرحیم صاحب ہیں۔ موجودہ شیخ الحدیث مولانا صوفی محمد سرور صاحب ہیں۔ جامعہ اشرفیہ لاہور سے 1947ء سے 2004ء تک مجموعی طور پر پندرہ ہزار سے زائد طلبہ فارغ التحصیل ہوئے۔ تین ہزار سے زائد طلبہ حفاظ بنے۔ دارالافتاء سے دولاکھ سے زائد فتاویٰ جاری ہوئے۔ جامعہ کی دس سے زیادہ شاخیں ہیں جن میں تین ہزار سے زائد طلبہ



بلوچستان کی قدیم دینی درسگاہ ''دار العلوم بھاگ''



جامعہ العربیہ احسن العلوم، فیض آباد، کوئٹہ۔ یہ مدرسہ مفتی عبدالباری صاحب کی سرپرستی میں دن بدن ترقی کر رہا ہے۔ پسماندہ علاقے کے اس مدرسے میں کئی جدید علوم کی تعلیم کے ساتھ ساتھ حکمت بھی پڑھائی جاتی ہے۔



''دار العلوم حسینیہ منڈی بہاؤالدین'' کی قدیم عمارت۔ وسائل کی کمیابی کے باوجود مدارس جو علمی و رفاہی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اس کی مثال دیگر معاصر اداروں اور این جی اوز میں خال خال ہی مل سکیں گی۔



''جامعہ عربیہ اشاعت القرآن خنفرو، ضلع اٹک''۔ ملک کے نواحی علاقوں میں بھی مدارس کی بے لوث خدمات قابلِ رشک ہیں۔



’’دار العلوم خضدار، بلوچستان‘‘۔ وسائل کی کمیابی اور غیر موافق موسمی حالات کے باوجود یہاں طلبہ کی بڑی تعداد روز و شب اپنے مقصد کے حصول میں مگن ہے۔



’’جامعہ اسلامیہ، چمن‘‘۔ کشمیر تا کراچی اور سیالکوٹ تا چمن طولاً عرضاً، شرقاً غرباً پھیلے ایک نظریے کے حامل یہ مدارس ملک کے اتحاد کے لیے کتنے اہم ہیں؟ شاید اب تک اس سوال پر توجہ نہیں دی گئی۔ چھوٹی تصویر میں جامعہ کا دار الحدیث واضح ہے۔



''دار العلوم اشاعت القرآن مظفر آباد''۔ کشمیر کے بلند پہاڑوں کے بیچ میں یہ دینی درسگاہ اقبال کے شاہین کے لیے آئیڈیل بھی ہو سکتی ہے۔



''جامعہ تعلیم القرآن راولپنڈی''۔ شیخ القرآن مولانا غلام اللہ خان صاحب رحمہ اللہ کے ہاتھوں ترقی کے مراحل طے کرنے والا یہ ادارہ اشاعتِ قرآن کے اہم مراکز میں شمار ہوتا ہے۔

پڑھتے ہیں۔ 2006ء کی ایک رپورٹ کے مطابق جامعہ کی لائبریری میں پندرہ ہزار کتابیں ہیں۔
جامعہ اشرفیہ کے چند قدیم باکمال اساتذہ یہ ہیں۔ صاحب سیرۃ المصطفیٰ مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ۔ مولانا غلام رسول خان ہزارویؒ۔ مولانا مفتی جمیل احمد تھانویؒ۔ مولانا محمد مالک کاندھلویؒ۔ مولانا ضیاء الحق بن مولانا حافظ علاؤ الدین علوی انگیؒ۔ مولانا غلام محمدؒ، مولانا موصوف دارالعلوم دیوبند کے فاضل اور انتہائی متقی اور باصلاحیت تھے۔ مولانا مہر محمدؒ۔ مولانا شریف اللہؒ۔ مولانا عبیداللہ امرتسری بن مولانا مفتی محمد حسن امرتسریؒ۔ مولانا محمد موسیٰ خان روحانی بازیؒ۔ مولانا مفتی حمیداللہ جان۔ مولانا محمود اشرف عثمانی ہیں۔

”جامعہ خیر المدارس ملتان“۔ اس جامعہ کے قیام کا پس منظر کچھ یوں ہے مولانا خیر محمد جالندھری رحمہ اللہ، مولانا احمد بخش صاحب رحمہ اللہ اور مولانا محمد علی جالندھری رحمہ اللہ تینوں مدرسہ فیض محمدی جالندھر شرقی پنجاب ہندوستان میں مدرس تھے اچانک مدرسہ بند ہوگیا۔ جس کی وجہ سے طلبہ اور مذکورہ اساتذہ کرام مسجد عالمگیری چلے گئے اور وہیں درس وتدریس کا سلسلہ شروع کردیا۔ اس کے بعد حکیم الامت اشرف علی تھانویؒ سے مشورہ کیا گیا۔ مولانا تھانوی رحمہ اللہ نے ”خیر المدارس“ کے نام سے مدرسہ کا قیام تجویز فرمایا۔ چنانچہ 9 مارچ 1931ء کو جامعہ خیر المدارس کی بنیاد ڈالی گئی۔ قیام پاکستان کے بعد یہ حضرات ہجرت کر کے ملتان پاکستان تشریف لائے اور مؤرخہ 18 اکتوبر 1947ء کو سابقہ مدرسہ کا دوبارہ اجرا ہوا، جواب تک ترقی کی شاہراہ پر رواں دواں ہے۔ جامعہ کے موجودہ مہتمم مولانا قاری حنیف جالندھری ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مولانا موصوف کو تحریر وتقریر اور حسن انتظام کا جو ملکہ عطا فرمایا ہے وہ قابل تقلید ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکابرین نے انہیں وفاق المدارس العربیہ پاکستان کی نظامت عطا کی۔ بلکہ ”اتحاد تنظیمات مدارس دینیہ پاکستان“، جس میں دیوبندیوں کی تنظیم ”وفاق المدارس العربیہ پاکستان“ اہل حدیث کی ”وفاق المدارس السلفیہ پاکستان“، شیعوں کی ”وفاق المدارس شیعہ پاکستان“ بریلویوں کی ”تنظیم المدارس پاکستان“ اور جماعت اسلامی کی ”رابطۃ المدارس پاکستان“ شامل ہیں، کے چیئرمین کا عہدہ بھی جالندھری صاحب کے پاس ہے۔

"جامعہ حقانیہ اکوڑہ خٹک"۔ جامعہ ہذا کی بنیاد شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق رحمہ اللہ نے ستمبر 1947ء میں رکھی۔ مولانا موصوفؒ نے 1932ء میں دیوبند سے فراغت کے بعد اکتوبر 1943ء سے جولائی 1947ء تک دارالعلوم دیوبند میں تدریس فرمائی۔ اس کے بعد پاکستان تشریف لائے اور جامعہ حقانیہ کی بنیاد رکھنے کے ساتھ ساتھ اہم قومی وملی خدمات بھی سرانجام دیں۔ بانیٔ جامعہ شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحقؒ لکھتے ہیں: "مجھے اگرچہ تاریخی اعتبار سے متحقق نہیں مگر آثار وقرائن سے یہ معلوم ہوتا ہے دارالعلوم حقانیہ اسی جگہ قائم ہے جہاں شہداء بالاکوٹ کی سب سے پہلی تلوار چلی تھی، یہاں ان کے رفقاء شہید ہوئے تھے۔" ایک رپورٹ کے مطابق 2000ء تک اس ادارے سے پندرہ ہزار علماء فارغ التحصیل ہو چکے ہیں۔ فتاویٰ کی تعداد دو لاکھ ہے۔ تالیفات 50 ہیں۔ جامعہ کی عمارتوں کے نام سے جامعہ کا مسلک ومشرب کا پتا چلتا ہے جیسے احاطہ مدنیہ، احاطہ قاسمیہ، احاطہ محمودیہ، احاطہ سید احمد شہید، احاطہ شاہ اسماعیل شہید، احاطہ یوسفیہ اور احاطہ ماوراء النہر۔ یہاں ایوان شریعت کے نام سے جدید دارالحدیث کی پرشکوہ عمارت ہے جسے دیکھ کر دل خوشی سے باغ باغ ہوجاتا ہے۔ دورۂ حدیث میں لگ بھگ پانچ سو طلبا ہوتے ہیں۔ جامعہ ہذا نے افغان جہاد اور طالبان کی حمایت میں جوائنٹ کردار ادا کیا وہ انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ اس پر متعدد رسائل آ چکے ہیں۔ خصوصاً شیخ الحدیث حضرت مولانا ڈاکٹر شیر علی شاہ صاحب اور مہتمم جامعہ حضرت مولانا سمیع الحق صاحب جو بانی جامعہ کے صاحبزادے ہیں اور 1988ء سے اب تک مہتمم اور استاذ حدیث ہیں، کا کردار بے غبار اور مؤثر رہا جس کی وجہ سے جامعہ ہذا اغیار کی تنقید اور طعن وتشنیع کا نشانہ بھی بنا۔ یہاں کے شیخ الحدیث مولانا ڈاکٹر شیر علی شاہ صاحب ہیں۔

"جامعہ فاروقیہ، شاہ فیصل کالونی، کراچی"۔ اس کے بانی استاذ المحدثین مولانا سلیم اللہ خان صاحب ہیں۔ آپ دارالعلوم دیوبند سے 1947ء میں فارغ التحصیل ہوئے۔ فراغت کے بعد مدرسہ مفتاح العلوم جلال آباد میں باقاعدہ مدرس مقرر ہوئے اور آٹھ سال تدریس کی۔ 1954ء کو "دارالعلوم الاسلامیہ ٹنڈو الہ یار حیدرآباد" میں استاذ الحدیث مقرر ہوئے۔ 1956ء تک یہاں دورۂ حدیث تک کی کتابیں پڑھائیں۔ 1957ء سے 1967ء تک جامعہ دارالعلوم کراچی میں

تدریس کی۔ اس دور میں جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن میں بھی ایک سال حدیث کی کتابیں پڑھائیں۔ جامعہ دارالعلوم کراچی چھوڑنے کے بعد 23/جنوری 1967ء حضرت نے شاہ فیصل کالونی کراچی میں ''جامعہ فاروقیہ'' کے نام سے ایک ادارے کی بنیاد ڈالی جو آج ملک کے ممتاز مدارس میں شامل ہے۔ اس ادارے نے قلیل مدت میں جو حیرت انگیز ترقی کی اور دینی مدارس کے لیے قابل قدر نمونہ پیش کیا ہے۔ وہ بانی جامعہ کی للّٰہیت اور جہد مسلسل کا نتیجہ ہے۔ 2003ء کی ایک رپورٹ کے مطابق فضلائے جامعہ کی تعداد 19600، فضلائے حفاظ کرام کی تعداد 7400، فضلائے تخصصات کی تعداد 2550 اور جاری شدہ فتاویٰ کی تعداد 38000 ہے۔ یہاں اعدادیہ سے دورۂ حدیث اور تخصص تک کی اعلیٰ تعلیم ہوتی ہے۔

''جامعۃ الرشید، احسن آباد، کراچی''۔ اس کے بانی مفتی رشید احمد لدھیانویؒ تھے۔ آپ 26 ستمبر 1922ء میں ہندوستان کے علاقے ''لدھیانہ'' میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم جہانگیر آباد خانیوال، گکھڑ ضلع گوجرانوالہ، دارالہدیٰ ٹھیڑی خیرپور سندھ اور ''اَنّی'' ضلع گجرات پنجاب میں حاصل کی۔ 1360 ہجری میں دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہوئے۔ آپ کے مشہور اساتذہ میں شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی، حضرت مولانا اعزاز علی، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع ہیں۔ آپ کا اصلاحی تعلق مولانا حسین احمد مدنی، مفتی محمد حسن، مولانا عبدالغنی پھولپوری رحمہم اللہ سے رہا۔ آپ کو اجازتِ بیعت مولانا عبدالغنی پھولپوری سے ہوئی۔ آپ نے تقریباً چالیس سال تک مختلف مؤقر تعلیمی اداروں مدینۃ العلوم دارالعلوم حیدرآباد، دارالہدیٰ ٹھیڑی، جامعہ دارالعلوم کراچی اور دارالافتاء والارشاد میں تدریس فرمائی۔ بیس مرتبہ بخاری شریف کا درس دیا۔ کچھ عرصہ دارالعلوم کراچی کے ناظمِ تعلیمات رہے۔ آپ نے ہزارہا فتاویٰ تحریر کیے۔ منتخب فتاویٰ کے مجموعہ ''احسن الفتاویٰ'' کی 10 جلدیں شائع ہوچکی ہیں۔ تصنیف وتالیف میں 100 کے لگ بھگ علمی وتحقیقی رسائل۔ 70 سے زائد اصلاحی مواعظ ہیں۔ مشہور کتابیں: انوار الرشید، جواہر الرشید، قانونِ وراثت، محبت الٰہیہ، شرعی پردہ اور دیگر مشہور علمی، اصلاحی اور تحقیقی کتب۔ پسماندگان: بیوہ، تین بیٹے، دو بیٹیاں۔ شاگرد ومریدین: ملک اور بیرون ملک میں ہزاروں شاگرد، مریدین اور بے شمار

اصلاحی تعلق رکھنے والے متنسبین۔ مشہور شاگرد: مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی، شیخ الحدیث حضرت مولانا جسٹس (ر) محمد تقی عثمانی، مفتی احتشام الحق آسیا آبادی، مفتی محمد، مفتی محمد ابراہیم صادق آبادی، مفتی ابولبابہ شاہ منصور۔ علمی واصلاحی خدمات: ایک کثیر الجہت شخصیت کی حیثیت سے علمی، اصلاحی، تبلیغی، رفاہی اور صحافتی میدانوں میں گراں قدر خدمات انجام دیں اور اس حوالے سے مشہور اور کثیر الفوائد اداروں کے بانی وسرپرست رہے۔ دارالافتاء والارشاد، الرشید ٹرسٹ ہفت روزہ ضربِ مومن اور روزنامہ اسلام آپ ہی کے فیض کا قابلِ رشک نمونہ ہیں۔ آپ نے اصلاح وارشاد سے رفاہِ عامہ تک اور تعلیم سے صحافت تک 16 مختلف شعبے جاری فرمائے۔ ہر ایک شعبہ اب ایک شجرِ سایہ دار کی حیثیت رکھتا ہے، جس کی شاخیں ماشاء اللہ دن بدن بڑھتی ہی جارہی ہیں۔ آپ کی وفات 6 ذوالحجہ 1422ھ مطابق 19 رفروری 2002ء بروز منگل ہوئی۔ "جامعہ الرشید، احسن آباد، کراچی" آپ کے لیے صدقہ جاریہ ہے۔ اس وقت جامعہ کے مہتمم آپ کے خلیفہ مفتی عبدالرحیم صاحب ہیں۔ جامعہ کا نظم ونسق اور تعلیمی معیار نہایت اعلیٰ ہے۔ یہاں پر علوم جدیدہ اور فلکیات کے مستقل شعبے ہیں۔ مفتی عبدالرحیم صاحب کی جہد مسلسل اور محنت شاقہ کی وجہ سے یہ دینی ادارہ دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی کر رہا ہے۔

"جامعہ اشرف المدارس، گلشن اقبال، کراچی"۔ اس کے بانی مولانا حکیم محمد اختر صاحب ہیں۔ آپ 1928ء میں ہندوستان کے صوبہ یوپی کے علاقے "پرتاب گڑھ" میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام محمد حسین ہے۔ حضرت حکیم صاحب نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ وسطانی تعلیم کے لیے مولانا شاہ عبدالغنی پھولپوریؒ کے "مدرسہ بیت العلوم" میں داخلہ لیا۔ چار سال تک وہیں تعلیم حاصل کی۔ بخاری شریف کے کچھ اقتباسات حضرت مولانا شاہ عبدالغنی پھولپوریؒ سے پڑھے۔ آپ 16 سال کی عمر میں شاہ عبدالغنی پھولپوریؒ (خلیفہ حضرت حکیم الامت تھانویؒ) کی خدمت میں حاضر ہوئے اور شب وروز خدمت کی۔ حضرت پھولپوریؒ کی اہلیہ کے انتقال کے بعد حکیم صاحب نے اپنی والدہ محترمہ کا نکاح اپنے مرشد حضرت پھولپوریؒ سے کر دیا۔ یوں حضرت پھولپوریؒ حضرت حکیم صاحب کے سوتیلے والد ہوئے۔ جب حضرت حکیم صاحب نے حضرت

پھولپوری کو اپنی والدہ کا پیغام نکاح دیا تو حضرت پھولپوریؒ نے یہ فرما کر منظوری دی کہ امام اعظم ابوحنیفہؒ نے بھی اپنے شاگرد رشید امام محمدؒ کی والدہ محترمہ سے نکاح فرمایا تھا۔ بہر حال! مولانا حکیم محمد اختر صاحب نے برصغیر کی تقسیم کے بعد پاکستان کی طرف ہجرت کی۔ 1974ء کو ناظم آباد نمبر 4 کراچی میں ایک دینی ادارے کی بنیاد ڈالی جہاں قرآن کریم کی تعلیم کے ساتھ مجلس اشاعت الحق کا تبلیغی کام بھی جاری ہوا۔ 1980ء میں گلشن اقبال نمبر 2 کراچی میں 1300 مربع گز پر مشتمل پلاٹ خریدا اور سابقہ قرآنی مکتب یہاں منتقل کیا، جو اب ''جامعہ اشرف المدارس'' کے نام سے معروف ہے اور ساتھ خانقاہ بھی ہے۔ 1992ء میں گلستان جوہر بلاک ۱۲، سندھ بلوچ سوسائٹی کراچی میں 4000 گز کا پلاٹ حاصل کیا گیا، جہاں 1993ء میں جامع مسجد کی تعمیر ہوئی اور بعد میں مدرسہ اور خانقاہ کی عمارتیں کھڑی ہوئیں۔ یوں جامعہ اشرف المدارس گلشن اقبال وہیں منتقل ہوگیا۔ 1994ء میں دورۂ حدیث کا افتتاح ہوا اور مولانا مفتی وجیہہ حیدرآبادی شیخ الحدیث مقرر ہوئے۔ 2007ء کی ایک رپورٹ کے مطابق ''جامعہ اشرف المدارس گلشن اقبال، کراچی'' کی 22 شاخیں ہیں۔ جملہ شاخوں کے حفظ وناظرہ کے طلبہ وطالبات کی تعداد 2655 ہے۔ 1300 سے زائد طلبہ وطالبات نے حفظ کی تکمیل کی۔ شعبہ حفظ وناظرہ میں 100 سے زائد اساتذہ واستانیاں مصروف عمل ہیں۔ شعبہ کتب بنین وبنات میں 1655 طلبہ وطالبات زیر تعلیم ہیں۔ 2000ء سے باقاعدہ دارالافتاء اور تخصص فی الافتاء کا شعبہ بھی قائم ہے۔ ''جامعہ اشرف المدارس گلشن اقبال، کراچی'' کے موجودہ مہتمم مولانا حکیم محمد مظہر صاحب ہیں، جو نہایت خلیق انسان ہیں۔ اس ادارے میں تعلیم وتربیت کے ساتھ روحانی اور اصلاحی تعلق پر بھی زور دیا جاتا ہے۔ بانی جامعہ کا مشہور مقولہ ہے: ''کتب بینی کے ساتھ قطب بینی بھی ضروری ہے۔''

''مدرسہ اشرفیہ، جیکب لائن، کراچی''۔ اس کے بانی مولانا احتشام الحق تھانوی تھے۔ مولانا احتشام الحق قیام پاکستان 1947ء سے چند دن قبل کراچی تشریف لائے اور جیکب لائن میں سکونت اختیار کی۔ یہاں آ کر احساس ہوا بچوں کی دینی تعلیم کے لیے ایک ادارے کی ضرورت ہے۔ اس وقت کوئی دینی ادارہ نہیں تھا۔ اس ضرورت کے تحت آپ نے اکتوبر 1947ء میں اس

دینی ادارے کی بنیاد رکھی جس کا نام حکیم الامت اشرف علی تھانویؒ کی نسبت سے ''مدرسہ اشرفیہ'' رکھا۔ دو سال تک یہ ادارہ حفظ و ناظرہ تک محدود رہا، لیکن جولائی 1950ء میں یہاں درس نظامی کا نصاب درجۂ خامسہ تک رکھا گیا، تاکہ حفظ و ناظرہ سے فارغ ہونے والے طلبہ ابتدائی دینی تعلیم بھی یہیں حاصل کرسکیں۔ اسی طرح ''جامعہ احتشامیہ جیکب لائن کراچی'' بھی آپ ہی کا قائم کردہ ہے۔ اس کی بنیاد 25 شوال ہجری 1411 بمطابق 15 رمئی 1991 کو رکھی گئی۔ اس مدرسے میں اعدادیہ سال اوّل سے دورۂ حدیث اور تخصص فی الافتاء تک کی تعلیم دی جارہی ہے، جبکہ شعبۂ ناظرہ وحفظ، شعبۂ انگریزی، شعبہ تجوید اور شعبۂ تصنیف و تالیف وغیرہ شعبے بھی کامیابی کے ساتھ منزل مقصد کی طرف رواں دواں ہیں۔ جامعہ احتشامیہ جیکب لائن کراچی کی تین بڑی شاخیں ''مدرسہ ابوبکر صدیق''، ''جامع مسجد ابراہیم''، ''جامع مسجد حسنات کوئٹہ ٹاؤن'' بھی مصروف عمل ہیں۔

''جامعہ دار العلوم، پشاور''۔ اس کے بانی حضرت مولانا فقیر محمدؒ پشاوری ہیں۔ انہوں نے 1983ء میں مقامی لوگوں کے تعاون سے جامعہ ہذا کی بنیاد رکھی۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے فرزندار جمند حاجی عبدالرحمٰن نے انتظام سنبھالا اور حضرت مولانا حسن جان شیخ الحدیث مقرر ہوئے جو شہادت 15 رستمبر 2007ء تک اس منصب جلیلہ پر فائز رہے، جبکہ نائب شیخ الحدیث حضرت مولانا امان اللہ صاحب ہیں۔ سن تاسیس سے 2000ء تک چھ سو سے زائد علما اور تین سو سے زائد حفاظ کرام فارغ التحصیل ہوئے۔ صوبہ خیبر پختونخوا میں اس جامعہ نے بہت ترقی کی ہے۔ صرف دورۂ حدیث میں پانچ سو کے لگ بھگ طلبہ ہوتے ہیں۔

''جامعہ دار العلوم، پشاور''۔ اس کی بنیاد حضرت مولانا سید محمد ایوب جان بنوریؒ نے رکھی۔ آپ 1933ء میں دار العلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہوئے۔ 19 جولائی 1951ء کو جامع مسجد سول کوارٹر کوہاٹ روڈ میں مدرسہ کی بنیاد رکھی۔ پھر 1960ء میں موجودہ جامعہ کی نئی عمارت کا سنگ بنیاد ''آسیا دروازے'' کے باہر سرکلر روڈ پر حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کے شاگرد رشید، تحریک آزادی کے سرخیل حضرت مولانا عزیر گل پشاوری اور محدث غور گشتی حضرت مولانا نصیر الدین بن مولانا بہاؤالدین رحمہ اللہ نے رکھا۔ اس وقت سے 2000ء تک 600 سے زائد علماء فارغ ہوئے۔

"جامعہ مدنیہ، لاہور"۔ اس کے بانی مولانا سید حامد میاں رحمہ اللہ ہیں جو مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ کے خلفاء میں سے تھے۔ اس مدرسہ کی ابتدا 1952ء کو احمد یہ بلڈنگ لاہور میں ہوئی۔ اس وقت مدرسہ کا نام "احیاء العلوم" تھا۔ 1955ء میں مسلم مسجد لوہاری میں "جامعہ مدنیہ" کے نام سے کام شروع ہوا، پھر مدرسہ لوہاری گیٹ سے 1964ء کو کریم پارک راوی روڈ لاہور میں منتقل ہوا۔ یہ جگہ حاجی غلام محمد عرف گاما نے دی۔ مولانا سید حامد میاں رحمہ اللہ کی وفات کے بعد جامعہ مدنیہ کے مہتمم ان کے صاحبزادے مولانا سید محمود میاں صاحب مقرر ہوئے، جو اب تک یعنی جون 2010ء تک ہیں۔ بانئ جامعہ کی خواہش تھی جامعہ کے لیے ایک اور بڑی جگہ حاصل کی جائے تاکہ جامعہ کو وسیع کرنا آسان ہو۔ اس خواہش کے مطابق 1981ء میں لاہور رائے ونڈ روڈ پر لب سڑک ایک بڑی زمین خریدی گئی، جہاں اب "جامعہ مدنیہ جدید" قائم ہے۔ اس ادارے سے 2000ء تک 800 طلبہ فارغ التحصیل ہوئے۔ 300 حفاظ نکلے۔ 947 قراء فارغ ہوئے۔ یہاں دورۂ حدیث تک پڑھائی کا نظم ہے۔ تجوید "شعبہ عشرہ" تک ہے اور افتاء کا کام بھی تسلی بخش ہے۔

"دار العلوم الاسلامیہ، لاہور"۔ اس کے بانی حافظ سخاوت علیؒ ہیں۔ سن تأسیس 1948ء ہے۔ بانئ جامعہ کے انتقال کے بعد قاری سراج احمدؒ جامعہ کے مہتمم بنے۔ قاری صاحبؒ نے اپنے دور میں یہاں شعبۂ تجوید کا اجراء کیا اور اسے خوب ترقی دی۔ اپریل 1983ء میں انتظامیہ کمیٹی کے صدر مولانا محمد مالک کاندھلویؒ مقرر ہوئے، جبکہ مولانا مشرف علی تھانوی صاحب مہتمم بنے اور مدرسہ نے بے حد ترقی کی۔ یہاں 1987ء میں ایک شعبہ بنام "اشرف التحقیق" کا قیام عمل میں آیا، جس کے تحت جمیل الفتاویٰ، عکس جمیل، جمالیات جمیل، مقالات جمیل اور مواعظ حکیم الامت وغیرہ درجنوں کتابیں شائع ہوئیں۔ طلبہ کی تعداد دو ہزار کے قریب ہے۔ دورۂ حدیث تک پڑھائی ہے۔ اسی ادارے میں قاری عبد المالک لکھنوی، قاری عبد العزیز شوقی انبالوی اور قاری افتخار احمد عثمانیؒ نے تجوید کا درس دیا۔ 1983ء سے جون 2010ء تک اس کے مہتمم حضرت مولانا مشرف علی تھانوی صاحب ہیں۔

"فخر المدارس قاسم العلوم، گھوٹکی"۔ سن تأسیس 1911ء ہے۔ اس کے بانی پیر فخر الدین شاہ

رحمہ اللہ ہیں۔ یہ خلیفہ مجاز ہیں حضرت حکیم الامت تھانویؒ کے۔ اس عظیم دینی درسگاہ کے متعلق جامعہ فخر المدارس قاسم العلوم گھوٹکی کے عالم دین مولانا پیر سید خلیل احمد شاہ جیلانی نے اپنے والد حضرت مولانا سید حبیب اللہ شاہ کی روایت کو اپنے نوٹ بک میں تحریر کیا ہے۔ فخر المدارس قاسم العلوم کا قیام 1911ء کو عمل میں آیا۔ یہ مدرسہ پنو عاقل ضلع سکھر سندھ کے گاؤں "بچہ گوٹھ" میں حضرت مولانا محمد صالح ہالیجوی کی سرپرستی میں قائم ہوا۔ پھر دو سال بعد سکھر منتقل ہوا۔ دو سال کے بعد گھوٹکی شہر میں منتقل ہوا۔ شہر کی دو جگہوں میں عارضی تعلیمی سلسلہ جاری رہا۔ پھر 1941ء میں موجودہ شاندار عمارت رحموالی روڈ (جو حسین بیلی روڈ کے سنگم پر واقع ہے) میں منتقل ہوا، جو آج تک اپنے تعلیمی آب وتاب سے قائم ودائم ہے۔ غرض جامعہ قاسم العلوم ایک قدیم دینی ادارہ ہے جس کا ایک شاندار ماضی ہے۔ اسے دارالعلوم دیوبند کی طرح بیک وقت عظیم اساتذہ اور عظیم شاگردوں کی سعادت حاصل ہے، بلکہ بیک وقت اہل اللہ اور اہل دل بزرگان کی سرپرستی ونسبت حاصل رہی ہے۔ ہر ایک اپنے زمانے کی نابغہ روزگار شخصیت تھی۔ ان میں مفسر ومحدث، محقق و فقیہ اور متکلم ومجاہد فی سبیل اللہ تھے۔ اس کے سرپرستوں میں آزادی کے امام ومجاہد حضرت مولانا پیر تاج محمود امروٹیؒ۔ قطب الاقطاب حضرت مولانا حماد اللہ ہالیجویؒ۔ حضرت مولانا محمد صالح ہالیجوی۔ حضرت مولانا سید حبیب اللہ شاہ۔ استاذ العلماء حضرت مولانا امید علی، فاضل دارالعلوم دیوبند۔ استاذ الکل حضرت مولانا عبدالرزاق بجوی بھٹو۔ علامۃ الدھر مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی۔ رئیس الاتقیاء سائیں مولانا عبدالکریم قریشی بیر شریف۔ قطب الارشاد مولانا حافظ محمود السعد ہالیجوی شامل ہیں۔ "فخر المدارس قاسم العلوم، گھوٹکی" کے فیض یافتگان کا سلسلہ اتنا وسیع ہے، اگر ان کو احاطہ تحریر میں لایا جائے تو انسائیکلوپیڈیا تیار ہو سکتا ہے۔

"دارالعلوم کبیر والا، خانیوال"۔ اس ادارے کے بانی مولانا عبدالخالقؒ تھے۔ آپ ایک عرصہ تک دارالعلوم دیوبند میں تدریس کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ استاذ المحدثین مولانا سلیم اللہ خان کے بھی استاذ ہیں۔ مولانا موصوفؒ نے 1956ء تک قاسم العلوم ملتان میں تدریس فرمائی۔ پھر 1957ء میں دارالعلوم کبیر والا کی بنیاد رکھی۔ اس ادارے کی بنیاد رکھ کر بانی جامعہ نے

اپنے ایک شاگرد مفتی علی محمدؒ فاضل دارالعلوم دیوبند کو یہاں مدرس مقرر کیا۔ 1958ء میں یہاں دورۂ حدیث کا افتتاح ہوا تو پہلے سال بخاری شریف کا درس بانی جامعہ نے دیا۔ اگلے سال بخاری شریف کی ایک جلد مولانا علی محمدؒ کے ذمے میں آ گئی۔ 1959ء سے 1987ء تک اٹھائیس سال مکمل بخاری کی تدریس مولانا علی محمد کرتے رہے۔ 1987ء میں مولانا علی محمدؒ نے بخاری شریف کی تدریس پر اپنے ایک شاگرد مولانا مفتی عبدالقادرؒ کو مامور فرمایا اور وہ تا وفات بخاری شریف کا درس دیتے رہے۔ ادارے کے بانی مولانا عبدالخالق کے انتقال کے بعد مولانا منظور الحق مہتمم بنے۔ ان کے انتقال کے بعد مولانا محمد انور مہتمم بنے۔ ان کا انتقال اکتوبر 2004ء میں ہوا۔ ان کے بعد شیخ الحدیث مولانا ارشاد احمد صاحب مہتمم بنے اور ہنوز 2010ء تک اس عہدے پر فائز ہیں۔ ''دارالعلوم کبیر والا، خانیوال'' میں جن ممتاز علمائے کرام نے تدریسی خدمات سر انجام دیں، ان میں سے چند کے نام یہ ہیں: مولانا ظہور الحق، مولانا صوفی محمد سرور صاحب، مفتی عبدالقادر صاحب، مولانا احسان الحق تونسوی صاحب، مولانا محمد انور صاحب، مولانا محمد یٰسین صابر صاحب، مولانا ظفر احمد قاسمی صاحب، مولانا عبدالرحمٰن صاحب، مولانا مفتی انور اوکاڑوی صاحب قابل ذکر ہیں۔

''جامعہ اسلامیہ امدادیہ، فیصل آباد''۔ اس کی بنیاد شیخ الحدیث حضرت مولانا نذیر احمد نے اپنے شیخ و مرشد ڈاکٹر عبدالحئی عارفی قدس اللہ سرہ کی سرپرستی میں جون 1983ء کو رکھی۔ مولانا نذیر احمد رحمہ اللہ 1957ء میں جامعہ خیر المدارس ملتان سے فارغ التحصیل ہوئے۔ فراغت کے بعد یہیں پر مدرس لگ گئے۔ 1957ء سے اگست 1975ء تک جامعہ خیر المدارس ملتان میں تدریسی فرائض انجام دیتے رہے۔ اکتوبر 1975ء سے 1977ء تک ''دارالعلوم الاسلامیہ ٹنڈو اللہ یار'' میں تدریس فرمائی۔ اس کے بعد سے دارالعلوم فیصل آباد میں بخاری کا درس دیتے رہے۔ آپ کی وفات کے بعد جولائی 2007ء میں ان کے بڑے صاحبزادے مولانا محمد طیب مہتمم بنے۔ رپورٹ کے مطابق سن تاسیس سے 2000ء تک 1485 طلبہ عالم فاضل بنے۔ 1305 طالبات و طلبہ حافظ قرآن ہوئے۔ اس وقت جامعہ ہذا میں درج ذیل شعبہ جات ہیں: درس نظامی عالم کورس،

شعبۂ تحفیظ القرآن، شعبہ افتاء، مرکز الاقتصاد الاسلامی، شعبۂ تحقیق وتصنیف، شعبۂ دعوت وارشاد، عارفی میڈیکل سینٹر اور شعبۂ تخصص فی الافتاء۔ مولانا نذیر احمد رحمہ اللہ کی للّٰہیت اور خلوص نیت کا نتیجہ ہے جامعہ ہذا نے بہت ہی قلیل مدت میں ترقی کی اور یہاں سے ہزاروں طلبہ عالم فاضل اور حافظ قرآن ہو کر فارغ ہوئے اور ہو رہے ہیں۔

''مدرسہ عربیہ مظہر العلوم، کھڈہ، کراچی''۔اس کے بانی مولانا محمد عبداللہ ہیں۔سن تاسیس 1884ء ہے۔اس کو بام عروج تک پہنچانے والے مولانا محمد صادقؒ ہیں۔یہاں سے سینکڑوں علماء فارغ التحصیل ہوئے۔جامعہ کی لائبریری میں نایاب مخطوطات کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے۔اس مدرسے کی سند سعودی حکومت کی وزارت تعلیم نے ''مدینہ یونیورسٹی'' سے اعلیٰ تعلیم کے لیے منظور کی ہوئی ہے۔ مدرسہ کے موجودہ صدر مولانا محمد اسحاق بن مولانا حافظ محمد اسماعیل اور مہتمم مولانا محمود حسن ہیں۔اس کی خاص بات یہ ہے کی یہ قدیم ادارہ ہے اور اس کے معاینہ کنندگان بے شمار اکابر ہیں۔جن ممتاز علما واکابرین نے اس مدرسے کا معائنہ کیا اور تاثرات رقم کیے وہ جامعہ کی کتاب ''کتاب المعائنہ'' میں ثبت ہیں۔ہم یہاں برائے نمونہ چند نام پیش کر رہے ہیں: شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ۔ مولانا عبیداللہ سندھیؒ۔ مولانا سید حسین احمد مدنیؒ۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ۔ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاریؒ۔ مولانا محمد علی جوہرؒ۔ مولانا آزاد سبحانیؒ۔ مولانا ظفر علی خانؒ۔ مولانا احمد علی لاہوریؒ۔ مولانا محمد اشرف راندھیریؒ۔ محمد علی علوبہ پاشا سابق وزیر مصرؒ۔ محمد حنیف الحسینی عبدالوہاب سفیر مصرؒ۔ عبدالحمیدؒ خطیب سعودی عرب۔ محمد شیخ عبداللطیف آل محمودؒ۔ محمد بشیر ابراہیمی الجزائریؒ۔ امجد الزہاوی العراقؒ۔ محمد محمود الصوافؒ۔ احمد الاحمد محمد امین المصریؒ۔ عبدالحمید ہاشمیؒ۔ سعید مبارک الصوریؒ۔ مولانا شمس الحق افغانیؒ۔ صالح اوزجانؒ مدیر الہلال ترکی وسفیر نائیجیریا۔ الحاج عبدالقادر گنگوتا۔ سید حامد ابراہیم شحاتہؒ نمائندہ وزارت اوقاف متحدہ عرب جمہوریہ۔ السید محمود عبدالحکیم القاری باذاعۃ الجمہوریۃ العربیۃ المتحدہ۔ مولانا یوسف داؤد صاحب مفتی اعظم برما۔ سید الطاف علی بریلویؒ و دیگر حضرات میرین ایجوکیشن کمیٹی، کے ایم سی، کراچی۔ جناب استاد محمد یحییٰ بلوؒ حلب فرافرہ شام۔ محمد رسان عثمان لطیفؒ سیکرٹری انجمن جماعت المسلمین

پرتگال افریقہ۔ الحاج سید امین الحسینیؒ مفتی اعظم فلسطین۔ پیر محمد صادق مجددیؒ۔ سید محمد احمد الشبلیؒ سفیر سعودی عرب۔ مولانا عبدالحلیم صدیقیؒ۔ مولانا محمد یوسف دہلویؒ۔ مولانا سعید احمد اکبرآبادیؒ۔ حافظ اسماعیل زیرترکیؒ۔ حافظ عبدالرحمنؒ ترکی علماء استنبول۔ مولانا مفتی محمودؒ۔ مولانا غلام غوث ہزارویؒ۔ مولانا اسعد مدنیؒ۔ اور دیگر سیکڑوں ملکی اور غیر ملکی ممتاز علماء، اکابر اور معزز ترین شخصیات کے تاثرات درج ہیں۔

''جامعہ اشرفیہ، سکھر''۔ اس کے بانی حضرت مولانا محمد احمد تھانویؒ ہیں۔ آپ کی فراغت مظاہر علوم سہارنپور سے ہوئی البتہ فنون کی کتابیں دارالعلوم دیوبند میں پڑھیں۔ خلافت حضرت حکیم الامت تھانویؒ سے ملی ہے۔ آپ 1948ء میں ہجرت کر کے پاکستان آئے۔ اور پھر 1955ء میں جامعہ اشرفیہ سکھر کی بنیاد رکھی۔ جامعہ کا افتتاح حکیم الاسلام قاری مولانا محمد طیب صاحبؒ نے کیا۔ اس جامعہ میں دورۂ حدیث تک تعلیم ہوتی ہے۔ یہاں نشر واشاعت کا باقاعدہ ایک شعبہ قائم ہے، جس کے تحت درجنوں کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ ان میں سے چند یہ ہیں: درسِ صلوٰۃ، مرتبہ مولانا محمد احمد تھانویؒ۔ تحفہ عید قربان۔ احکامِ زکوٰۃ۔ شہادت عظمیٰ۔ سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ۔ تحفۂ رمضان المبارک۔ تذکرہ مشائخ سندھ مؤلفہ ڈاکٹر حق نواز اعوان، اس میں 200 سے زائد سندھی مشائخ کا تذکرہ ہے۔ بانی جامعہ کے انتقال کے بعد حضرتؒ کے صاحبزادے مولانا محمد اسعد تھانوی صاحب مہتمم ہیں۔ ان کی نگرانی میں ''جامعہ اشرفیہ سکھر'' تیزی سے ترقی کر رہا ہے۔ اس مدرسے کی وجہ سے سندھ میں جہالت کے بادل چھٹ رہے ہیں۔

''جامعہ بنوریہ، سائٹ ایریا، کراچی''۔ یہ ایک معیاری اور ممتاز دینی ادارہ ہے۔ اس کے بانی اور مہتمم مفتی محمد نعیم ہیں۔ آپ کے والد قاری عبدالحلیمؒ تھے۔ آپ کی سن ولادت اگست 1958 ہے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم ''دارالعلوم نانک واڑہ'' میں حاصل کی۔ 1979ء میں جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن سے فارغ التحصیل ہوئے۔ فراغت کے بعد اپنے مادر علمی میں درجات علیا کی کتابوں کی عمدہ تدریس کی۔ 1981ء میں اسٹار کالونی کراچی میں حفظ وناظرہ کے ایک مدرسے کا آغاز کیا، جبکہ 1978ء کو ''جامعہ بنوریہ سائٹ ایریا کراچی'' کی بنیاد رکھی۔ اس

ادارے کی نسبت مولانا محمد یوسف بنوریؒ کی طرف ہے۔ اس کا رقبہ بارہ ایکڑ ہے۔ ذیلی تعلیمی اداروں کی تعداد دس ہے۔ اساتذہ و دیگر ملازمین کی تعداد 155 ہے۔ جامعہ کی عمارتوں کے نام اکابرین و سلف صالحین کے نام پر رکھے گئے۔ بانیٔ جامعہ نے 1990ء میں یہاں دورۂ حدیث کا افتتاح کیا۔ جامعہ بنوریہ میں شروع سے تخصص فی الافتاء تک تعلیم ہوتی ہے۔ بیرون ملک کے طلبہ بھی کثیر تعداد میں زیرِ تعلیم ہیں۔ پانچ ہزار کے لگ بھگ طلبہ وطالبات رہائش پذیر ہیں۔ 2001ء کے بعد یہاں پر کئی جدید شعبے بھی قائم کیے گئے ہیں۔ مفتی محمد نعیم صاحب کی نگرانی اور سرپرستی میں یہ ادارہ خوب ترقی کر رہا ہے۔

''جامعہ حقانیہ، ساہیوال، سرگودھا''۔ جامعہ حقانیہ کے بانی مفتی سید عبدالکریم گمتھلویؒ ہیں۔ آپ جون 1897ء میں ہندوستان کے علاقے ''گنگھیڑی ضلع کرنال'' میں پیدا ہوئے۔ 1920ء میں مظاہر علوم سہارنپور سے فارغ التحصیل ہوئے۔ خلافت حضرت حکیم الامت تھانویؒ سے ملی ہے۔ آپ نے 1941ء ضلع کرنال میں ایک ادارہ قائم فرمایا، جس کا نام حضرت حکیم الامت تھانویؒ نے شیخ عبدالحق ردولویؒ کی طرف نسبت کرتے ہوئے ''مدرسہ حقانیہ'' رکھا۔ اسی مدرسہ میں مولانا مفتی عبدالشکور ترمذیؒ نے ابتدائی اور وسطانی تعلیم حاصل کی۔ قیام پاکستان کے بعد پاکستان تشریف لائے اور ساہیوال میں رہائش پذیر ہوگئے۔ آپ 8 رمئی 1949ء میں وفات پاگئے۔ وفات کے بعد آپ کے صاحبزادے مفتی سید عبدالشکور ترمذیؒ نے جامعہ حقانیہ ساہیوال سرگودھا کا نظم ونسق سنبھالا۔ ''جامعہ حقانیہ ساہیوال سرگودھا'' دراصل اس ''مدرسہ حقانیہ ضلع کرنال'' کا تسلسل اور کڑی ہے جس کی بنیاد مفتی عبدالکریم گمتھلویؒ نے رکھی تھی۔ یہ ادارہ 1958ء میں رجسٹرڈ ہوا۔ اس کے بعد وفاق المدارس العربیہ سے ملحق بھی ہوگیا۔ اس وقت یہاں پر اعدادیہ سے موقوف علیہ و تخصص تک کے درجات ہیں اور معیاری تعلیم دی جاتی ہے۔ یہاں پر شعبۂ تصنیف وتالیف بھی قائم ہے، جس کے تحت بانیٔ جامعہ کی تصنیفات وتالیفات اور مقالات شائع ہوتے ہیں۔ سید عبدالشکور ترمذیؒ کے انتقال کے بعد آپ کے بیٹے مفتی سید عبدالقدوس ترمذی جامعہ کے مہتمم بنے اور اب تک یعنی آخر 2010ء تک اس عہدے پر فائز ہیں۔ ''جامعہ حقانیہ، ساہیوال

سرگودھا" کی شاخوں کی تعداد 9 ہے۔ اس میں مجموعی طور پر سیکڑوں طلبہ وطالبات تعلیم حاصل کررہے ہیں۔

"جامعہ عربیہ احسن العلوم، گلشن اقبال، کراچی"۔ اس کے بانی مفتی زرولی خان صاحب ہیں۔ بانیٔ جامعہ کے والد کا نام محمد عاقل ہے۔ مفتی زرولی خان 1953ء میں صوبہ خیبر پختونخوا کے علاقے "جہانگیرہ" میں پیدا ہوئے۔ 1977ء میں جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی سے فارغ التحصیل ہوئے۔ 1978ء میں گلشن اقبال میں "جامعہ عربیہ احسن العلوم" کی بنیاد رکھی۔ اس وقت تک آپ خود مہتمم اور شیخ الحدیث ہیں۔ یہاں پر ابتدائی درجات سے لے کر دورۂ حدیث تک تعلیم دی جارہی ہے۔ اس کے قدیم اساتذہ میں سے چند کے نام یہ ہیں: مولانا سید صباح حسنؒ۔ مولانا یٰسین۔ مولانا عنایت اللہ۔ مولانا محمد زبیر احمد۔ مولانا لعل مرجان۔ مولانا فضل ربی۔ مولانا عبدالشکور صاحب۔ مولانا سہیل احمد۔ اس مدرسے کے تحت مدرسۃ البنات بھی کام کررہا ہے۔

"جامعہ عربیہ احسن العلوم گلشن اقبال کراچی" کی کئی شاخیں بھی ہیں۔

"جامعہ فریدیہ، ای سیون، اسلام آباد"۔ اس کے بانی مولانا عبداللہ شہید تھے۔ مولانا عبداللہؒ لال مسجد اسلام آباد کے امام وخطیب تھے۔ انہوں نے 1970ء کو لال مسجد میں طلبہ و طالبات کی تعلیم کا آغاز کیا۔ تعداد بڑھی تو 1973ء میں جامعہ فریدیہ کے نام سے یہ مدرسہ E/7 اسلام آباد منتقل کردیا، جہاں بعد میں دورۂ حدیث تک کی تعلیم جاری ہوگئی۔ تین ہزار سے زائد طلبہ ہوتے ہیں۔ 2008ء کی ایک رپورٹ کے مطابق اس کی آٹھ شاخیں ہیں۔ (1) جامعۃ العلوم الفریدیہ E/7 اسلام آباد۔ (2) مدرسہ زید بن ثابتؓ، مرکزی جامع لال مسجد اسلام آباد۔ (3) مدرسہ رحمۃ للعالمین PWD لوہی بھیر، اسلام آباد۔ (4) مدرسہ سیدنا عثمان بن عفانؓ چک شہزاد، اسلام آباد۔ (5) مدرسہ سیدنا طلحہ بن عبیداللہ۔ سیری چوک بہارہ کہو اسلام آباد۔ (6) مدرسہ معاذ بن جبلؓ بہارہ کہو اسلام آباد۔ (7) مدرسہ سیدنا صدیق اکبرؓ، حسین روڈ، بنی گالہ اسلام آباد۔ (8) مدرسہ سیدنا عمرؓ، مسجد مزمل، گلی نمبر 94، نزد پرانا قبرستان یاجج کالونی G-11/3 اسلام آباد۔ لال مسجد سے متصل ایک کنال زمین پر مولانا عبداللہؒ نے 1992ء کو جامعہ حفصہ للبنات کی ابتدا کی۔

اس کی دس شاخیں ہیں۔ (1) جامعہ سیدہ حفصہؓ G/6 اسلام آباد۔ (2) جامعہ سیدہ سمیہ، الفلاح مسجد G-7/3-2 اسلام آباد۔ (3) مدرسہ سیدہ ام کلثوم سیری چوک بہارہ کہو، اسلام آباد۔ (4) مدرسہ سیدہ سودہؓ، محلہ عثمانیہ نئی آبادی، بہارہ کہو اسلام آباد۔ (5) مدرسہ سیدہ رقیہؓ (ویلی روڈ) نئی گالہ، اسلام آباد۔ (6) مدرسہ ماریہ قبطیہؓ مکان نمبر 150، چک شہزاد اسلام آباد۔ (7) مدرسہ سیدہ خولہ بنت ازورؓ گولڑہ اسلام آباد۔ (8) مدرسہ سیدہ ہاجرہؓ (نئی آبادی) ترامڑی اسلام آباد۔ (9) مدرسہ فاطمہ الزہراؓ 1-9/4 مکان نمبر 192 گلی نمبر 38 اسلام آباد۔ (10) مدرسہ سیدہ خدیجہؓ الکبریٰ، متصل مسجد مجددیہ F-8/2 پارک روڈ اسلام آباد۔ ان دونوں اداروں اور شاخوں میں مجموعی طور پر دس ہزار طالبات وطلبہ پڑھتے ہیں۔ 17 اکتوبر 1998ء میں مولانا عبداللہ شہید کردیے گئے۔ اس کے بعد مولانا عبداللہؒ کے صاحبزادے مولانا عبدالعزیز اور علامہ عبدالرشید غازی لال مسجد، جامعہ حفصہ اور جامعہ فریدیہ کے ذمہ دار بن گئے۔ مولانا عبدالعزیز نے 1984ء کو جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی سے فراغت پائی۔ 1998ء سے 9 جولائی 2007ء تک لال مسجد کے خطیب رہے، جبکہ علامہ غازی .B.A کے بعد 1988ء میں قائداعظم یونیورسٹی سے ایم اے کیا اور 1989ء میں یونیسکو کے تحت منسٹری آف ایجوکیشن میں 18 ویں گریڈ میں تعینات ہوئے۔ 1998ء میں لال مسجد کی انتظامیہ میں شامل ہوئے اور 10 جولائی 2007ء کو آپریشن سائلنس کے دوران مالک حقیقی سے جاملے۔

''جامعہ مظاہر العلوم، لطیف آباد، حیدر آباد''۔ اس ادارے کی بنیاد علامہ ظفر احمد عثمانیؒ اور مفتی محمد شفیعؒ نے رکھی تھی، لیکن اس کی ترقی اس وقت شروع ہوئی جب مفتی محمد وجیہ ''دار العلوم الاسلامیہ ٹنڈوالٰہ یار'' سے مستقل طور پر یہاں آگئے۔ مفتی محمد وجیہ اگست 1924ء میں بھارت کی ریاست ''رامپور'' میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم یہیں حاصل کی۔ مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور سے 1943ء میں فراغت حاصل کی۔ 1949ء میں مفتاح العلوم جلال آباد میں تدریس کی۔ 1954ء میں ''دار العلوم الاسلامیہ ٹنڈوالٰہ یار'' میں مدرس مقرر ہوئے۔ 1993ء تک اسی مدرسہ میں استاذ حدیث رہے۔ 1974ء سے بخاری شریف اور ترمذی شریف کا درس دیا۔ 1992ء سے وفات

21 مئی 2000ء تک ''مدرسہ مظاہر العلوم لطیف آباد'' کے مہتمم رہے۔ مفتی صاحبؒ کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے مفتی محمد فصیح صاحب مہتمم بنے جو دارالعلوم کراچی کے فاضل ہیں۔ بانی جامعہ اور موجودہ مہتمم کی للّٰہیت اور بے لوث خدمت کا نتیجہ ہے۔ اس ادارے نے بہت کم مدت میں ترقی کی ہے۔ حیدرآباد کا یہ دینی ادارہ عرصۂ دراز سے تشنگان علوم کی پیاس بجھا رہا ہے۔ اس وقت ''جامعہ مظاہر العلوم لطیف آباد، حیدرآباد'' میں شعبہ حفظ اور درس نظامی کے علاوہ دارالافتاء بھی قائم ہو چکا ہے۔

''جامعہ عثمانیہ، نوتھیہ روڈ، پشاور''۔ اس کے بانی مفتی غلام الرحمٰن صاحب ہیں۔ سن تاسیس 1992ء ہے۔ بانی جامعہ جامعہ حقانیہ اکوڑہ خٹک کے فاضل ہیں۔ نہایت باصلاحیت عالم دین اور قابل رشک سیاست دان ہیں۔ یہاں کے سرپرست اعلیٰ حضرت مولانا حکیم لطف الرحمٰن بن مولانا غلام حبیب تھے جو 84 سال کی عمر میں 25 ستمبر 2006ء میں وفات پا گئے تھے۔ ''جامعہ عثمانیہ نوتھیہ روڈ، پشاور'' کا تعلیمی معیار قابل رشک ہے۔ ابتدائی درجات سے لے کر دورۂ حدیث تک تعلیم ہے جبکہ 1996ء سے یہاں تخصص کے اسباق بھی ہو رہے ہیں۔

''جامعہ درویشیہ، مسلم سوسائٹی، کراچی''۔ اس کے بانی حضرت مولانا منھر شاہؒ تھے۔ سن تاسیس 1974ء ہے۔ 1986ء میں مسجد سے ملحق زمین خرید کر اس میں مدرسہ کی عمارت کھڑی کی گئی اور اس کا سنگ بنیاد مفتی ولی حسن ٹونکیؒ نے رکھا۔ جامعہ کا الحاق وفاق المدارس العربیہ پاکستان سے 29 اکتوبر 1989ء میں کیا گیا۔ اس کے موجودہ مہتمم مولانا لیاقت علی شاہ ہیں۔ اور شیخ الحدیث حضرت مولانا نور الہدیٰ صاحب ہیں۔ 2006ء سے دورۂ حدیث کے اسباق بھی ہو رہے ہیں۔

''معہد الخلیل الاسلامی، بہادرآباد، کراچی''۔ اس کے بانی حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب (خلیفہ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریاؒ) ہیں۔ سن تاسیس 1980ء ہے۔ بانی جامعہ مولانا محمد یحییٰ نے اپنے گھر کے ایک کمرے میں دو طالب علموں سے مذکورہ جامعہ کی بنیاد ڈالی جو آگے جا کر ایک معیاری اور قابل تقلید ادارہ بن گیا ہے۔ یہاں کے شیخ الحدیث بانی جامعہ کے صاحبزادے مولانا محمد یوسف ہیں، جو جامعہ ہی کے فاضل ہیں اور نہایت باصلاحیت ہیں۔ 2008ء کی ایک

رپورٹ کے مطابق فارغ التحصیل حفاظ کی تعداد248۔ فارغ التحصیل علماء کی تعداد 226۔ اساتذہ وعملہ کی تعداد52۔ فارغ التحصیل عالمات کی تعداد 192 ہے۔ موجودہ طلبہ وطالبات کی تعداد 698 ہے۔ جامعہ کے ماتحت معہدالشیخ زکریا اور مرکز الامداد نامی شاخیں بھی ہیں۔ ''مکتبۃ الشیخ بہادرآباد، کراچی'' نامی مکتبہ اسی ادارے کے تحت چل رہا ہے جس کا مقصد شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریاؒ کی تالیفات وتصنیفات کو شائع کرنا ہے۔ ''معہدالخلیل الاسلامی بہادرآباد، کراچی'' کی متعدد شاخیں بھی ہیں۔ یہاں پر دورۂ حدیث سمیت دیگر شعبہ جات بھی ہیں۔ مدرسے کا تعلیمی نظم ونسق قابلِ رشک ہے۔

''مدرسۃ الحسنین، فیصل آباد''۔ یہ دسمبر 1999ء کو معرضِ وجود میں آیا۔ اس ادارے کے بانی مشہور ومعروف مبلغ مولانا طارق جمیل ہیں۔ جن کا دل ودماغ جہاں امت کے لیے تڑپتا تھا، وہیں مدارس دینیہ میں عربی ذوق وتکلم کے احیا اور فروغ کے لیے بھی بے کراں اور بے چین رہتا تھا۔ ہندوپاک کے طلبہ میں دم توڑتی عربیت اور اس سے بے اعتنائی ان کو پریشان اور ہر لحظہ فکرمند رکھتی تھی۔ یہ سوچ اور فکر اس مدرسہ کی بنیاد بنی۔ جہاں 5 جنوری 2000ء میں مولانا شبیر احمد مدنی نے پہلا سبق پڑھا کر اس نخلستان کی آبیاری شروع کی۔ اللہ کے فضل وکرم سے اب تک 168 علماء یہاں سے سندِ فراغت حاصل کر کے پوری دنیا کے مختلف حصوں میں دینِ عالی کی خدمت میں مشغول ہیں۔ 6 شاخوں سمیت اس ادارے میں 650 سے زائد طلبہ علم کی دولت سے مالا مال ہورہے ہیں۔ جہاں علوم وفنون میں ترقی کے ساتھ ساتھ مولانا طارق جمیل کی شخصیت سے براہ راست استفادہ کرنے کا ہر طالب علم کو موقع ملتا ہے۔ یہاں داخلہ صرف صفِ اول میں ہوتا ہے۔ جہاں نہ صرف اکثر اسباق عربی میں ہوتے ہیں بلکہ طلبہ روزمرّہ کی گفتگو بھی عربی میں کرتے ہیں۔

''جامعہ دارالقرآن، مسلم ٹاؤن، فیصل آباد''۔ اس کا سنگِ بنیاد 1990ء میں رکھا گیا۔ 1993ء میں یہاں باقاعدہ شعبۂ حفظ وگردان اور درسِ نظامی کا آغاز ہوا۔ اس کی ابتدا جامعہ ضیاء القرآن المعروف باغ والی مسجد ماڈل ٹاؤن میں 1973ء کو ہوئی۔ جگہ کی قلت اور تشنگانِ علم کی کثرت کے سبب اس نئے ادارے کا قیام 38 کنال اراضی پر معرض وجود میں آیا۔ استاذ

الاساتذہ، رکن شوریٰ عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت مولانا قاری محمد یٰسین جامعہ کے بانی ہیں۔ 5 ہزار طلبہ وطالبات کے اس جامعہ میں تحفیظ القرآن سے لے کر تخصص فی الافتاء تک تعلیم کا وسیع نظم ہے۔ جامعہ ہذا کی ملک وبیرون ملک 12 مستقل شاخیں بھی مصروفِ عمل ہیں۔ ملائشیا، انڈونیشیا اور تھائی لینڈ میں جامعہ کے قائم کردہ ادارے اس کے علاوہ ہیں۔ جامعہ کو ابتدا میں مجدد القراءت مولانا قاری رحیم بخش رحمہ اللہ کی مکمل و مسلسل سرپرستی حاصل رہی۔ بانی جامعہ، حضرت قاری رحیم بخش کے داماد اور سلسلہ قراء رحیمیہ کے سرخیل ہیں۔ جامعہ میں عصری تعلیم میٹرک سائنس مع کمپیوٹر لازمی نصاب ہے۔ یہ جامعہ شعبہ حفظ برائے طلبہ وطالبات اور شعبہ کتب برائے طالبات کے لیے مثالی نظم ونسق کے حوالے سے ملک بھر میں معروف ہے۔ اب تک فارغ التحصیل فضلا وفاضلات کی تعداد 10 ہزار سے متجاوز ہے۔

”مدرسہ دار العلوم حسینیہ، شہداد پور“۔ اس کا سنِ تاسیس 1951ء ہے۔ اس کا سنگ بنیاد مولانا احمد علی لاہوری رحمہ اللہ نے رکھا۔ اس کے بانی قاری رحمت اللہ تھے۔ 80 کی دہائی میں قاری رحمت اللہ وفات پا گئے تو اس کے مہتمم اور سرپرست مولانا عبدالعزیز مقرر ہوئے۔ ان کی وفات کے بعد حضرت مولانا محمد یوسف بہاولپوری مہتمم ہیں جبکہ نائب مہتمم اور شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سلیم صاحب ہیں۔ شعبۂ حفظ کے نگران اور ناظم اعلیٰ مولانا قاری عبدالرشید رحیمی ہیں۔ مدرسہ دار العلوم حسینیہ شہداد پور ”شعبہ حفظ القرآن“ کے لیے پاکستان بھر میں بڑا اور معیاری مدرسہ ہے۔ 1951ء سے 2010ء تک ہزاروں کی تعداد میں بچے قرآن حفظ کر چکے ہیں۔ اس میں شعبہ حفظ، شعبہ قراءت، سبعہ عشرہ، شعبہ درسِ نظامی، دارالافتاء اور فلاحی شعبے قائم ہیں۔ اساتذہ کی تعداد سو کے قریب ہے۔ 2009ء میں شعبہ حفظ میں طلبہ کی تعداد 1430 تھی۔ ”مدرسہ دار العلوم حسینیہ شہداد پور“ کے تحت مدرسۃ البنات بھی چل رہا ہے۔ اندرون سندھ کئی شاخیں بھی تعلیمی خدمات سرانجام دے رہی ہیں۔ یہ ادارہ دن بدن ترقی کر رہا ہے۔ اس کا تعلیمی معیار بلند سے بلند ہی ہو رہا ہے۔ یہ ادارہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کی شاندار پرشکوہ مسجد اپنے سحر میں گرفتار کر لیتی ہے۔ مسجد کے قدیم طرز کے فلک بوس مینار اور اس کے متصل دار الحدیث قابلِ دید ہیں۔

''جامعہ خالد بن ولید، بھنگی کالونی، ملتان روڈ، وہاڑی''۔ اس ادارے کی بنیاد 3 مارچ 1985ء میں حرم مکہ کے امام شیخ علی عبداللہ جابر رحمہ اللہ نے رکھی۔ اس مدرسے میں شعبہ حفظ، تجوید وقرأت، درس نظامی، دراسات دینیہ، مڈل سے بی اے تک عصری تعلیم اور دارالافتاء کا شعبہ قائم ہے۔ شارٹ کورسز میں عربی لینگویج، انگلش لینگویج، کمپیوٹر کورس اور سمر کیمپ وغیرہ شامل ہیں۔ مدرسہ خالد بن ولید کی آٹھ شاخیں ہیں۔ جامعہ عائشہ صدیقہ للبنات، جامعہ حسین بن علی، جامعہ حسن بن علی، مدرسہ عمار بن یاسر، مدرسہ مصعب بن عمیر، مدرسہ رحمانیہ اور مدرسہ فاطمہ الزہرا شامل ہیں۔ اس مدرسہ کا دورہ کرنے والوں میں مفتی نظام الدین شامزئی شہید، خواجہ خواجگان حضرت خان محمد رحمہ اللہ، سید نفیس الحسینی انور شاہ رحمہ اللہ، ڈاکٹر محمود احمد غازی رحمہ اللہ، مفتی محمد تقی عثمانی، مولانا عبدالمجید لدھیانوی، جناب عرفان صدیقی وغیرہ شامل ہیں۔ اس مدرسے کے موجودہ مہتمم اور شیخ الحدیث مولانا ظفر احمد قاسم ہیں۔ جامعہ خالد بن ولید وہاڑی کی مسجد اور اس سے ملحقہ عمارت دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

''مدرسہ دارالعلوم عزیزیہ حسینیہ، روڈ، سندھ''۔ اس کا سنِ تاسیس 1992ء ہے۔ اس کے بانی قاری عبدالرشید تھے۔ اندرون سندھ یہ شعبہ حفظ کا جدید، ماڈل اور معیاری مدرسہ ہے۔ اس وقت بھی ایک ہزار کے قریب طلبہ حفظ اور ناظرہ کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ شاندار اور پرشکوہ عمارت ہے۔ اس کے بانی قاری عبدالرشید صاحب کو 16 مئی 2006ء میں مدرسے کے قریب ہی دہشت گردوں نے فائرنگ کر کے شہید کر ڈالا تھا۔ اس کے بعد اس وقت اس کے مہتمم مولانا محمد اشرف ہیں۔ اس مدرسے میں شعبہ حفظ کے علاوہ درسِ نظامی بھی درجہ سادسہ تک ہے۔ یہاں پر طلبہ کی خصوصی تربیت کی جاتی ہے۔ اس کا نظم وضبط اور اندازِ تعلیم قابلِ تقلید اور مثالی ہے۔

''جامعہ صدیق اکبرؓ، ٹنڈوالہ یار''۔ اس کا سنگِ بنیاد 1992ء میں حضرت مفتی محمد وجیہہ رحمہ اللہ کے دست مبارک سے رکھا گیا۔ اس کے بانی مولانا مفتی محمد عرفان اور مولانا محمد راشد محبوب ہیں۔ اس مدرسے کی انفرادیت یہ ہے گزشتہ 18 سال سے اصلاحی وتبلیغی خدمات بھی انجام دے رہا ہے۔ جامعہ کو وفاق المدارس کے تحت منعقدہ سالانہ امتحانات میں ملکی سطح پر پوزیشن حاصل

کرنے کا اعزاز بھی حاصل ہوتا رہا ہے۔ جامعہ کا سندھ یونیورسٹی سے بھی الحاق ہے۔ جس کی وجہ سے دونوں اداروں کی ایم اے اور بی اے کی اسناد کا معادلہ ہوتا ہے۔ اس میں کئی شعبے قائم ہیں۔ شعبہ حفظ وناظرہ، شعبہ درس نظامی۔ اس وقت یہاں 1153 طلبہ وطالبات زیر تعلیم ہیں، جبکہ اساتذہ کی تعداد 51 ہے۔ گزشتہ 6 سال سے قرات سبعہ عشرہ کا کورس کرایا جارہا ہے۔ تعلیمی خدمات کے علاوہ مسلمانوں کو درپیش مسائل کا شرعی حل بتانے کے لیے دارالافتاء موجود ہے۔ جس میں تین مفتیان کرام مسلمانوں کو شرعی مسائل میں رہنمائی اور فتویٰ نویسی کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ شعبۃ الامداد 8 اکتوبر 2005ء کے تباہ کن زلزلے کے بعد قائم کیا گیا تھا۔ اس کے ذریعے اہلِ خیر عوام نے اپنے زلزلہ زدہ بھائیوں کی امداد کی اور گزشتہ سے پیوستہ سال سوات، مالاکنڈ سے نقل مکانی کرنے والے متاثرین کو ساز وسامان اور نقد رقم کے ذریعے امداد بہم پہنچائی۔ شعبہ کمپیوٹر کے تحت درس نظامی کے طلبہ کو کمپیوٹر کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اب تک جامعہ سے فارغ ہونے والے طلبہ وطالبات کی تعداد 534 ہے۔ اساتذہ کرام کے علاوہ جامعہ کا نظم ونسق سنبھالنے والا عملہ 25 افراد پر مشتمل ہے۔ جامعہ کی آمدن اور خرچ کا ہر سال باقاعدہ سے آڈٹ ہوتا ہے۔

”جامعہ دارالعلوم، نواب شاہ۔“ یہ جامعہ 15 شعبان 1420ھ مطابق 2000ء کو مفتی محمد رفیع عثمانی اور مفتی محمد تقی عثمانی کے مشورے سے معرضِ وجود میں آیا۔ اس کے بانی مولانا مفتی محمد اکمل صاحب بن عبدالحئی صاحب ہیں۔ سنگِ بنیاد مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کے حکم پر مفتی عبدالرؤف سکھروی صاحب نے رکھا۔ بنین وبنات میں متوسطہ تا دورۃ الحدیث میں تعلیم جاری ہے۔ حفظ وناظرہ، تجوید قرات کے درجات بھی ہیں۔ طلبہ کی تعداد 450 ہے، جس میں 300 مسافر طلبہ ہیں۔ وفاق المدارس سے ملحق ہے۔ اساتذہ کرام مع عملہ کی تعداد 34 ہے۔ حضرت مفتی تقی عثمانی، مولانا سلیم اللہ خان صاحب، مولانا عبدالحفیظ مکی اور مفتی عبدالرؤف سکھروی اور دیگر اکابرین کی آمد کا شرف حاصل ہے۔

”جامعہ محمدیہ عربیہ، نواب شاہ۔“ 11 فروری 1966ء کو قاری فتح محمد صاحب پانی پتی رحمہ اللہ کے حکم پر قائم ہوا۔ حضرت قاری صاحب تا حیات مدرسے کی سرپرستی فرماتے رہے۔ اس کے بعد حضرت

مولانا سبحان محمود صاحب شیخ الحدیث دارالعلوم کراچی 10 سال سرپرستی فرماتے رہے۔ حضرت قاری فتح محمد صاحب کے حکم پر مدرسہ کے انتظامی امور صوفی عطاء اللہ صاحب سرانجام دیتے رہے۔ حضرت صوفی صاحب 26 صفر 1420ھ کو انتقال کر گئے۔ اس کے بعد حضرت صوفی صاحب کے صاحبزادے قاری محمد اسماعیل صاحب کو اہتمام حوالے کیا گیا۔ تا حال قاری محمد اسماعیل صاحب ہی مہتمم ہیں۔ مدرسہ میں شعبہ حفظ و ناظرہ اور متوسطہ تا دورۃ الحدیث تک تعلیم جاری ہے۔

''جامعہ حمادیہ، شاہ فیصل کالونی، کراچی''۔ اس کے بانی مولانا عبدالواحد رحمہ اللہ ہیں۔ مولانا عبدالواحد 1918ء میں پیدا ہوئے۔ اور 1954ء میں ''جامعہ فتحیہ لاہور'' سے فارغ التحصیل ہوئے۔ آپ خلیفہ مجاز ہیں مولانا شیخ حماد اللہ ہالیجوی ؒ کے۔ فراغت کے بعد 1956ء میں کراچی میں ''جامعہ حمادیہ'' کے نام سے مدرسہ بنایا۔ بانی جامعہ نے جامعہ کی نسبت اپنے شیخ و مرشد شیخ حماد اللہ ہالیجوی ؒ کی طرف کی ہے۔ جامعہ میں 1987 میں دورۂ حدیث کا آغاز ہوا۔ آپ اس وقت سے تا وفات 28/دسمبر 2008ء تک یہاں بخاری شریف کا درس دیتے رہے۔ آپ کے بعد مولانا ذوالفقار صاحب شیخ الحدیث بنے۔ ویسے تو یہاں سیکڑوں علما نے فیض رسانی کی اور کر رہے ہیں، لیکن ان میں شیخ الحدیث مولانا غلام محمد عباسی ؒ کا نام نمایاں ہے۔ اس وقت یہاں پر تمام درجات موجود ہیں۔ ''جامعہ حمادیہ شاہ فیصل کالونی، کراچی'' کے شعبہ تصنیف سے درجنوں کتابیں اور رسالے شائع ہوئے ہیں۔

''جامعہ عربیہ مخزن العلوم، خانپور''۔ اس کے بانی حضرت مولانا محمد عبداللہ درخواستی ؒ ہیں۔ آپ جون 1895ء میں پیدا ہوئے۔ 18 سال کی عمر میں مولانا غلام محمد دین پوری ؒ سے حدیث پڑھ کر فارغ التحصیل ہوئے۔ خلافت شیخ میاں عبدالہادی ؒ سے ملی۔ مولانا محمد عبداللہ درخواستی ؒ نے اس ادارے کی بنیاد 1935ء کو اپنے گاؤں ''درخواست'' میں رکھی پھر 1946ء میں اسے شاہی مسجد عیدگاہ خانپور منتقل فرمایا جہاں اب تک قائم و دائم ہے۔ 1960ء میں یہاں دورۂ حدیث کا افتتاح ہوا۔ یہ ادارہ قدیم اداروں میں شمار ہوتا ہے۔ یہاں سے فارغ التحصیل علماء کی تعداد ہزاروں میں ہے۔

"جامعہ انوار القرآن، آدم ٹاؤن، نارتھ کراچی"۔ اس کے بانی حافظ الحدیث مولانا محمد عبداللہ درخواستی ہیں۔ سنِ تاسیس 9/ مارچ 1981ء ہے۔ 28/ اگست 1994ء میں بانی جامعہ کا انتقال ہوا۔ اس وقت سے اب 2010ء تک بانیٔ جامعہ کے صاحبزادے مولانا فداء الرحمٰن درخواستی مہتمم ہیں۔ یہاں کے شیخ الحدیث مولانا انیس الرحمٰن درخواستیؒ تھے جن کو 1993 میں بے دردی سے شہید کر دیا گیا۔ اس میں دورۂ حدیث تک تمام درجات کی تعلیم دی جاتی ہے۔

"مدرسہ دار الہدیٰ، ٹھیڑی، خیر پور میرس"۔ یہ سندھ کا ایک مشہور قدیم دینی ادارہ ہے۔ اس کا سنِ تاسیس 1911ء ہے۔ اس کے بانیوں میں مولانا قاضی حبیب اللہ اور مولانا عزیز اللہؒ شامل ہیں۔ پہلے مفتی غلام قادر میمن یہاں کے مفتی رہے جبکہ مولانا عزیز اللہؒ شیخ الحدیث رہے۔ مفتی رشید احمد لدھیانویؒ بھی 1950ء سے 1956ء تک یہاں کے مفتی اور شیخ الحدیث رہے۔ اس وقت یہ ادارہ خستہ حال ہے۔ اس میں طلبہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔

"مدرسہ دار الرشاد، پیر جھنڈا، سندھ"۔ پیر جھنڈو، تحصیل ہالا ضلع حیدر آباد سندھ کا ایک چھوٹا سا گاؤں ہے جسے پیر محمد یاسین شاہ راشدی جھنڈے نے آباد کیا تھا۔ راشدی خاندان کی نسبت سائیں محمد راشد روضہ دھنی کی طرف ہے۔ یہاں ایک بزرگ سید ابو تراب رشد اللہ صاحب العلم رہائش پذیر تھے، جن کی دعوت پر امام انقلاب مولانا عبید اللہ سندھیؒ پیر جھنڈا تشریف لائے اور 1901ء میں ایک دینی ادارے کی بنیاد رکھی جو آگے جا کر "مدرسہ دار الرشاد پیر جھنڈا" کے نام سے مشہور ہوا۔ اس ادارے سے شیخ التفسیر مولانا احمد علی لاہوریؒ سمیت بڑے بڑے علماء فارغ التحصیل ہوئے۔

"جامعہ امام ابو حنیفہ، مکہ مسجد، کراچی"۔ یہ ادارہ آدم جی نگر، ٹیپو سلطان روڈ نزد محمد علی سوسائٹی کراچی میں واقع ہے۔ اس کا سنِ تاسیس 1991ء ہے۔ اس کے بانی مولانا محمد یوسف کشمیری ہیں جو 1968ء سے 1991ء تک جامعہ فاروقیہ شاہ فیصل کالونی کراچی میں تدریس فرماتے رہے۔ "جامعہ امام ابو حنیفہ، مکہ مسجد، کراچی" نے کم مدت میں قابلِ رشک علمی ترقی کی ہے۔ شروع سے دورۂ حدیث تک پڑھائی ہے۔

"جامعہ منظور الاسلامیہ، لاہور"۔ اس کے بانی حضرت مولانا پیر محمد سیف اللہ خالد نقشبندی

ہیں اور سرپرست مولانا حافظ منظور احمد خطیب بلدیہ لاہور چھاؤنی ہیں۔ سن تاسیس 7/جون 1986ء ہے۔

''جامعہ اسلامیہ، کلفٹن، کراچی''۔ اس کے بانی مفتی محی الدین صاحب ہیں۔ سن تاسیس 1977ء ہے۔ یہاں شروع سے تخصص فی الافتاء تک کی تعلیم ہوتی ہے۔ ایک ہزار کے لگ بھگ طلبہ ہوتے ہیں۔ ملک بھر میں جامعہ ہذا کے ماتحت پانچ شاخیں بھی چل رہی ہیں۔

''معہد عثمان بن عفانؓ، کراچی''۔ یہ ادارہ لانڈھی کراچی میں واقع ہے۔ سن تاسیس 1995ء ہے۔ اس کے بانی مولانا نورالبشر فاضل دارالعلوم کراچی ہیں۔ ادارہ کے سرپرست استاد المحدثین مولانا سلیم اللہ خان اور استاذ الحدیث مفتی عبداللہ برمی صاحب ہیں۔ موقوف علیہ تک کے درجات ہیں۔ اس ادارے نے قلیل مدت میں بڑی ترقی کی اور مثالی تعلیم وتربیت کا نمونہ پیش کیا۔

''دارالعلوم تعلیم القرآن، ہری پور''۔ یہ ادارہ بانڈہ منیر خان تحصیل وضلع ہری پور میں واقع ہے۔ اس کے بانی مولانا محمد عرفان ہیں جو مولانا عبدالغفور عباسی مدنیؒ کے مریدین میں شامل ہیں۔ حضرتؒ نے 1960ء میں پٹیل پاڑہ کراچی میں ناظرہ قرآن کریم کا ایک ادارہ قائم کیا۔ پھر 1993ء میں دارالعلوم تعلیم القرآن کے نام سے ہری پور میں ایک ادارہ قائم کیا۔ آج کل اس کے مہتمم بانیٔ جامعہ کے صاحبزادے مولانا محمد عمران صاحب ہیں۔ مدرسۃ البنات میں دورۂ حدیث تک تعلیم ہوتی ہے۔

''اشرف العلوم بیت المکرّم، کراچی''۔ یہ ادارہ کورنگی کراچی میں واقع ہے۔ سن تاسیس جولائی 1987ء ہے۔ اس کے بانی دارالعلوم کراچی کے سابق شیخ الحدیث مولانا سحبان محمود رحمہ اللہ ہیں۔ اس ادارے کو ترقی دینے والے حضرت مفتی محمد نعمت اللہ بنگلہ دیشی ہیں۔ اس وقت جامعہ کے مہتمم بانیٔ جامعہ کے صاحبزادے مولانا طاہر محمود ہیں۔ ابتدا سے موقوف علیہ تک کے درجات ہیں۔

''جامعہ رشیدیہ، ساہیوال''۔ اس کا سن تاسیس 1901ء ہے۔ اس قدیم ادارے کے بانی مولانا فاضل حبیب اللہ رشیدیؒ ہیں۔ یہ دارالعلوم دیوبند کے فاضل اور مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے

شاگرد تھے۔ بانی جامعہ کے بڑے بھائی مولانا عبداللہ رائے پوری یہاں کے شیخ الحدیث تھے، جو عرصۂ دراز تک فیض پہنچاتے رہے۔ یہ ادارہ شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے شاگرد مولانا مفتی فقیر اللہ کی یاد میں قائم کیا گیا تھا۔ جامعہ ہذا کے موجودہ مہتمم مولانا کلیم اللہ رشیدی اور ناظم قاری سعید ہیں۔

"مدرسہ قاسم العلوم وانجمن خدام الدین، لاہور"۔ اس کے بانی مولانا احمد علی لاہوری رحمہ اللہ ہیں۔ تنظیم "انجمن خدام الدین" کا قیام 1922ء میں اور "مدرسہ قاسم العلوم" کا قیام 1924ء کو عمل میں آیا۔ اس کے سرپرستوں میں علامہ سید انور شاہ کشمیریؒ، مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اور مولانا عبیداللہ سندھیؒ شامل ہیں۔ بانئ جامعہ حضرت لاہوریؒ کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے مولانا عبیداللہ انور مہتمم بنے۔ انہوں نے ادارے کو خوب ترقی دی۔ 1985ء میں ان کا انتقال ہوا۔ اس کے بعد ان کے صاحبزادے مولانا محمد اجمل قادری سربراہ مقرر ہوئے۔ اس مدرسہ و تنظیم نے لازوال خدمات سرانجام دیں۔ بانئ جامعہ نے 1917ء میں جس مخصوص انداز میں درس قرآن کا اجرا کیا تھا۔ اس کا سلسلہ تا وفات جاری رہا اور لاکھوں تشنگان علوم نے علمی پیاس بجھائی۔

"مدرسہ تعلیم القرآن، راجہ بازار، راولپنڈی"۔ اس کا سن تاسیس 1941ء ہے۔ اس کے بانی شیخ القرآن مولانا غلام اللہ خان تھے۔ مولانا غلام اللہ خانؒ، حدیث میں مولانا سید انور شاہ کشمیریؒ کے شاگرد ہیں اور مولانا حسین علیؒ سے بھی استفادہ کیا ہے۔ مفتی عبدالشکور ترمذیؒ نے "المہند علی المفند کے عقائد کی حیثیت" میں لکھا ہے: "مولانا غلام اللہ خانؒ نے ڈابھیل میں انور شاہ کشمیریؒ اور مفتی مہدی حسنؒ سے پڑھا ہے، البتہ دارالعلوم دیوبند میں نہیں پڑھا۔ حضرت شیخ القرآنؒ 1962ء میں جمعیت اشاعت التوحید والسنۃ کے ناظم اعلیٰ رہے۔ بانئ جامعہ کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادگان مولانا قاضی احسان الحق، مولانا اشرف علی اور مولانا حسین علی، بالترتیب مہتمم رہے۔ چونکہ بانئ جامعہ مخصوص انداز میں عمدہ درسِ قرآن دیتے تھے، اس لیے طلبہ کثیر تعداد میں شریک ہوتے۔

"جامعہ اسلامیہ، راولپنڈی"۔ اس کا سن تاسیس 1954ء ہے۔ اس کے بانی مولانا قاری سعید الرحمن بن مولانا عبدالرحمن کامل پوریؒ ہیں۔ آپ 1952ء میں "دارالعلوم ٹنڈو اللہ یار

حیدر آباد“ سے فارغ التحصیل ہوئے۔ مولانا فقیر محمد پشاوریؒ، مولانا شاہ ابرار الحق ہردوئیؒ اور مولانا سرفراز خان صفدرؒ کے خلیفہ مجاز تھے۔ بانیٔ جامعہ کا 6/جولائی 2009ء میں انتقال ہوا۔ ”جامعہ اسلامیہ، راولپنڈی“ کا علاقے کے معیاری مدارس میں شمار ہوتا ہے۔

”جامعہ قاسم العلوم، ملتان“۔ یہ قدیم ادارہ گلگشت کالونی ملتان میں ہے۔ اس کے بانی مولانا محمد شفیع ملتانیؒ تھے۔ ادارے کا سنگ بنیاد مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نے رکھا۔ یہاں ایک عرصہ تک مفتی محمود رحمہ اللہ نے کتب حدیث کا درس دیا۔ علاوہ ازیں علامہ شریف کاشمیریؒ، مفتی محمد عبداللہ ملتانی، مولانا عبدالخالقؒ فاضل دار العلوم دیوبند اور مولانا فیض احمد ملتانی بھی درس دیتے رہے۔ ”جامعہ قاسم العلوم، ملتان“ میں ابتدائی درجوں سے لے کر دورۂ حدیث تک تعلیم ہوتی ہے۔ اس کی خاص یہ بات ہے کہ ریڈیو پاکستان ملتان کے مشہور قاری محمد عبدالرب ارشد صاحب شعبہ قرآن میں تجوید کی مشق کرواتے ہیں۔

”جامعہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ“۔ اس کے بانی امام اہلسنت مولانا سرفراز خان صفدرؒ کے بھائی مولانا صوفی عبدالحمید سواتی رحمہ اللہ ہیں۔ آپ 1941ء میں دار العلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہوئے۔ 1952ء میں مذکورہ مدرسہ کی بنیاد رکھی۔ آپ کی پچاس سے زائد تصانیف اور تالیفات ہیں۔ اسی ادارے میں مولانا سرفراز خان صفدرؒ شیخ الحدیث تھے اور 2008ء میں ان کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے مولانا زاہد الراشدی صاحب مستقل طور پر شیخ الحدیث بن گئے اور صوفی صاحبؒ کے صاحبزادے مولانا فیض احمد خان مدرسہ کے مہتمم بنے۔ اس ادارے میں درس نظامی کے علاوہ کئی شعبے بھی قائم ہیں۔ عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق وقتاً فوقتاً سیمینار اور شارٹ کورسز بھی منعقد ہوتے رہتے ہیں۔

”جامعہ اسلامیہ امدادیہ، بہاولپور“۔ سن تاسیس 1998 ہے۔ اس ادارے کے بانی مفتی ارشاد احمد صاحب ہیں۔ 2009ء سے اس کے سرپرست مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا محمد رفیع عثمانی صاحب ہیں، جبکہ ان سے قبل شیخ الحدیث مولانا نذیر احمد فیصل آبادی سرپرست تھے۔ یہاں پر کئی شعبوں میں تعلیم دی جاتی ہے۔

''جامعہ اشاعت العلوم چشتیاں''۔ یہ ادارہ ضلع بہاولنگر میں ہے۔ اس کے بانی مولانا عبدالعزیزؒ ہیں جو مولانا خیر محمد جالندھریؒ کے شاگرد اور خلیفہ مجاز ہیں۔ سن تاسیس 1967ء ہے۔ اس کے سرپرستوں میں مولانا خیر محمد جالندھریؒ، مولانا شمس الحق افغانیؒ، مولانا محمد شریف جالندھریؒ اور مولانا حکیم محمد اختر صاحب ہیں۔ شعبہ قرآن اور درس نظامی کی تعلیم ہوتی ہے۔

''جامعہ دارالہدیٰ، چوکیرہ، سرگودھا''۔ اس ادارے کے بانی مولانا سید احمد شاہ بخاریؒ بن سید غلام علی شاہؒ ہیں۔ آپ نے 1932ء کو دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور 1935ء کو وہیں سے فراغت پائی۔ آپ کے مرشد ثانی شیخ التفسیر مولانا احمد علی لاہوری تھے، جبکہ مرشد ثالث حضرت مولانا حمید اللہ بن مولانا احمد علی لاہوریؒ ہیں۔ آپ کو ان بزرگوں سے خلافت و اجازت حاصل ہے۔ آپ نے فراغت کے بعد 1948ء کے اوائل میں سرگودھا میں ''مدرسہ عربیہ دارالہدیٰ'' کے نام سے ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی۔ اس وقت سے تا وفات 1969ء تک آپ دینی، سیاسی، تبلیغی اور اصلاحی خدمات میں مصروف رہے۔ پسماندگان میں حضرت مولانا محمد قاسم شاہ، جناب غلام علی شاہؒ اور جناب شبیر احمد شاہ جیسے باکمال صاجزادے ہیں۔ ''جامعہ دارالہدیٰ چوکیرہ، سرگودھا'' اس وقت بھی معیاری تعلیم دے رہا ہے۔

''جامعہ اشرفیہ پشاور اور جامع مسجد مہابت خان''۔ یہ پشاور میں ایک قدیم تاریخی جامع مسجد بنام ''مہابت خان'' ہے، جس کی نسبت جنرل مہابت خان کی طرف ہے۔ جنرل مہابت خان بادشاہ نورالدین محمد جہانگیر کے دور میں گزرا ہے جو حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مرید خاص تھے۔ جب بادشاہ جہانگیر نے مجدد الف ثانیؒ کو حوالہ زندان کیا تھا تو جنرل مہابت خان نے علم بغاوت بلند کیا تھا اور مجدد الف ثانیؒ کو رہائی دلوائی تھی۔ انہوں نے یہ مسجد اس دور میں بنوائی ہے۔ لہٰذا یہ مسجد قدیم ہونے کے ساتھ بے حد متبرک اور تاریخی یادگار بھی ہے۔ اس مسجد کے ساتھ ایک دینی ادارہ بنام ''جامعہ اشرفیہ پشاور'' ہے، جس کی بنیاد حضرت مولانا عبدالودود قریشیؒ نے 13 اپریل 1953ء میں رکھی اور بوقت بنیاد، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ، حضرت مولانا یوسف جان بنوریؒ، حضرت مولانا خیر محمد جالندھریؒ، حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ، حضرت مولانا سید عطاء

اللہ شاہ بخاریؒ، حضرت مولانا شمس الحق افغانیؒ، اور حضرت مولانا عبدالحقؒ اکوڑہ خٹک وغیرہ موجود تھے۔ فی الحال مذکورہ مسجد و مدرسہ کے خطیب و مہتمم حضرت مولانا عبدالودود قریشیؒ صاحب کے خلف صادق حضرت مولانا محمد یوسف قریشی صاحب ہیں۔

''جامعہ عبداللہ بن مسعودؓ، خان پور''۔ اس کے بانی مولانا شفیق الرحمٰن درخواستیؒ ہیں۔ یہ حافظ الحدیث مولانا عبداللہ درخواستیؒ کے نواسے ہیں۔ آپ 1966ء میں فارغ التحصیل ہوئے۔ خلافت مولانا عبدالحیٰ بہلویؒ سے ملی۔ جامعہ کی بنیاد 1987ء میں رکھی۔ جامعہ کے بانی کے انتقال کے بعد ان کے چھوٹے بھائی مولانا مفتی حبیب الرحمٰن درخواستی مہتمم بنے جو اب یعنی جون 2010 تک اس عہدے پر فائز ہیں۔ ''جامعہ عبداللہ بن مسعودؓ، خان پور'' میں ابتدائی درجوں سے لے کر دورۂ حدیث تک تعلیم ہے۔ اس ادارے کا شمار پنجاب کے بڑے مدارس میں ہوتا ہے۔

''جامعۃ المرکز الاسلامی، بنوں''۔ اس کے بانی مولانا نصیب علی شاہ الہاشمیؒ ہیں۔ آپ 1979ء میں دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک سے فارغ التحصیل ہوئے۔ 1982ء میں پشاور یونیورسٹی سے ایم اے کیا۔ آپ نے 1995ء میں اس ادارے کی بنیاد ڈالی جس کا نام ''المرکز الاسلامی'' رکھا گیا۔ اس ادارے میں دورۂ حدیث تک پڑھائی ہوتی ہے۔ ''جامعہ المرکز الاسلامی، بنوں'' میں شعبہ تصنیف و تالیف بھی موجود ہے۔ یہیں سے کتاب ''جدید مالیاتی نظام کا اسلامی تصور'' اور کتاب ''امام ابوحنیفہؒ کی محدثانہ حیثیت'' شائع ہوئی ہے۔

''مدرسہ اشرف العلوم، گوجرانوالہ''۔ اس کے بانی حضرت مولانا مفتی خلیلؒ ہیں۔ یہ مفتی محمد حسن امرتسریؒ کے خلیفہ ہیں۔ 1949ء میں دار العلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہوئے۔ پھر مختلف مدارس میں تدریس کی۔ مئی 1952 میں مدرسہ اشرف العلوم کی بنیاد رکھی جو مسجد شیخان اندرون شیخوپورہ دروازہ گوجرانوالہ میں ہے۔ چند ماہ کے بعد مدرسہ کو ''مسجد عبداللہ خونی مسجد بخشے والا'' میں منتقل کر دیا گیا اور اسے خوب ترقی دی۔ آپ کی وفات 20 اپریل 1982 میں مکۃ المکرمہ میں ہوئی۔ اب آپ کے صاحبزادے مفتی محمد نعیم اللہ مہتمم اور ذمہ دار ہیں۔

''جامعہ عربیہ اظہار الاسلام، چکوال''۔ اس کے بانی مولانا قاضی مظہر حسینؒ ہیں۔ قاضی

صاحبؒ اکتوبر 1914ء کو ضلع چکوال کے معروف قصبہ بھیں میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے گھر میں حاصل کر کے 1928ء میں گورنمنٹ اسکول چکوال سے میٹرک پاس کیا۔ پھر دارالعلوم عزیزیہ بھیرہ چلے گئے۔ وسطی کی کتابیں وہیں پڑھ کر از ہر ہند دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے۔ 1939ء میں فراغت حاصل کی۔ قاضی صاحبؒ کو حکیم الامت مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ سے کسب فیض اور مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے خرقۂ خلافت حاصل کرنے کا شرف حاصل ہے۔ اس لیے قاضی صاحب ''مجمع البحرین'' کے مصداق تھے۔ 1941ء سے 1949ء تک انگریز کے دور حکومت میں راولپنڈی، جہلم، لاہور اور ملتان کے قید خانوں میں اسیر رہے۔ 29 رفروری 1952ء کو قاضی صاحبؒ نے فراغت کے بعد پاکستان تشریف لا کر چکوال میں امدادیہ مسجد کے نام سے ایک جامع مسجد اور ایک مدرسہ بنام دارالعلوم کی بنیاد ڈالی۔ قاضی صاحبؒ نے 1952ء سے 1956ء تک کا زمانہ ردقادیانیت اور تحفظ عقیدۂ ختم نبوت میں گزارا۔ 1953ء کی تحریک ختم نبوت میں قائدانہ کردار ادا کیا۔ 1962ء میں جمعیت علمائے اسلام راولپنڈی ڈویژن کے امیر مقرر ہوئے۔ قاضی صاحبؒ اکتوبر 1998ء کو نواز شریف دور حکومت میں آخری مرتبہ گرفتار ہوئے اور سنت یوسفیؑ کا نمونہ پیش کیا۔ ''جامعہ عربیہ اظہار الاسلام، چکوال'' اس وقت پاکستان کے اچھے مدارس میں شمار ہوتا ہے۔

''جامعہ قاسم العلوم فقیروالی، بہاولنگر''۔ اس کے بانی مولانا فضل محمد قاسمی ہیں۔ 1933ء میں دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہوئے۔ اگست 1937ء میں مدرسہ قاسم العلوم فقیروالی کی بنیاد ڈالی جو بعد میں قابل رشک ادارہ بن گیا۔ یہاں 1943ء میں دورۂ حدیث کا آغاز ہوا اور شیخ الحدیث مفتی عبدالکریم گمتھلویؒ مقرر ہوئے، جبکہ دیگر کتب حدیث کی تدریس کے لیے مولانا ظہور احمد صاحب سابق استاذ دارالعلوم دیوبند کا بھی تقرر ہوا۔ ''جامعہ قاسم العلوم فقیروالی، بہاولنگر'' کی اس وقت کیا صورت حال ہے، کچھ معلوم نہیں؟

''مدرسہ جامع العلوم عیدگاہ، بہاولنگر''۔ اس کا سن تاسیس 1950 ہے۔ اس ادارے کے بانی مولانا بدر عالم میرٹھی مہاجر مدنیؒ ہیں۔ جب بانی جامعہ ہجرت کر کے مدینہ منورہ چلے گئے تو جاتے

وقت مدرسہ اپنے شاگرد مولانا نیاز محمدؒ کے سپرد کیا۔ مولانا نیاز محمد ختنی دار العلوم دیو بند سے 1944ء میں فارغ التحصیل ہوئے۔ فراغت کے بعد مدرسہ جامع العلوم عیدگاہ بہاولنگر کے مہتمم بنے۔ بے حد محنت سے مدرسہ کو ترقی دی اور دورۂ حدیث کا افتتاح کیا۔ طلبہ کثیر تعداد میں یہاں دورہ پڑھنے آتے تھے کیونکہ مولانا ختنیؒ دار العلوم دیو بند کے فاضل اور نہایت قابل تھے۔ 6/جنوری 1996ء میں مولانا ختنیؒ اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ مولانا ختنیؒ کے ایک صاحبزادے مولانا منیر احمد صاحب ہیں جو مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ کے داماد ہیں۔ ''مدرسہ جامع العلوم عیدگاہ، بہاولنگر'' میں ان بھی اچھی تعلیم دی جاتی ہے۔

''جامعۃ الصالحات، کراچی''۔ خواتین کی تعلیم و تربیت کا یہ ادارہ عزیز آباد، فیڈرل بی ایریا کراچی میں واقع ہے۔ اس کے بانی مولانا مفتی محمد ضیاء الحق دہلوی ہیں۔ آپ نے 1939ء میں دار العلوم دیو بند سے فراغت حاصل کی۔ 1984ء میں پاکستان کی طرف ہجرت کی اور ''انجمن فلاح دارین'' کے نام سے ایک جماعت بنائی اور مذکورہ مدرسہ کی بنیاد بھی رکھی۔ اس وقت سے اب تک اس مدرسہ میں خواتین کی تعلیم ہوتی ہے۔ ''جامعۃ الصالحات، کراچی'' خواتین کی تعلیم کا معیاری ادارہ شمار ہوتا ہے۔

''مدرسہ حنفیہ''، ''مدرسہ قاسمیہ'' اور ''دار العلوم حنفیہ'' لاہور''۔ ان اداروں کے بانی مولانا عبد الحلیم قاسمیؒ بن مولانا عبد الحکیم ہیں۔ آپ 1941ء میں دار العلوم دیو بند سے فارغ التحصیل ہوئے۔ 1944ء میں مدرسہ حنفیہ قائم کیا جہاں دورۂ حدیث تک پڑھائی کا انتظام ہے۔ 1948ء میں مدرسہ قاسمیہ حنفیہ کے نام سے ایک اور ادارہ قائم کیا۔ 1957ء میں ایک اور ادارہ بنام ''مدرسہ قاسمیہ'' قائم کیا۔ اس کا سنگِ بنیاد مولانا احمد علی لاہوریؒ کے ہاتھ سے رکھوایا گیا۔ اس کے بعد 1958ء میں ایک ادارہ بنام ''دار العلوم حنفیہ'' قائم کیا۔ اس کا سنگ بنیاد مفتی شفیعؒ کے دست مبارک سے رکھوایا گیا۔ ان اداروں کے بانی مولانا عبد الحلیم قاسمیؒ دنیا میں نہیں ہیں، لیکن یہ ادارے روشنی پھیلا رہے ہیں۔

''مدرسہ فیض احمدی و مدرسہ خاتم النبیین، سندھ''۔ یہ مدرسہ صوبہ سندھ کے علاقہ ''سونڈا''

میں ہے۔ سن تاسیس 1894ء ہے۔ بانی مولانا قاضی احمد بخاری بن عبدالکریم ہیں۔ آپ دارالعلوم دیوبند سے 1894 میں فارغ التحصیل ہوئے۔ فراغت کے فوراً بعد مذکورہ مدرسہ فیض احمدی کی بنیاد رکھی۔ مدرسہ کے بانی کا اسم گرامی چونکہ احمد تھا اس لیے مدرسہ کا نام مدرسہ فیض احمدی رکھا تھا پھر یہ نام منکرین ختم نبوت قادیانیوں کے ایک فرقے احمدی کے ہم نام ہونے کی وجہ سے احمدیوں کا سونڈا میں آنے کی وجہ مدرسہ کا یہی نام بنا تو استاذ العلماء مولانا عبدالغفور صاحب قاسمی سجاولی کے حکم اور حضرت استاذ مولانا احمد صاحب سومرو کے مشورے سے مدرسہ کا نام تبدیل کر کے فیض احمدی سے خاتم النبیین رکھا گیا۔ اس وقت مدرسہ میں حفظ قرآن مجید اور عربی کی ابتدائی جماعتوں میں بچے بچیاں زیر تعلیم ہیں۔ اس وقت اس مدرسہ کے زیر سرپرستی سونڈا کے قرب وجوار میں بہت سارے مدرسے قرآن شریف و دینی علوم کی خدمت کر رہے ہیں۔

''مدرسہ رفیع المدارس، سندھ''۔ یہ مدرسہ صوبہ سندھ پاکستان کا علاقہ ''سونڈا'' میں ہے۔ مؤسس مولانا محمد ابراہیم نقشبندیؒ ہیں۔ یہ دارالعلوم دیوبند کے فاضل اور دارالعلوم دیوبند کے مہتمم اوّل شاہ رفیع الدینؒ کے خلیفہ مجاز تھے۔ یہ فراغت کے بعد صوبہ سندھ آئے اور ''سونڈا'' میں مذکورہ مدرسہ کی بنیاد ڈالی۔ مؤرخین کے مطابق یہ وہ پہلے دیوبندی عالم ہیں جو صوبہ سندھ آئے اور دینی مدرسہ کی بنیاد رکھی۔ اس اعتبار سے یہ 1870ء سے پہلے کا ادارہ ہے۔

''دارالعلوم، فیصل آباد''۔ اس کے بانی مفتی زین العابدینؒ ہیں۔ آپ نے دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کی اور جامعہ اسلامیہ ڈابھیل سے لگ بھگ 1950ء میں فراغت پائی۔ فراغت کے بعد 1951ء میں فیصل آباد تشریف لائے۔ 1954ء کو مرکزی جامع مسجد فیصل آباد کے خطیب ومفتی مقرر ہوئے۔ مفتی صاحبؒ کو خلافت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ سے ملی ہے۔ 1962ء میں نے دارالعلوم پیپلز کالونی کی بنیاد رکھی جو بعد میں ''دارالعلوم فیصل آباد'' کے نام سے ایک معیاری اداہ بن گیا جہاں دورہ حدیث تک معیاری تعلیم اور ساتھ تربیت بھی ہوتی ہے۔ اس ادارے میں ممتاز علمائے کرام نے تدریس کی اور ہزاروں طلبہ یہاں سے فارغ التحصیل ہوئے۔

''دارالعلوم قاسمیہ، گڑھی یاسین، ضلع شکارپور''۔ یہ ادارہ علاقہ ''امروٹ''، تحصیل گڑھی

یاسین ضلع شکار پور صوبہ سندھ میں ہے۔ سن تاسیس 1890ء ہے۔ اس کے بانی مولانا تاج محمد امروٹیؒ بن سید عبدالقادر ہیں۔ آپ 1857ء میں خیر پور صوبہ سندھ میں پیدا ہوئے۔ علوم کی تکمیل مولانا عبدالقادر راندھڑؒ سے کی۔ خلافت سید العارفین شیخ محمد صدیق تھر چونڈی سے حاصل کی۔ آپ 5/نومبر 1929ء کو وفات پا گئے۔ مذکورہ مدرسہ کے سرپرست امام انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ تھے۔ آپ نے اس ادارے میں 1890ء سے 1897ء تک تدریس فرمائی اور طالبانِ علوم نبوت کو فیض پہنچایا۔

''دارالعلوم حنفیہ، چکوال''۔ سن تاسیس 1952ء ہے۔ اس کے بانی مولانا پیر غلام حبیب نقشبندیؒ ہیں۔ آپ نے کتب حدیث مولانا سید امیرؒ فاضل دارالعلوم دیوبند سے پڑھیں جبکہ تفسیر 1940ء میں مولانا عبیداللہ سندھیؒ سے حرم کعبہ میں پڑھی۔ خلافت خواجہ فضل علی قریشیؒ کے خلیفہ خواجہ عبدالمالکؒ سے حاصل کی۔ اس ادارے میں تعلیم کے ساتھ اصلاح باطن اور تزکیہ نفس کا درس بھی دیا جاتا ہے۔ اس حیثیت سے یہ نہایت کامیاب ادارہ ہے۔

''جامعہ عالیہ سراج العلوم، سرگودھا''۔ اس کا سن تاسیس 1934ء ہے۔ بانی مولانا مفتی محمد شفیع سرگودھوی ہیں۔ آپ دارالعلوم دیوبند کے فاضل ہیں۔ آپ حضرت احمد خانؒ کے خلیفہ ہیں۔ اس کے بعد آپ مذکورہ جامعہ میں تشریف لائے اور پوری زندگی یہاں تدریس فرماتے رہے۔ اس ادارے میں بڑے بڑے علماء نے تدریس کی۔ بانی جامعہ کی وفات 16/جون 1966ء میں ہوئی۔ آپؒ کی اولاد میں مولانا احمد سعید فاضل دارالعلوم دیوبند، قاری عبدالسمیع فاضل دارالعلوم دیوبند اور مولانا محمد رفیع صاحب ہیں۔

''مدرسہ صدیقیہ راشدیہ، دین پور''۔ اس کا سن تاسیس 1922ء ہے۔ بانی مولانا غلام محمد دین پوریؒ ہیں۔ آپ نے ابتدائی تعلیم مولانا فقیر اللہؒ سے حاصل کی۔ پھر سندھ کے ایک بزرگ حافظ محمد صدیق ساکن بھر چونڈیؒ سے بیعت ہوئے۔ 28 برس تک شیخ کی خدمت و معیت میں رہ کر ظاہری و باطنی علوم حاصل کیے اور خلافت بھی انہی سے ملی۔ اس کے بعد دین پور سندھ آئے اور وہاں کی مسجد تعمیر کر کے اسے خانقاہ قرار دیا۔ ''مدرسہ صدیقیہ راشدیہ، دین پور'' کی اس وقت کیا

حالت ہے، معلوم نہیں ہوسکا ہے۔

''مدرسہ عربیہ نجم المدارس، کلاچی''۔اس ادارے کے بانی مولانا قاضی نجم الدینؒ ہیں۔سن تأسیس 1949 ہے۔موجودہ مہتمم بانی مدرسہ کے صاحبزادے مولانا قاضی عبدالکریم کلاچی ہیں۔ اس ادارے میں کئی نامی گرامی علماء نے درس دیا ہے۔

''مسجد و مدرسہ یعقوبیہ، کراچی''۔اس کا سن تأسیس 1952 ہے۔بانی قاری محمد یعقوبؒ بن مولانا قاری محمد اسحاقؒ ہیں۔بانی مدرسہ کے انتقال کے بعد ان کے بڑے صاحبزادے قاری محمد ایوب مہتمم بنے۔ان کے انتقال کے بعد بانی جامعہ کے چھوٹے صاحبزادے قاری محمد سلیمان صاحب مہتمم بنے اور اب تک مدرسہ چل رہا ہے۔

''جامعہ دارالخیر، گلستان جوہر، کراچی''۔یہ مدرسہ 1990ء میں موجودہ جگہ میں منتقل ہوا ہے۔اس کے بانی مولانا محمد اسفندریار خان ہیں۔ان کے نائب مولانا مفتی محمد عثمان یار خان صاحب ہیں جو بانی جامعہ کے صاحبزادے ہیں۔اس میں دورۂ حدیث تک پڑھائی ہوتی ہے اور مدرسہ کے ساتھ بانی جامعہ کی خانقاہ بھی ہے جس کا نام ''خانقاہ صدیقیہ نقشبندیہ مجددیہ عالیہ'' ہے۔

''مدرسۃ العلوم، پڑنگ آباد'' اور ''مدرسہ مطلع العلوم، بلوچستان''۔ان دونوں اداروں کے بانی مولانا عرض محمدؒ ہیں۔آپ 1903ء میں پڑنگ آباد مستونگ بلوچستان میں پیدا ہوئے۔ 1934ء میں دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہوئے۔1935ء کو ''مدرسۃ العلوم'' کی بنیاد رکھی جو پڑنگ آباد مستونگ بلوچستان میں ہے۔اس کے ایک سال کے بعد اس کا مہتمم اپنے ہم کلاس ساتھی مولانا محمد عمر صاحب کو مقرر کیا اور خود مستونگ میں ایک اور ادارہ بنام ''دارالعلوم'' کی بنیاد رکھی۔ایک عرصہ تک یہاں تدریس کی پھر 1942ء میں بروری روڈ، کوئٹہ میں ''مدرسہ مطلع العلوم'' کی بنیاد رکھی۔آپ 30راکتوبر 1971ء میں وفات پاگئے لیکن یہ تینوں ادارے آج بھی فیض پہنچا رہے ہیں۔

''جامعہ عباسیہ، بہاولپور''۔اس کا سن تأسیس 1952ء ہے۔بانی بہاولپور کے امیر نواب سر صادق محمد خان عباسیؒ ہیں۔اس کے نصاب میں جدید وقدیم دونوں علوم شامل کیے گئے تھے تاکہ

طلبہ کو دین کے ساتھ دنیا پر بھی آگاہی حاصل ہو۔ 1969 میں اس کا نام "جامعہ اسلامیہ" رکھا گیا اور اسے یونیورسٹی کا درجہ دیدیا گیا بلکہ حکومت پاکستان نے اسے اپنی تحویل میں لے لیا۔ جن شخصیات ومشائخ نے یہاں درس دیا ان میں سے چند کے نام یہ ہیں: مولانا غلام محمد گھوٹوئیؒ۔ مولانا عبید اللہؒ۔ مولانا عبدالخالق فاضل دارالعلوم دیوبند۔ مولانا احمد علیؒ۔ مولانا فاروق احمدؒ۔ مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ۔ مولانا ناظم ندویؒ۔ مولانا محمد عبدالرشید نعمانیؒ۔

"جامعہ عربیہ، چنیوٹ"۔ سن تأسیس 1954ء ہے۔ یہ ادارہ دراصل قادیانیوں کے ارتدادی ادارے "جامعہ احمدیہ" کے مقابلے پر ہے۔ جامعہ احمدیہ چناب نگر (ربوہ) پاکستان میں ہے، جہاں قادیانیت کی تعلیم وتربیت ہوتی ہے۔ اس ادارے کے مؤسس اور بانی حضرت مولانا منظور احمد چنیوٹیؒ ہیں جو دارالعلوم الاسلامیہ ٹنڈو الہ یار حیدرآباد کے فاضل تھے۔ آپ نے ختم نبوت کے لیے بے شمار قربانیاں دیں۔ 17 رجون 2004ء میں وفات پاگئے، مگر یہ ادارہ آپ کے لیے صدقہ جاریہ ہے۔

"مدرسہ دارالعلوم الاسلامیہ" نیوہالا، سندھ"۔ یہ 1991ء میں قائم ہوا۔ اس علاقے میں اس سے قبل کوئی معیاری دینی ادارہ نہیں تھا۔ مدرسے کے بانی، روح رواں اور مہتمم حضرت مفتی رشید احمد لدھیانوی رحمہ اللہ کے خلیفہ مجاز مفتی خالد صاحب ہیں۔ آپ کی سرپرستی میں یہ مدرسہ تیزی سے ترقی کر رہا ہے۔ مدرسے میں درسِ نظامی کے تمام درجات ہیں۔ شعبہ حفظ کی نو کلاسیں ہیں۔ اس کے علاوہ مدرسے میں دارالافتا اور شعبہ تصنیف وتالیف بھی قائم ہے۔ اس وقت یہاں مجموعی طور پر ایک ہزار کے قریب طلبہ زیر تعلیم ہیں۔ "مدرسہ دارالعلوم الاسلامیہ" نیو ہالا سندھ" کی 6 شاخیں بھی کام کر رہی ہیں۔

"مدرسہ محمدیہ عربیہ، ٹنڈو آدم۔" اس کے بانی مولانا محمد صدیق المعروف "فقیر منٹھار" ہیں۔ یہ فقیہ العصر حضرت مفتی رشید احمد لدھیانوی رحمہ اللہ کے خلیفہ مجاز تھے۔ فقیر منٹھار نے ٹنڈو آدم کے قریب "گوٹھ سچیڈنو وریاہ" میں مدرسہ محمدیہ عربیہ قائم کیا۔ اس میں اوسطاً تین سے چار سو تک مسافر طلبہ زیر تعلیم ہوتے ہیں۔ آخری وقت تک فقیر منٹھار یہیں پر دین کی خدمات سرانجام دے

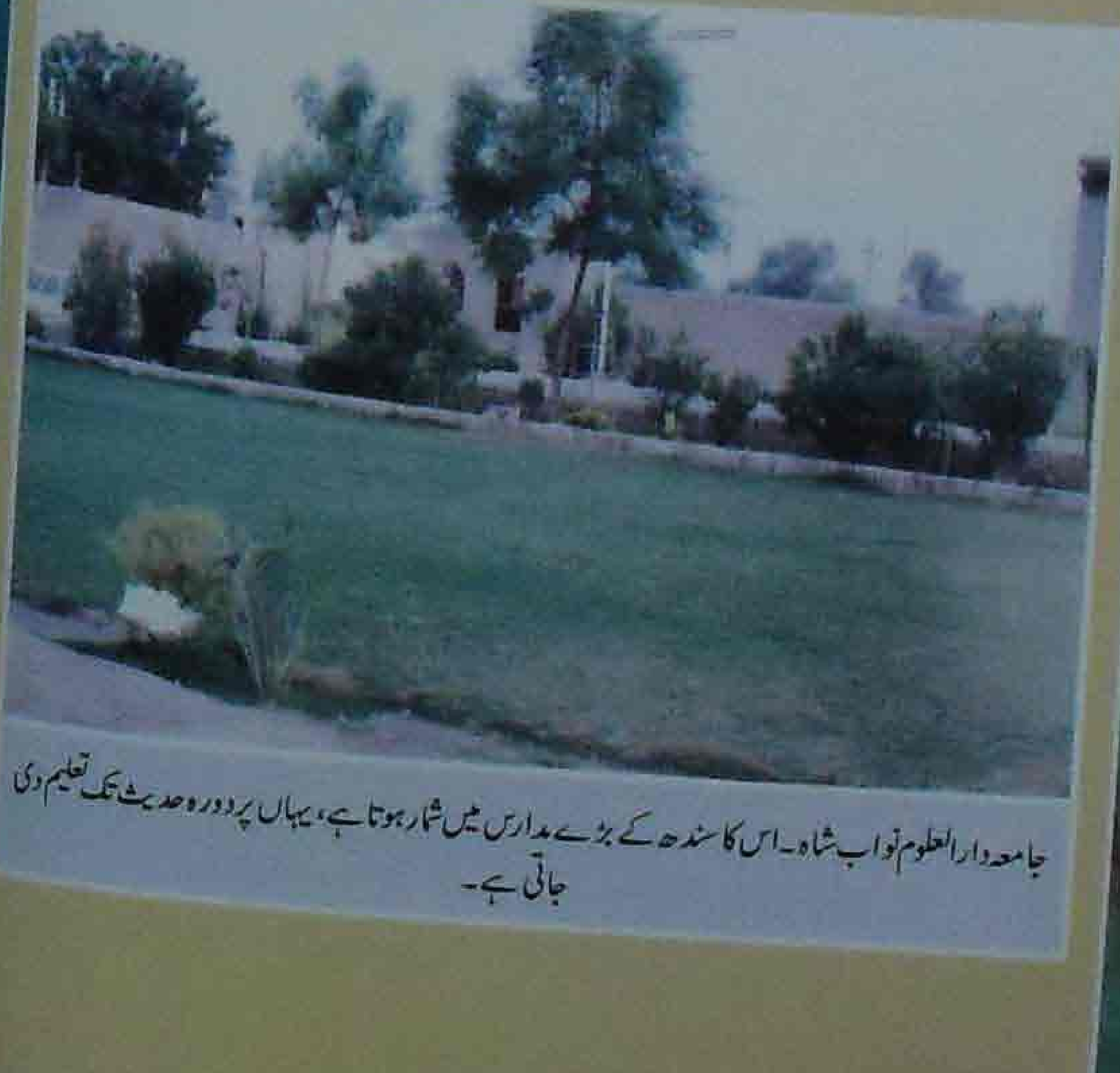


''جامعہ خالد بن ولید''، بھینگی کالونی، ملتان روڈ، وہاڑی۔ طلبہ کے لیے بنایا گیا خوبصورت وضوخانہ اور پس منظر میں درسِ نظامی کی عمارت نظر آرہی ہے۔



''جامعہ خالد بن ولید'' کے شعبہ حفظ کی درس گاہیں۔ چھوٹی تصویر میں مدرسے کا داخلی دروازہ واضح ہے۔



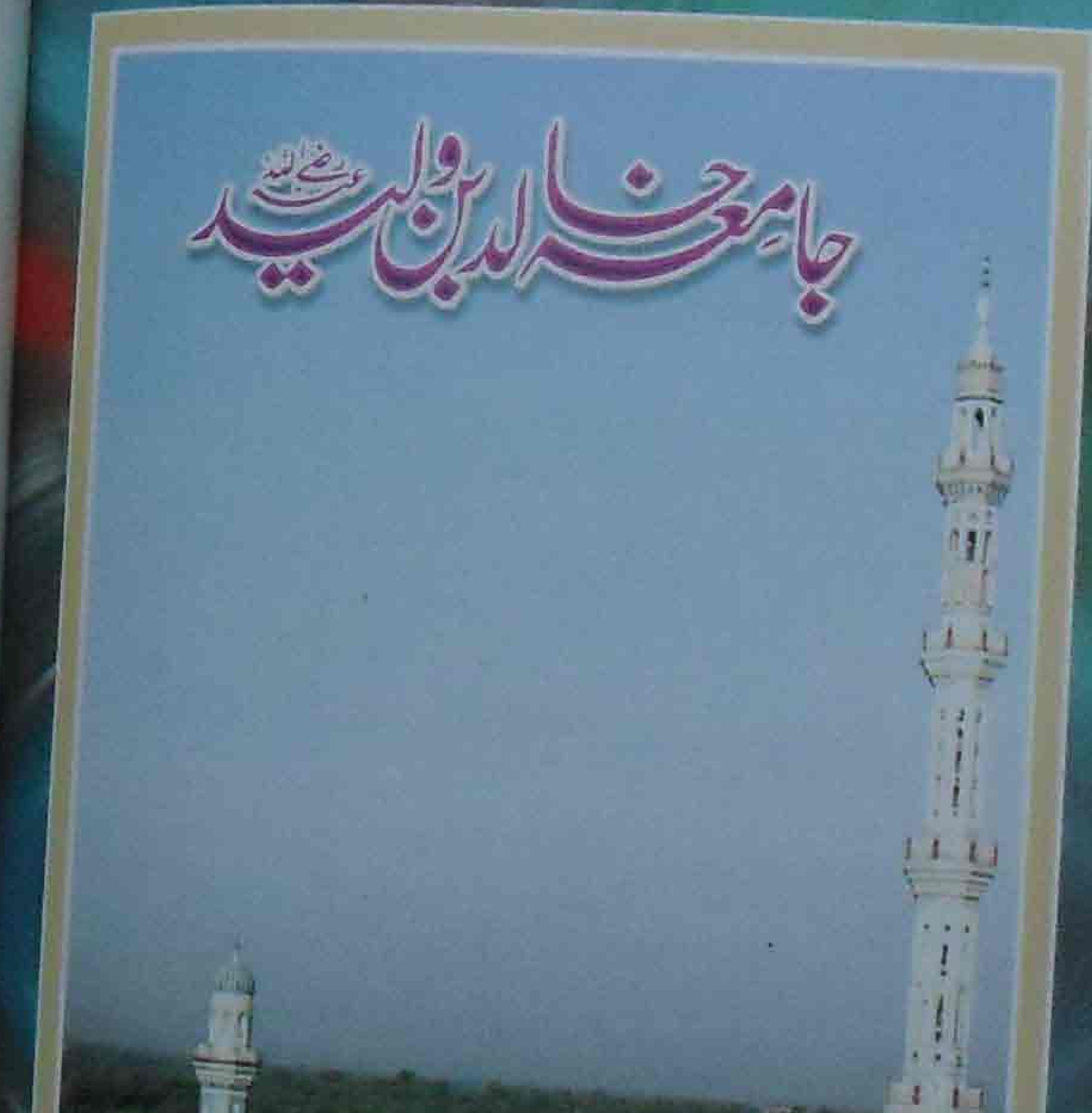


جامعہ دار العلوم نواب شاہ۔ اس کا سندھ کے بڑے مدارس میں شمار ہوتا ہے، یہاں پر دورہ حدیث تک تعلیم دی جاتی ہے۔





"جامعہ دارالقرآن"، مسلم ٹاؤن، فیصل آباد۔ یہ ادارہ شعبہ حفظ کے لیے مشہور ہے۔ اس میں پانچ ہزار سے زائد طلبہ زیرِ تعلیم ہیں۔ اس مدرسے کی اندرونی و بیرونی ملک بارہ مستقل شاخیں ہیں۔


جامعہ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ

رہے تھے۔ 13 شعبان 1427ھ مطابق 7 ستمبر 2006ء کو آپ نے وفات پائی۔ آپ کی یاد میں ہر سال ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کیا جاتا ہے۔ اس میں سندھ کی خانقاہوں کے اکثر گدی نشینوں پیر طریقت مولانا احمد میاں حمادی، پیر طریقت حضرت مولانا عبدالعزیز قریشی، پیر طریقت حضرت مولانا عبدالقیوم ہالیجی، سجادہ نشین کنڈیاں شریف حضرت مولانا خلیل احمد صاحب بن خواجہ خان محمد رحمہ اللہ اور بیسیوں دیگر اکابرین کو جمع کیا جاتا ہے۔

طوالت سے بچنے کے لیے:

طوالت سے بچنے کے لیے درج ذیل مدارس کے ذمہ داروں کے نام ہی لکھے جا رہے ہیں۔

''دار العلوم فاروقیہ، راولپنڈی''۔ اس ادارے کے موجودہ مہتمم مولانا قاضی عبدالرشید ہیں جو وفاق المدارس العربیہ پنجاب کے ناظم اور عاملہ کے رکن ہیں۔ ''جامعہ اسلامیہ باب العلوم، کہروڑ پکا''۔ اس کے بانی مولانا عبدالمجید لدھیانوی ہیں جو جامعہ کے شیخ الحدیث بھی ہیں۔ ''جامعہ مفتاح العلوم، سرگودھا''۔ اس ادارے کے مہتمم محمد طاہر مسعود ہیں۔ ''جامعہ محمودیہ، سرگودھا''۔ اس کے موجودہ مہتمم مولانا اشرف علی ہیں جو جامعہ اشرفیہ لاہور کے فاضل ہیں۔ ''دار العلوم الاسلامیہ، مظفر آباد''۔ یہ ادارہ مظفر آباد آزاد کشمیر میں واقع ہے۔ موجودہ مہتمم مولانا قاضی محمود الحسن اشرف ہیں، جو وفاق المدارس کے رکن ہیں۔ ''جامعہ اسلامیہ، ڈیرہ غازی خان''۔ اس کے بانی مولانا عبدالقادر رحمانی ہیں۔ ''جامعہ صدیق اکبرؓ، ڈیرہ غازی خان''۔ اس کے بانی مولانا رشید احمد شاہ ہیں۔ ''دار العلوم رحمانیہ، ڈیرہ غازی خان''۔ اس کے بانی حاجی محمد قاسم کھتران ہیں۔ مہتمم مولانا قاری محمد سلیم کھتران اور نائب مہتمم مولانا محمد نعیم کھتران ہیں۔ ''جامعہ قاسمیہ، ڈیرہ غازی خان''۔ اس کے بانی مفتی خالد محمود ہیں۔ ''جامعہ ابی بکر، جام پور''۔ اس ادارے کے بانی مولانا عبدالحیؒ جامپوری تھے۔ جو دار العلوم دیوبند کے فاضل تھے۔ مہتمم مولانا ابوبکر عبداللہ ہیں جو بانیٔ جامعہ کے صاحبزادے ہیں۔ ''جامعہ عربیہ دارالفیوض، کراچی''۔ اس کا سن تاسیس 1961ء ہے۔ بانی مولانا عبدالرؤف ہیں جو حافظ الحدیث مولانا عبداللہ درخواستیؒ کے شاگرد ہیں۔ ''جامعہ فاروقیہ شجاع آباد''۔ اس کے بانی مولانا رشید احمدؒ ہیں۔ مہتمم مولانا زبیر احمد صدیقی

ہیں۔ ''جامعہ عثمانیہ شیر شاہ، کراچی''۔ اس کا افتتاح مولانا مفتی محمودؒ نے جون 1980ء میں کیا۔ موجودہ مہتمم مولانا قاری محمد عثمان ہیں۔ سن افتتاح سے اب تک شعبۂ حفظ سے 1450 حفاظ اور شعبۂ تجوید سے 802 قرأ فارغ التحصیل ہوئے۔

یہ نصف صدی پہلے کی بات:

چند سال پہلے کی بات ہے میں ''اولیاء اللہ'' سے متعلق ایک ضخیم کتاب پڑھ رہا تھا۔ میرا بہت دل کیا کہ میں کم از کم پاکستان میں قائم خانقاہوں پر حاضری دوں، لیکن جانے کی کوئی صورت نہ بن پائی۔ ماہ و سال گزرتے رہے۔ اچانک ایک دن موبائل کی گھنٹی بجی۔ ریسیو کیا تو دوسری طرف سے ''السلام علیکم'' کے بعد فرمایا گیا: ''بھئی! ہم 9 بجے اندرونِ سندھ اولیاء اللہ کی زیارات کے لیے سہ روزہ دورے پر جارہے ہیں آپ کو بھی ہمارے ساتھ چلنا ہے۔'' یہ حکم نما پیغام حضرت مفتی صاحب کا تھا۔ پروگرام کی تفصیل اور ہم سفروں کے نام پوچھے تو خوشگوار حیرت ہوئی۔ چنانچہ زادراہ، کیمرہ، ڈائری، وائس ریکارڈر اور اپنی کتابوں کا سیٹ لے کر مقررہ وقت پر پہنچ گیا۔ فراٹے بھرتے ہوئے ہماری گاڑی سپر ہائی وے پر حیدرآباد کی طرف جارہی تھی۔ ظہر کی نماز ''ہالا'' میں حضرت مفتی رشید احمد لدھیانوی رحمہ اللہ کے خلیفہ مجاز مفتی خالد صاحب کے قائم کردہ مدرسہ دار العلوم الاسلامیہ نیو ہالا میں پڑھی۔ نماز کے بعد حضرت مفتی صاحب علماء اور طلبہ کے اجتماع سے پرمغز و موثر خطاب فرمایا۔

نماز عصر پڑھ کر پھر ٹنڈو آدم کے لیے روانہ ہوگئے۔ یہاں مفتی صاحب نے جلسہ عام سے خطاب کرنا تھا۔ یہ جلسہ حضرت مفتی رشید احمد رحمہ اللہ کے خلیفہ مجاز حضرت فقیر منٹھار کے قائم کردہ ادارے ''مدرسہ محمدیہ عربیہ'' کے احاطے میں ہو رہا تھا۔ یہ فقیر منٹھار کی یاد میں سالانہ چوتھا عظیم الشان جلسہ تھا۔ اس میں سندھ کی خانقاہوں کے تمام گدی نشینوں کو جمع کیا گیا تھا۔ پیر طریقت مولانا احمد میاں حمادی، پیر طریقت حضرت مولانا عبدالعزیز قریشی، پیر طریقت حضرت مولانا عبدالقیوم ہالیجی، سندھ کے مشہور و معروف نعت خواں امداد اللہ پھلپوٹو، سجادہ نشین کندیاں شریف حضرت مولانا خلیل احمد صاحب بن خواجہ خان محمد رحمہ اللہ اور بیسیوں دیگر اکابرین اور ان کے صاحب زادگان موجود تھے۔ ہم نے اپنی زندگی میں اتنا ہمہ تن گوش مجمع نہیں دیکھا تھا اور کسی دور

دراز دیہات میں اتنے اکابر اور مشہور خانقاہوں، گدی نشینوں کا مجمع نہیں دیکھا تھا۔ ہمارے لیے یہ سب ''نعمت غیر مترقبہ'' تھا۔

اس کے بعد رات گیارہ بجے شعبۂ حفظ کے لیے پاکستان بھر میں سب سے مشہور تعلیمی ادارے مدرسہ دارالعلوم حسینیہ شہداد پور گئے۔ یہاں پر مدرسے کے مہتمم مولانا محمد یوسف، شیخ الحدیث مولانا سلیم، ناظم تعلیمات مولانا قاری عبدالرشید اور دیگر حضرات سے ملاقات ہوئی۔ یہاں کی مسجد، قدیم طرز کے فلک بوس مینار اور دارالحدیث قابل دید تھا۔ رات ہم نے یہیں پر قیام کیا۔ اگلی صبح ''شاہ پور چاکر'' کے لیے روانہ ہوگئے۔ شاہ پور چاکر میں حضرت لاہوری کے آخری خلیفہ حضرت مولانا محمد حسن صاحب کی زیارت اور ملاقات کے لیے روانہ ہوئے۔ یہ شاہ پور چاکر میں مدرسہ عربیہ ''تاج المساجد'' میں مقیم ہیں۔ 88 سال عمر ہے۔ ان کو دیکھ کر واقعتاً اللہ یاد آجاتا ہے۔ مسجد کی تعمیر کا بھی عجیب وغریب واقعہ ہے۔

یہ نصف صدی پہلے کی بات ہے۔ حضرت مولانا محمد حسن صاحب حج کے لیے تشریف لے گئے۔ ریاض الجنۃ میں بیٹھے تھے۔ آنکھ لگ گئی۔ خواب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی۔ آپ نے فرمایا: ''حسن! مسجد بناؤ۔'' اور آنکھ کھل گئی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کیا جائے؟ کیسی مسجد اور کہاں پر بنائی جائے؟ ان کے شیخ حضرت لاہوریؒ اس وقت مکہ میں موجود تھے۔ خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا: ''کچھ سمجھ نہیں آرہا۔'' حضرت لاہوریؒ نے فرمایا: ''جاؤ جاکر سندھ کے علاقے ''شاہ پور چاکر'' میں مسجد تعمیر کرو۔'' یہاں پر اس وقت کوئی مسجد نہ تھی۔ چنانچہ اس مسجد کا سنگ بنیاد بھی حضرت لاہوریؒ نے رکھا اور بھی کئی حیرت انگیز واقعات سنائے جو پھر کسی وقت سہی!

اولیاء اللہ کے قدموں میں:

نواب شاہ سے ہوتے ہوئے ہم خیر پور گئے۔ جامعہ دارالہدیٰ مسجد ومدرسہ میں حاضری دی۔ اس مدرسے میں فقیہ العصر حضرت مفتی رشید احمد رحمہ اللہ پڑھاتے رہے ہیں۔ حضرت رحمہ اللہ کے آبائی گاؤں ''سلیم آباد'' میں حاضری دی۔ گھر کی زیارت کی اور حضرت کے رشتہ داروں سے بات چیت ہوئی۔ اس کے بعد پنوعاقل میں واقع سندھ کی مشہور خانقاہ ''ہالیجی شریف'' گئے۔ رات

مغرب کے بعد پہنچے تو ذکرواذکار کی مجلس ہو رہی تھی۔ شرکت کی۔ پیر طریقت حضرت مولانا عبدالصمد صاحب سے ملاقات ہوئی۔ مولانا عبدالصمد کا علمی ذوق اور معلومات نے ہمیں بہت متاثر کیا۔ رات کو لنگر سے کھانا کھایا۔ پھر ان کے دادا حضرت حماد اللہ ہالیجی کی قبر پر حاضری دی۔ ہمیں یہاں انتہائی سکون ملا۔ خانقاہ، مسجد اور مدرسے کا تفصیلی وزٹ کیا اور سو گئے۔ حضرت نے فرمایا: ''صبح ناشتہ کیے بغیر نہیں جانا!''

صبح سویرے لاڑکانہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ قمبر سے آگے سندھ کی دوسری مشہور خانقاہ ''بیر شریف'' حاضری دی۔ یہ خانقاہ پیر طریقت مولانا عبدالکریم قریشی کی آباد کردہ ہے۔ اس وقت گدی نشین مولانا عبدالعزیز ہیں۔ اس کے بعد امروٹ شریف جانے کا ارادہ کیا۔ مغرب ہو چکی تھی۔ مقامی لوگوں کا کہنا تھا اس علاقے میں رات کو سفر کرنا مشکل ہے۔ جگہ جگہ چور ڈاکو ہیں۔ یہ نیک و بد کسی کو نہیں چھوڑتے۔ ہم نے سفر کی مسنون دُعاؤں کا اہتمام کیا اور چل دیے۔ نعیم شاہد بڑے باہمت واقع ہوئے ہیں۔ جرات کے ساتھ ساتھ ان کی فراست سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ڈرائیونگ یہی کر رہے تھے۔ رتو ڈیرو کے بعد اندھیرا چھا چکا تھا لیکن ہم امروٹ شریف کی طرف محوِ سفر تھے۔ ہم ہر حال میں تاج الاولیاء حضرت مولانا تاج محمود امروٹی کے ہاں حاضری دینا چاہتے تھے کیونکہ ہالیجی شریف ہو یا بیر شریف ان کا سرچشمہ امروٹ شریف ہی ہے۔ پیر طریقت حضرت حماد اللہ ہالیجی شریف والے یہیں کے فیض یافتگان میں سے تھے۔ مغرب کے بعد ہم امروٹ گاؤں پہنچے۔ مسجد کے قدیم طرز کے مینار دور سے ہی نظر آ رہے تھے۔ نماز پڑھی۔ قدیم مسجد کی جگہ خوبصورت اور نقش و نگار سے مزین مسجد تعمیر ہو چکی ہے لیکن سامنے کی آدھی مسجد کو جوں کا توں رکھا گیا ہے۔

انگریز دور سے بھی پہلے سے قائم مسجد کے میناروں کو دیکھا۔ ان کے درمیانی جگہ میں مولانا عبیداللہ سندھی کا پریس ہوا کرتا تھا۔ سائیڈ میں تاج الاولیاء پیر طریقت حضرت تاج محمود امروٹی کا کمرہ تھا۔ ہم اس میں داخل ہوئے تو دل کی کیفیت ہی کچھ عجیب سی ہو گئی۔ ہمارے ساتھی احسان الحق تبسم صاحب تو آبدیدہ ہو گئے اور تاریخ دہرانے لگے۔ حضرت مفتی صاحب اور بھائی نعیم شاہد

بھی اس عجیب کیفیت پر حیران تھے۔ ہم تو زندگی میں پہلی دفعہ قدیم خانقاہوں اور اولیاء اللہ کے
مزاروں پر حاضری دے رہے تھے۔ ہانکی شریف، بیر شریف اور امروٹ شریف میں ایک بات
قدرِ مشترک یہ تھی کہ شرک و بدعت اور مروّجہ خرافات بالکل نہ تھیں۔ سادگی اور محبت ٹپک رہی تھی۔
عام و خاص سب کے لیے دروازے کھلے تھے۔ سہ روزہ دورے میں جو لطف ہمیں ان قدیم اولیاء
اللہ کی زیارات میں آیا اور جو کچھ حاصل کیا، اس پر ان شاء اللہ پھر کبھی تفصیل سے لکھیں گے۔ سر
دست ہم نے پاکستان بھر کی 54 خانقاہوں کی جو تفصیلات جمع کی ہیں۔ وہ حاضر ہیں۔

ذکر اکابر مشایخ کا:

یوں تو پاکستان میں بے شمار ''اولیاء اللہ'' ہیں اور خانقاہوں کی بھی کمی نہیں ہے، لیکن ہم ملک
بھر کے چند اکابر مشایخ کے مشہور خلفاء کے نام، سلسلہ اور ایڈریس تحریر کرنے پر اکتفا کریں گے۔
یہ تمام اسمائے گرامی حروف تہجی کی ترتیب سے صوبہ وار لکھے گئے ہیں۔ پہلے پنجاب، پھر خیبر پختونخوا
وا آزاد کشمیر، اس کے بعد سندھ اور آخر میں بلوچستان کے اکابر مشایخ کا ذکر ہے۔

(1) مولانا ابوالحسن صاحب۔ ان کا سلسلہ چشتیہ ہے۔ یہ گوجر خان، راولپنڈی میں ہیں۔
(2) مولانا احسان الحق صاحب۔ ان کا سلسلہ چشتیہ ہے۔ یہ مدرسہ عربیہ، تبلیغی مرکز رائے ونڈ میں
ہیں۔ (3) مولانا ارشاد احمد صاحب ان کا سلسلہ چشتیہ ہے۔ یہ دار العلوم کبیر والا میں ہیں۔ (4)
مولانا سید جاوید حسین شاہ صاحب۔ ان کا سلسلہ قادریہ ہے۔ یہ جامعہ عبیدیہ، علامہ اقبال کالونی
نزد پانی والی ٹینکی، فیصل آباد میں ہیں۔ (5) مولانا حامد حسن صاحب۔ ان کا سلسلہ چشتیہ ہے۔ یہ
دار العلوم، کبیر والا میں ہیں۔ (6) مولانا حبیب الرحمٰن درخواستی صاحب۔ ان کا سلسلہ قادریہ
ہے۔ یہ جامعہ عبداللہ بن مسعود، خان پور میں ہیں۔ (7) مولانا خلیل احمد صاحب۔ ان کا سلسلہ
نقشبندیہ ہے۔ یہ خانقاہ سراجیہ، کندیاں شریف، میانوالی میں ہیں۔ (8) پیر حافظ ذوالفقار
صاحب۔ ان کا سلسلہ نقشبندیہ ہے۔ یہ معہد الفقیر الاسلامی، جھنگ میں ہیں۔ (9) مولانا سیف
الرحمٰن قاسم صاحب۔ ان کا سلسلہ نقشبندیہ ہے۔ یہ گوجرانوالہ میں ہیں۔ (10) مولانا عبدالرحمٰن
صاحب۔ ان کا سلسلہ چشتیہ ہے۔ یہ جامعہ اشرفیہ لاہور میں ہیں۔

(11) مولانا عبدالقدوس ترمذی صاحب۔ ان کا سلسلہ چشتیہ ہے۔ یہ ساہیوال، تحصیل سلانوالی، سرگودھا میں ہیں۔ (12) مولانا عبدالماجد صدیقی صاحب۔ ان کا سلسلہ نقشبندیہ ہے۔ یہ خانقاہ مالکیہ نقشبندیہ، ایک مینار مسجد، خانیوال میں ہیں۔ (13) مولانا عبدالمجید صاحب۔ ان کا سلسلہ چشتیہ ہے۔ یہ جامعہ اسلامیہ باب العلوم، کہروڑپکا میں ہیں۔ (14) مولانا عتیق صاحب۔ ان کا سلسلہ چشتیہ ہے۔ یہ جامعہ عبداللہ بن عمر، لاہور میں ہیں۔ (15) مولانا عزیز احمد بہلوی صاحب۔ ان کا سلسلہ قادریہ ہے۔ یہ شجاع آباد، ملتان میں ہیں۔ (16) مولانا عزیز الرحمن صاحب۔ ان کا سلسلہ چشتیہ ہے۔ یہ مسجد صدیق اکبر، نزد چوڑہ چوک، راولپنڈی میں ہیں۔ (17) مولانا فضل الرحیم صاحب۔ ان کا سلسلہ چشتیہ ہے۔ یہ جامعہ اشرفیہ لاہور میں ہیں۔ (18) مولانا محمد ارشد الحسینی صاحب۔ ان کا سلسلہ قادریہ ہے۔ یہ خانقاہ مدنی، اٹک میں ہیں۔ (19) مولانا محمد حسن صاحب۔ ان کا سلسلہ چشتیہ ہے۔ یہ جامعہ مدنیہ محمد آباد المعروف ٹبہ، رائے ونڈ روڈ لاہور میں ہیں۔ (20) مفتی محمد رضوان صاحب۔ ان کا سلسلہ چشتیہ ہے۔ یہ ادارہ غفران، چاہ سلطان، گلی نمبر 16، عقب مین پٹرول پمپ، راولپنڈی میں ہیں۔

(21) مولانا صوفی محمد سرور صاحب۔ ان کا سلسلہ چشتیہ ہے۔ یہ جامعہ اشرفیہ، لاہور میں ہیں۔ (22) مفتی محمد طیب صاحب۔ ان کا سلسلہ چشتیہ ہے۔ یہ جامعہ امدادیہ، محمد آباد، فیصل آباد میں ہیں۔ (23) مولانا محمد قاسم منصور صاحب۔ ان کا سلسلہ نقشبندیہ ہے۔ یہ جامع مسجد اسامہ بن زید، G-8/2 نزد ٹیپو مارکیٹ اسلام آباد میں ہیں۔ (24) مولانا محمود میاں صاحب۔ ان کا سلسلہ چشتیہ ہے۔ یہ جامعہ مدنیہ جدید، لاہور میں ہیں۔ (25) مولانا مسعود احمد صاحب۔ ان کا سلسلہ قادریہ ہے۔ یہ دین پور، خان پور میں ہیں۔ (26) مولانا مظہر اسعدی صاحب۔ ان کا سلسلہ چشتیہ ہے۔ یہ جامعہ اسعد، بہاولپور میں ہیں۔ (27) مولانا منظور صاحب۔ ان کا سلسلہ چشتیہ ہے۔ یہ خیر المدارس، ملتان میں ہیں۔ (28) مولانا نذر الرحمن صاحب۔ ان کا سلسلہ نقشبندیہ ہے۔ یہ مدرسہ عربیہ، تبلیغی مرکز رائے ونڈ میں ہیں۔ (29) مولانا نواز صاحب۔ ان کا سلسلہ قادریہ ہے۔ یہ جامعہ قادریہ حنفیہ، ملتان میں ہیں۔ (30) مفتی اعزاز الحق صاحب۔ ان کا سلسلہ

نقشبندیہ ہے۔ یہ شاہ منصور، صوابی میں ہیں۔

خانقاہوں کی تفصیلات:

(31) مفتی سعید اللہ شاہ صاحب۔ ان کا سلسلہ چشتیہ ہے۔ یہ پشاور صدر میں ہیں۔
(32) عبدالعلیم دیر بابا صاحب۔ ان کا سلسلہ قادریہ ہے۔ یہ دارالعلوم حقانیہ، اکوڑہ خٹک میں ہیں۔ (33) قاضی عبدالکریم صاحب۔ ان کا سلسلہ چشتیہ ہے۔ یہ کلاچی ڈیرہ میں ہیں۔ (34) مولانا محمد یوسف صاحب۔ ان کا سلسلہ نقشبندیہ ہے۔ یہ پلندری، آزاد کشمیر میں ہیں۔ (35) مولانا محمود الحسن صاحب۔ ان کا سلسلہ چشتیہ ہے۔ یہ جامع مسجد ابوھریرہ، رنجانہ، محلہ صادق آباد، آزاد کشمیر میں ہیں۔ (36) مولانا مختار الدین شاہ صاحب۔ ان کا سلسلہ چشتیہ ہے۔ یہ جامع مسجد زکریا، کربوغہ شریف، کوہاٹ میں ہیں۔ (37) مولانا سید حکیم اختر شاہ صاحب۔ ان کا سلسلہ چشتیہ ہے۔ یہ خانقاہ امدادیہ، گلشن اقبال، کراچی میں ہیں۔ (38) مفتی تقی عثمانی صاحب۔ ان کا سلسلہ چشتیہ ہے۔ یہ دارالعلوم کراچی میں ہیں۔ (39) مولانا حبیب الرحمٰن سومرو صاحب۔ ان کا سلسلہ چشتیہ ہے۔ یہ جہان سومرو، ٹنڈو محمد خان میں ہیں۔ (40) مفتی رفیع عثمانی صاحب۔ ان کا سلسلہ چشتیہ ہے۔ یہ دارالعلوم کراچی میں ہیں۔
(41) مولانا سلیم اللہ خان صاحب۔ ان کا سلسلہ چشتیہ ہے۔ یہ جامعہ فاروقیہ، کراچی۔
(42) مفتی عبدالرحیم صاحب۔ ان کا سلسلہ چشتیہ ہے۔ یہ جامعۃ الرشید، احسن آباد، کراچی میں ہیں۔ (43) مفتی عبدالرؤف سکھروی صاحب۔ ان کا سلسلہ چشتیہ ہے۔ یہ دارالعلوم کراچی میں ہیں۔ (44) مولانا عبدالصمد صاحب۔ ان کا سلسلہ قادریہ ہے۔ یہ ہالیجی شریف، پنو عاقل، ضلع سکھر میں ہیں۔ (45) مولانا عبدالعزیز صاحب۔ ان کا سلسلہ قادریہ ہے۔ یہ پیر شریف، لاڑکانہ میں ہیں۔ (46) مفتی عبداللہ برمی صاحب۔ ان کا سلسلہ چشتیہ ہے۔ یہ دارالعلوم کراچی میں ہیں۔ (47) مولانا محمد حسن صاحب۔ ان کا سلسلہ قادریہ ہے۔ یہ شاہ پور چاکر، ضلع نواب شاہ میں ہیں۔ (48) مولانا محمود اشرف عثمانی صاحب۔ ان کا سلسلہ چشتیہ ہے۔ یہ دارالعلوم کراچی میں ہیں۔ (49) آغا شریف الدین صاحب۔ ان کا سلسلہ نقشبندیہ ہے۔ یہ مسلم باغ۔ (50) بادشاہ

آغا صاحب۔ ان کا سلسلہ نقشبندیہ ہے۔ یہ مسلم باغ میں ہیں۔ (51) مولانا محب اللہ صاحب۔ ان کا سلسلہ نقشبندیہ ہے۔ یہ لورالائی، بلوچستان میں ہیں۔'' مزید خانقاہوں اور اولیاء اللہ کی تفصیلات نہیں مل سکیں۔

مشن کی تکمیل کے دن:

ہر ادارہ اپنی تشہیر پر از حد زور دے رہا ہے۔ ایک فیکٹری اگر کوئی چیز تیار کرتی ہے تو مارکیٹ میں شہرت پہلے پہنچتی ہے، چیز کا وجود بعد میں۔ ہمارے ملک کے عصری تعلیمی اداروں میں اگر کوئی طالب علم یا طالبہ خوش قسمتی سے ٹاپ کر لیتے ہیں تو بڑے بڑے بینرز اور سائن بورڈوں پر ان کی تصاویر، اسکول، کالج کا تعارف اور دوسرے طلبہ وطالبات کو راغب کرنے والے جملوں پر مشتمل تحریریں مہینوں آویزاں رہتی ہیں۔ صرف ایک جگہ نہیں کئی کئی مقامات پر انہیں آویزاں کیا جاتا ہے۔ اخبارات میں اشتہارات دیے جاتے ہیں۔ پمفلٹ بانٹے جاتے ہیں۔ اگر کسی پوزیشن ہولڈر کو وقت کے وزیر اعظم، صدر یا کوئی بھی سرکاری شخصیت شیلڈ پکڑا دیں تو متعلقہ ادارے، اساتذہ اور طلبہ اپنے لیے اسے ''سب سے بڑا'' اعزاز سمجھتے ہیں۔ تصویریں بنتی ہیں۔ اخبارات ورسائل میں چھپتی ہیں اور دوسرے حضرات اور معاصر ادارے دانتوں میں اُنگلیاں دابے حیرت کا بُت بنے اسے تکتے رہتے ہیں۔ ایک طرف خوشی کی انتہا ہوتی ہے تو دوسری طرف حیرت واستعجاب اور حسرت کی انتہا۔ کارکردگی ہو تو تشہیر بھی بھلی لگتی ہے، لیکن عموماً دیکھا یہ گیا ہے کارکردگی سے تشہیر زیادہ ہوتی ہے۔ اگر یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ کارکردگی کے بجائے شہرت ہی کو منزل مقصود سمجھا جا رہا ہے۔

اسی طرزِ عمل کی بنا پر ہمارے معاشرے کا مزاج یہ بن چکا ہے۔ جس کی شہرت سنی اسی کے پیچھے چل پڑے۔ اصل، نقل اور کھرے کھوٹے کو پرکھے بغیر شہرت ہی کو سند اور مشہور کو مستند گردانا جاتا ہے۔ اس غلط طرزِ عمل کا نقصان یہ ہونے لگا ہے ہمارا معاشرہ کھوکھلا ہوتا جا رہا ہے۔ مارکیٹ کھوکھلی اور غیر معیاری اشیا کی بھرمار سے اَٹ چکی ہے۔ غیر معتبر افراد، غیر معتبر ادارے نمایاں جبکہ معتبر افراد اور ادارے گرد کی تہہ میں گمنام ہوتے جا رہے ہیں۔

جب کھرے کھوٹے، سچ جھوٹ، صحیح اور غلط کے مابین حد فاصل اور لکیر موجود تھی۔ معاشرہ اسی فرق و امتیاز کا لحاظ رکھتے ہوئے جانبِ منزل رواں دواں تھا، تب تو اپنی کارکردگی کسی کو دکھانے کی نوبت ہی نہ آتی تھی۔ سب جانتے تھے کہ خالص چیز کہاں ملتی ہے، معتبر شخص کون ہے، معیار کس ادارے کا صحیح ہے، امانت دار شخص کون ہے؟

وطنِ عزیز پاکستان میں جہاں دیگر ادارے، تنظیمیں، جماعتیں، انجمنیں اور افراد اپنے کام میں مگن ہیں تو ساتھ ہی دینی مدارس کا بھی ایک جال بچھا ہوا ہے۔ اپنی اپنی بساط کے مطابق چھوٹے بڑے دینی مدارس، مساجد اور ان سے وابستہ حضرات اپنے مشن کی تکمیل میں مصروف عمل ہیں۔

جب تک معاشرے میں سچ اور جھوٹ، صحیح اور غلط، حق اور باطل کے درمیان خطِ امتیاز برقرار تھا، تب تک مدارس اور اہلِ مدارس کو اپنی کارکردگی کی تشہیر کی ضرورت نہ تھی۔ ہر کوئی جانتا تھا کہ ہمارا معاشرہ مدارس کے بغیر ناخواندہ رہ جائے گا۔ معاشرے کی شرح خواندگی میں اضافے کے لیے مدارس کا کردار مسلّم سمجھا جاتا تھا۔ اپنے بھی اس کے قائل تھے اور غیر بھی معترف لیکن زمانے کے ساتھ ساتھ جب حالات کا رُخ پلٹا۔ مادیت، شہرت اور حبِ جاہ و مال کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگا تو صحت مند معاشرہ اس کی ظالمانہ گرفت میں بے بس ہو کر رہ گیا۔

ذرائع ابلاغ کے دوش پر:

مزید یہ کہ مدارس کی کردارکشی کی جانے لگی۔ ان کے خلاف چھوٹی بڑی ہر طرح کی زبانیں کھلنے لگیں اور ان اداروں کو عضوِ معطل قرار دیا جانے لگا تو اس پروپیگنڈے کی گرد میں مدارس اور ان کی سنہری تاریخ دب کر رہ گئی۔ اہلِ مدارس کا اخلاص دیکھیے ان حالات میں بھی اپنی تشہیر اور درستگیٔ کردار و عمل کو گھر گھر شہرت دینے کے درپے ہونا نامناسب ہی سمجھتے رہے۔ اکابر علمائے کرام اب بھی اپنی اور اپنے مدارس کی شہرت سے دور ہی رہنا پسند کرتے ہیں لیکن کیا کیا جائے جوانی کے لہو کا۔ آخر اسے بھی تسکین کا سامان چاہیے جس کا تقاضا تو یہ تھا مدارس کے خلاف لکھنے والی اُنگلیاں کاٹ دی جاتیں۔

چونکہ مدارس کی دنیا میں بسنے والی نوجوان نسل دینِ محمدی کی حامل ہے لہٰذا اسے اپنی جوانی کے

جنون کو قابو میں رکھنا پڑا اور طے یہ کیا گیا مدارس کے خلاف مانندِ سیلاب بڑھنے والے طوفان کے سامنے بایں طور سدِ سکندری بنا جائے کہ اپنی کارکردگی اور اپنی محنت و کوشش کو ذرائع ابلاغ کے دوش پر رکھ کر عوام کی عدالت میں لایا جائے تاکہ جہاں مخالف سمت سے آنے والی آندھی نے ان کے قلوب و اذہان کو مدارس کے بارے میں جو پراگندہ کر رکھا اس کا کچھ نہ کچھ تدارک ہو سکے۔ ایسے مدارس کی تعداد بھی کسی طرح کم نہیں جو عشروں سے شہر شہر، قصبے قصبے کام کر رہے ہیں لیکن ان کی انتظامیہ نے انہیں کسی بورڈ میں رجسٹرڈ نہیں کرایا۔

ہمیں یاد ہے 2001ء دسمبر میں پنجاب حکومت نے پنجاب کے 8 بڑے شہروں میں قائم مدارس کا جائزہ لیا تھا، اس جائزے میں پتہ چلا صرف لاہور، گوجرانوالہ، راولپنڈی، فیصل آباد، سرگودھا، ملتان، ڈی جی خان اور بہاولپور میں 2 ہزار 595 مدارس ہیں جن میں دو لاکھ 52 ہزار 125 طالب علم پڑھ رہے ہیں۔ لاہور میں دیوبندی، بریلوی اور اہل حدیث کے 356 مدارس ہیں۔ گوجرانوالہ میں 154، راولپنڈی میں 186، فیصل آباد میں 124، سرگودھا میں 164، ملتان 363، ڈی جی خان میں 397 اور بہاولپور میں 971 مدارس قائم ہیں۔ ابھی سرحد، بلوچستان اور سندھ میں مدارس باقی تھے کہ حکومت کو مدارس کی طرف سے شدید ردِعمل کا سامنا ہوا اور اس نے سروے کا کام روک دیا۔ اس وقت کراچی سے پشاور تک 12 ہزار سے زائد دینی مدارس ”وفاق المدارس العربیہ“ سے ملحق ہیں۔

خیر کے کاموں کا تسلسل:

دینی مدارس اور ان اداروں کا کام دیکھیں اور حکومت کے پاس رجسٹرڈ ولایتی این جی اوز کے کارناموں کا جائزہ لیں تو آپ کو زمین آسمان کا فرق ملے گا۔ اس وقت پاکستان میں ایک لاکھ این جی اوز رجسٹرڈ ہیں۔ یہ این جی اوز ہر سال ساڑھے تین کروڑ ڈالر امداد لیتی ہیں لیکن یہ ساری رقم کہاں جاتی ہے کچھ پتہ نہیں۔ ان کے مقابلے میں ہزار کے قریب دینی رفاہی ادارے کام کر رہے ہیں۔ حکومت پاکستان ہر سال یہ اعلان کرتی ہے پاکستان میں معیار تعلیم میں اضافہ ہو رہا ہے، شرح خواندگی بھی بڑھ رہی ہے۔ حکومت کے یہ دعوے ٹھیک ہیں۔ ہم نے دس برس میں شرح

خواندگی میں دس فیصد اضافہ کیا۔ اب پاکستان کے 45 فیصد لوگ پڑھے لکھے ہیں لیکن کوئی شخص اس امر پر غور نہیں کرتا یہ شرح حاصل کرنے کے لیے قوم نے پچھلے 60 برسوں میں کتنا سرمایہ خرچ کیا؟ یہ شرح حاصل کرنے کے لیے کتنا بڑا نظام کام کر رہا ہے جبکہ اس کے مقابلے میں مدارس ہیں جو سرکاری اور غیر ملکی امداد کے بغیر تعلیم سے محروم بچوں کو تعلیم دیتے ہیں۔

آپ امریکا کی مثال لے لیں۔ ایک رپورٹ کے مطابق اس وقت امریکا میں مسلمانوں کے 165 مدارس ہیں۔ یہ مدارس بھی امریکی امداد کے بغیر چل رہے ہیں اور ان مدارس میں دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ جدید عصری تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ خود امریکا کا کہنا ہے: ''ہم حیران ہیں یہ ادارے کیسے چل رہے ہیں اور یہ اتنے نظم وضبط اور کامیابی سے کیسے آگے بڑھ رہے ہیں؟'' امریکیوں کی پریشانی بجا ہے، خود پاکستان کے اندر 24 بڑے اور دو تین لاکھ چھوٹے ادارے ہیں۔

آج تک کسی نے غور نہیں کیا یہ مدارس کس خوبی سے چل رہے ہیں؟ ملک میں کس انقلاب کی بنیاد رکھ رہے ہیں؟ آپ ملک کے طول وعرض پر قائم اسکولوں کا جائزہ لیں آپ کو ایسے سینکڑوں اسکول اور کالج ملیں گے جو بنے اور بعد ازاں بند ہو گئے لیکن آپ کو پورے ملک میں کوئی ایسا مدرسہ نظر نہیں آئے گا جو ایک بار قائم ہوا اور پھر تھوڑے عرصہ بعد بند ہو گیا۔ یہ ایک ایسا خیر کا کام ہے جس جگہ ایک بار اس کا بیج پڑ گیا بس اس کے بعد دنیا کی کوئی طاقت اسے تناور درخت بننے سے نہیں روک سکتی۔ ہمارے سامنے ایسی ہزاروں مثالیں ہیں۔

کسی صبح کسی باریش شخص نے زمین کا کوئی ٹکڑا صاف کیا، اس پر کھردری چٹائی بچھائی، اس چٹائی پر کسی بچے کو بٹھایا اور اس سے کہا: ''پڑھو بیٹے: ''الف با تا...... الف لام میم'' اور پھر دنیا نے چٹائی کے آگے بنیادیں کھدتے، بنیادوں کو دیواریں بنتے اور دیواروں پر چھت پڑتے دیکھا اور پھر سال دو سال بعد اس جگہ سینکڑوں بچوں کو قرآن مجید پڑھتے اور اپنے رب کا شکر ادا کرتے پایا۔ دنیا آج تک معلوم نہیں کر سکی، چٹائی سے عمارت تک کا یہ سفر کیسے طے ہوا؟ وہ کون لوگ ہیں جنہوں نے مدرسے کی تعمیر کے لیے رقم اور وقت دیا؟

یہ اللہ کا کرم ہے، یہ خیر کے کاموں کا کمال ہے۔ آج کے دور میں بھی جب حکومت اعلیٰ تعلیم

کے صرف 196 منصوبوں کے لیے 11 ارب روپے مختص کرتی ہے اس وقت وہ پورے ملک کے مدرسوں کے لیے محض ایک ارب کا بجٹ رکھتی ہے۔ آج کے دور میں بھی جب ملک میں تعلیم کی مد میں ڈیڑھ کھرب روپے رکھے جاتے ہیں۔

اس وقت مدارس کے لاکھوں کروڑوں بچوں کے لیے صرف ایک ارب روپے کافی سمجھے جاتے ہیں۔ یہ ایک ارب روپے بھی حکومت نے 60 برسوں میں پہلی بار مختص کیے اور یہ بھی شاید ہی کسی مدرسے کو ملیں لیکن اس کے باوجود ان تمام مدارس کے پاس عمارتیں بھی ہیں، ہاسٹل بھی، اساتذہ بھی اور رقم بھی۔ یہ وہ تعلیمی ادارے ہیں جن میں طالب علموں کو کتابیں بھی مفت دی جاتی ہیں، انہیں رہائش اور تین وقت کا کھانا بھی مفت دیا جاتا ہے اور بعض اوقات کپڑے اور جوتے بھی جبکہ ان کے پاس آمدنی کا بھی کوئی باقاعدہ نیٹ ورک اور ذریعہ موجود نہیں، یہ کیا ہے؟ یہ معجزہ ہے؟ یہ برکت کا کمال ہے، پاکستان کے تعلیمی نظام کے پاس وسائل ہیں لیکن برکت نہیں جبکہ ان مدرسوں کے پاس برکت ہے لیکن وسائل نہیں، مگر ان اداروں نے ثابت کر دیا اگر کسی ادارے یا نظام کے پاس برکت ہو تو ان کے سامنے وسائل چھوٹے ہو جاتے ہیں، مال و دولت اور لمبے چوڑے نظام ہیچ ہیں۔

اس سب کے باوجود میڈیا خصوصاً مغربی ذرائع ابلاغ دینی مدارس کو بدنام کرنے پر تلا بیٹھا ہے۔ مثلاً 7 جولائی 2005ء کو لندن میں چار بم دھماکے ہوئے تھے۔ اس کے نتیجے میں 60 کے قریب لوگ مارے گئے جبکہ ایک ہزار لوگ زخمی ہوئے۔ ان بم دھماکوں کا الزام بھی پاکستان پر آگرا تھا۔ برطانیہ کے خفیہ اداروں نے چند دن کی فرضی تحقیقات کے بعد حکومتِ برطانیہ کو تجویز دی: جب تک پاکستان میں 18 اخبارات و رسائل، 152 کتابیں اور اڑھائی سو مدرسے موجود ہیں، دہشت گردی کا یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہے گا۔

ان اداروں کا کہنا تھا: پاکستان کے دینی مدرسے دہشت گرد پیدا کرنے کی فیکٹریاں ہیں چنانچہ اگر ہم اپنے شہریوں کی جانیں بچانا چاہتے ہیں تو پھر ہمیں یہ مدرسے بند کرانا ہوں گے۔ برطانوی حکومت نے یہ فیصلہ پاکستان پہنچا دیا اور اس کے بعد پاکستانی حکومت کو مناسب اقدامات پر مجبور

کرنے لگی۔ ہماری حکومت نے ماضی کی روایات کو سامنے رکھتے ہوئے برطانیہ کی مدد شروع کردی۔ حکومت نے مدرسوں میں موجود غیر ملکی طالب علموں کو نکالنے کا اعلان کردیا۔ مدرسوں کی رجسٹریشن اور اکاؤنٹس کی جانچ پڑتال کا حکم بھی جاری کردیا گیا۔ انٹیلی جنس کلیئرنس کا فیصلہ بھی ہوا تھا۔

ان اقدامات کے فوری طور پر دو نتائج نکلے: وہ تمام غیر ملکی کمپنیاں جو پاکستان کو سرمایہ کاری کے لحاظ سے ایک محفوظ اور روشن مستقبل ملک سمجھتی تھیں انہوں نے اپنا ہاتھ کھینچنا شروع کردیا۔ ان کمپنیوں نے اپنا غیر ملکی عملہ بھی واپس بلالیا اور بعض کمپنیوں نے ان تمام مقامی ورکروں کو نوکری سے جواب دینے کا فیصلہ کرلیا جو باریش ہیں اور نماز کی پابندی کرتے ہیں۔ یہ ایک غیر معمولی اور پریشان کن صورتِ حال تھی۔

اس نئی صورتِ حال کے شروع ہی میں ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف کے ریسرچ ونگ نے اپنا کام شروع کردیا۔ انہوں نے پاکستان میں موجود مدرسوں کے بارے میں تحقیقات شروع کردیں۔ ان تحقیقات کے لیے انہوں نے دو قسم کی ٹیمیں بنائیں: ایک ٹیم مقامی این جی اوز پر مشتمل تھی جبکہ دوسری ٹیم میں غیر ملکی محققین شامل تھے۔ یہ ادارے سب سے پہلے کسی ایک مدرسے کا تعین کرتے، اس کے بعد وہاں مقامی ٹیم بھجواتے۔ وہ ٹیم واپس آکر اپنی رپورٹ دے دیتی اور اس کے بعد غیر ملکی ماہرین کی ٹیم اس مدرسے کا دورہ کرتی۔

یہ فرق کیوں:

یہ ٹیم پرانی ٹیم کی رپورٹ کو سامنے رکھ کر اس مدرسے کا جائزہ لیتی اور آخر میں اپنی رپورٹ پیش کردیتی۔ ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف کی ان ٹیموں نے پاکستان کے اڑھائی سو مدرسوں کی حتمی رپورٹ بنا کر 30 جولائی 2005ء کو ورلڈ بینک کے حوالے کردی۔ ورلڈ بینک نے 2 اگست 2005ء کو یہ رپورٹ جاری کردی۔ یہ رپورٹ پوری دنیا کے لیے حیران کن تھی۔ اس رپورٹ میں تین انکشاف ہوئے تھے۔ مغربی دنیا کا میڈیا پاکستانی مدرسوں کے بارے میں شدید غلط فہمی اور مغالطے کا شکار ہے۔

مغربی میڈیا سنی سنائی اور غلط معلومات شائع اور نشر کررہا ہے۔ اس میڈیا کے پاس معلومات

نہیں ہیں۔ اس رپورٹ میں ورلڈ بینک نے امریکا کے دو بڑے اخبارات ''واشنگٹن پوسٹ'' اور ''انٹرنیشنل کرائسز گروپ'' کا خصوصی طور پر ذکر کیا۔ ماہرین کا کہنا تھا ان دونوں اخبارات نے آج تک جتنی خبریں اور تبصرے شائع کیے ہیں ان کا مواد غیر مصدقہ اور ادھورا تھا۔

ماہرین نے انکشاف کیا مغرب مدرسوں کے طالب علموں کی تعداد کے بارے میں بھی مبالغے کا شکار ہے۔ پاکستان میں صرف دو تین فیصد بچے مدرسوں میں داخل ہوتے ہیں، باقی بچے یا تو سرے سے تعلیم سے محروم ہیں یا پھر عام اور انگریزی اسکولوں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ پاکستان کا ہر بچہ نہ تو مذہبی تعلیم حاصل کرتا ہے اور نہ ہی وہ دہشت گرد ہے۔ اسی طرح پاکستان کے مدرسوں میں عسکری تعلیم نہیں دی جاتی۔ ان مدرسوں میں 90 فیصد ایسے طالب علم ہیں جنھوں نے پوری زندگی کوئی آتشیں اسلحہ نہیں دیکھا۔

یہ طالب علم اس قدر سادہ ہیں انہوں نے فلموں تک میں اسلحہ نہیں دیکھا۔ اس کی وجہ یہ ہے مدرسوں کے طالب علم فلمیں نہیں دیکھتے جبکہ ان کے مقابلے میں یورپ اور امریکا کا ہر بچہ آتشیں اسلحے کے بارے میں ٹھیک ٹھاک معلومات رکھتا ہے۔ مغرب کے یہ بچے کارٹون فلموں سے لے کر جنگی فلمیں تک دیکھتے ہیں لہٰذا وہ میزائل تک چلانے کی تکنیک سے واقف ہوتے ہیں۔ اس رپورٹ میں انکشاف ہوا: پاکستان کے اکثر مدرسوں کے بچے 5 زبانیں روانی سے بول سکتے ہیں۔

یہ بچے عربی، اردو، ایک مقامی زبان، انگریزی اور فارسی کے ماہر ہوتے ہیں۔

مدرسوں میں دو قسم کے طالب علم ہیں: ایک وہ طالب علم جو سرے سے انگریزی پڑھنا، لکھنا اور بولنا نہیں جانتے اور دوسرے وہ طالب علم جو فر فر انگریزی بولتے ہیں۔ انگریزی بولنے والے طالب علموں کی زبان اس قدر شاندار اور بامحاورہ ہوتی ہے اسے سن کر اپنے کانوں پر یقین نہیں آتا جبکہ ان کے مقابلے میں یورپ اور امریکا کے طالب علم زیادہ سے زیادہ دو زبانوں کا ادراک رکھتے ہیں۔ ان مدرسوں میں اگر کوئی چیز عسکریت کے قریب ہے تو وہ جسمانی ورزش ہے۔ اکثر مدرسوں کے طالب علموں کو منہ اندھیرے جگا دیا جاتا ہے، یہ بچے صبح کی نماز پڑھتے ہیں، اس کے بعد جسمانی ورزش کرتے ہیں یا پھر چہل قدمی کرتے ہیں۔ اگر یہ چیزیں جرم ہیں تو پھر یورپ اور

چین بھی مجرم ہیں۔

چین کے تمام بچے صبح سیر اور ورزش کرتے ہیں جبکہ یورپ اور امریکا کے 80 فیصد شہری اس "جرم" کے مرتکب ہوتے ہیں۔ ورلڈ بینک کی اس رپورٹ کے آخر میں ماہرین نے عالمی نشریاتی اداروں سے درخواست کی وہ پاکستان کے مدارس کے بارے میں رپورٹیں نشر کرنے سے پہلے پوری طرح تحقیق کر لیں کیونکہ کچی پکی رپورٹیں دینے سے جہاں مدرسوں کا تاثر خراب ہو رہا ہے وہاں ان نشریاتی اداروں کی مقبولیت اور ساکھ بھی متاثر ہو رہی ہے۔

برصغیر میں پہلی این جی او:

یہ ایک چشم کشا رپورٹ تھی۔ اس رپورٹ کے فوراً بعد دو قسم کے ردِعمل سامنے آئے۔ دنیا کی تمام بڑی میڈیا آرگنائزیشنز نے پاکستان کے مدرسوں کے بارے میں مفصل اور حقیقی رپورٹیں تیار کرنے کے لیے اپنی ٹیمیں پاکستان بھجوانا شروع کر دیں۔ یہ ٹیمیں کراچی، لاہور، کوئٹہ اور پشاور کے بڑے بڑے مدرسوں میں جاتی ہیں اور ان طالب علموں اور ان مدرسوں کے ماحول کے بارے میں فلمی اور قلمی رپورٹیں تیار کرتی ہیں۔ یہ لوگ طالب علموں کے انٹرویو بھی لیتے ہیں۔

پاکستان میں موجود یورپی سفارت خانوں کے نمائندوں نے بھی پاکستانی مدرسوں کے دورے شروع کر دیے ہیں۔ یہ لوگ بھی مدرسوں میں جاتے ہیں، مدرسوں کی انتظامیہ سے ملتے ہیں، وہاں کا ماحول دیکھتے ہیں، طالب علموں سے ملتے ہیں اور اپنے مشاہدات لکھ کر اپنی اپنی حکومتوں کو بھجوا دیتے ہیں۔ آپ مائیکل اسپینگلر کو لے لیجیے۔ مائیکل اسلام آباد کے امریکی سفارت خانے میں قونصل جنرل ہے۔ مائیکل بذاتِ خود مدارس کا دورہ کر رہا ہے۔

گزشتہ دنوں وہ پشاور میں دارالعلوم گیا اور وہاں اس نے نہ صرف انتظامیہ سے ملاقات کی بلکہ طالب علموں سے بھی ملا اور وہاں کا ڈسپلن اور طالب علموں کا اعتماد دیکھ کر حیران رہ گیا۔ عجیب بات ہے یہ لوگ جوں جوں مدرسوں کا دورہ کر رہے ہیں توں توں مدرسوں کے نظام اور انتظامات سے مطمئن ہو رہے ہیں۔ یہ ایک مثبت پیش رفت ہے۔ یہ پیش رفت ثابت کرتی ہے جس طرح ورلڈ بینک نے پاکستانی مدرسوں کو بے گناہ تسلیم کر لیا تھا اسی طرح تمام مغربی سفارت خانے اور ان

سفارت خانوں کے پیچھے موجود ممالک بھی ان مدرسوں کی کارکردگی کو مثبت تسلیم کرلیں گے۔شاید یہی وہ نقطہ ہو جو آنے والے دنوں میں مغرب اور مشرق کے درمیان پل بن جائے، جو تہذیبوں کو ٹکراؤ سے بچالے۔اس میں کوئی شک نہیں دینی مدارس سب سے بڑی این جی اوز ہیں۔

برصغیر پاک وہند میں مدارس پہلی ''این جی او'' ہیں۔ان مدارس نے نہ صرف لوگوں کو دین کی تعلیم دی بلکہ انہوں نے ان علاقوں میں روایتی تعلیم کا بندوبست بھی کیا جہاں اسکول کا تصور تک ممکن نہیں تھا۔ان مدارس نے معیارِ زندگی میں اضافے میں بھی بڑی بڑی خدمات سرانجام دیں۔یہ مدارس ہی ہیں جنہوں نے چوتھی صدی عیسوی کے معیارِ زندگی کے لوگوں کو پانی ابال کر پینے، رفع حاجت کے بعد صفائی، کپڑوں، چیزوں اور بستروں کو گندگی سے بچا کر رکھنے کا درس دیا۔جنہوں نے چھوٹے بڑے کے احترام، ناپ تول میں بے ایمانی سے بچاؤ، جھوٹ سے پرہیز اور سچ بولنے کی عادت ڈالی۔

یہ وہ این جی اوز ہیں جو پچھلے 1400 سال سے دنیا اور ایک ہزار برس سے برصغیر میں خدمات سرانجام دے رہی ہیں۔اس وقت بھی جب پاکستان میں 64 ارب روپے کا سالانہ بجٹ ملک میں تعلیمی انقلاب لانے میں پوری طرح ناکام رہا، اسکول، کالج اور یونیورسٹیاں تعلیم یافتہ شہری پیدا کرنے میں کامیاب نہیں ہورہیں۔

ہوشربا اعداد وشمار:

یہ مدارس ہی ہیں جو حکومت سے کسی قسم کی مالی اور انتظامی امداد لیے بغیر 25 سے 30 لاکھ طلبہ کو تعلیم بھی دے رہے ہیں، رہائش بھی اور کھانا بھی۔اس وقت ملک میں دینی اداروں کے پانچ بورڈ ہیں۔ان بورڈز میں 13 ہزار بڑے مدارس رجسٹرڈ ہیں۔ان 13 ہزار مدارس میں 30 لاکھ طالب علم پڑھتے ہیں جبکہ پورے ملک میں خواتین کے دس ہزار مدارس ہیں۔ان مدارس میں قرآن مجید حفظ کرایا جاتا ہے، اس کے ساتھ پرائمری، مڈل اور ہائی اسکول کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔

جمعیت تعلیم القرآن ٹرسٹ کی مثال لے لیجیے! اس ادارے کے ملک میں 1500 مدارس ہیں جن میں 637 مدارس ''آزاد کشمیر'' شمالی علاقہ جات اور پنجاب میں کام کر رہے ہیں۔یہ ملک بھر کی 60 جیلوں میں قیدیوں کے لیے ایک ہزار کلاسیں چلا رہا ہے۔یوں صرف ایک ٹرسٹ ایک

لاکھ طلبہ کو تعلیم دے رہا ہے۔ پچھلے ایک عشرے سے ملک بھر میں ''اقرأ'' طرز کے مدارس کام کررہے ہیں۔ ان مدارس کی تعداد بھی 20 ہزار سے زائد ہے۔ صرف کراچی شہر میں 10 ہزار ایسے مدارس ہیں جو دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ بچوں اور بچیوں کو پرائمری لیول کی تعلیم دیتے ہیں۔ مڈل لیول کے 8 ہزار دار العلوم ان کے علاوہ ہیں۔

اقرأ طرز کے مدارس میں ''اقرأ روضۃ الاطفال'' زیادہ معروف ہیں۔ خدام القرآن ایک ہزار سے زائد چھوٹے بڑے مدارس چلا رہی ہے۔ آپ کسی شہر میں چلے جائیں آپ کو وہاں ان جماعتوں کے مدارس ملیں گے۔ ایک اندازے کے مطابق وفاق المدارس میں دیو بندی مکتب فکر کے مجموعی طور پر تقریباً 8 ہزار 3 مدارس رجسٹرڈ ہیں، بریلویوں کے تنظیم المدارس میں 3 ہزار، جماعت اسلامی کے رابطۃ المدارس میں 600 اور اہل حدیث کے وفاق المدارس السلفیہ میں 430 مدارس رجسٹرڈ ہیں۔ یہ مدارس حفظ کے ساتھ ساتھ ایم اے تک تعلیم بھی دیتے ہیں جبکہ تمام مسجدوں میں جو چھوٹے بڑے مدارس قائم ہیں ان کی تعداد لاکھوں میں چلی جاتی ہے۔

ایسے مدارس کی تعداد بھی کسی طرح کم نہیں جو عشروں سے شہر شہر، قصبے قصبے کام کررہے ہیں لیکن ان کی انتظامیہ نے انہیں کسی بورڈ میں رجسٹرڈ نہیں کرایا۔ 2001ء دسمبر میں پنجاب حکومت نے پنجاب کے 8 بڑے شہروں میں قائم مدارس کا جائزہ لیا تھا۔ اس جائزے میں پتا چلا صرف لاہور، گوجرانوالہ، راولپنڈی، فیصل آباد، سرگودھا، ملتان، ڈی جی خان اور بہاولپور میں 2 ہزار 595 مدارس ہیں جن میں دو لاکھ 52 ہزار 125 طالب علم پڑھ رہے ہیں۔ لاہور میں دیوبندی، بریلوی اور اہل حدیث کے 356 مدارس ہیں، گوجرانوالہ میں 154، راولپنڈی میں 186، فیصل آباد میں 124، سرگودھا میں 164، ملتان 363، ڈی جی خان میں 397 اور بہاولپور میں 971 مدارس قائم ہیں۔

اپنے دل سے پوچھیے:

ان مدارس کے علاوہ پاکستان میں 2 ہزار کے قریب دینی رفاہی ادارے بھی کام کررہے ہیں۔ یہ ادارے بھی بنیادی طور پر مدارس ہی کی کوکھ سے پیدا ہوئے ہیں۔ یہ ادارے ملک بھر میں

رفاہی کام کرتے ہیں، اسپتال بناتے ہیں، فری ڈسپینسریاں چلاتے ہیں، ایمبولنس سروس، بلڈ بینک، پکی پکائی روٹی کے پلانٹ لگاتے ہیں، پل، سڑکیں اور نالیاں تک پکی کرتے ہیں۔ آپ ان اداروں کا کام دیکھیں اور حکومت کے پاس رجسٹر ولایتی این جی اوز کے کارناموں کا جائزہ لیں آپ کو زمین آسمان کا فرق ملے گا۔ بات ولایتی این جی اوز کی چلی ہے تو صرف پنجاب میں 65 ہزار رفاہی این جی اوز رجسٹر ہیں۔

یہ این جی اوز ہر سال تعلیم، صحت، ماحولیاتی آلودگی اور صفائی کے نام پر ملک اور بیرونِ ملک سے اربوں ڈالر حاصل کرتی ہیں لیکن یہ سرمایہ مظلوموں تک پہنچنے سے پہلے ہی غائب ہو جاتا ہے۔ ان این جی اوز کے بارے میں کینیڈا کے ایک ماہر نے کیا خوب کہا تھا: ''اب تک جو رقم یہ این جی اوز حاصل کر چکی ہیں۔ اگر گراؤنڈ پر اس کا دس فیصد بھی خرچ ہو جاتا تو پاکستان کا شمار ترقی یافتہ ممالک میں ہوتا۔'' کینیڈا کے ماہر کا تجزیہ سو فیصد درست ہے۔ واقعی پاکستان میں رجسٹرڈ این جی اوز کرپشن اور لوٹ کھسوٹ کا ایک ایسا کچرا گھر ہیں جو سڑاند پھیلانے کے سوا کچھ نہیں کرتا جبکہ اس کے مقابلے میں دینی رفاہی ادارے حکومت سے ایک پیسہ نہیں لیتے، اپنی مدد آپ یا لوگوں کے صدقات جمع کرتے ہیں اور پھر یہ رقم نہایت ایمانداری سے غریب عوام کی فلاح و بہبود پر خرچ کر دیتے ہیں۔ حکومت پاکستان ہر سال یہ اعلان کرتی ہے پاکستان میں معیارِ تعلیم میں اضافہ ہو رہا ہے، شرح خواندگی بھی بڑھ رہی ہے، حکومت کے یہ دعوے ٹھیک ہیں، ہم نے دس برس میں شرح خواندگی میں دس فیصد اضافہ کیا۔

اب پاکستان کے 45 فیصد لوگ پڑھے لکھے ہیں لیکن کوئی شخص اس امر پر غور نہیں کرتا کہ یہ شرح بڑھائی کس نے؟ یقین کیجیے شرح خواندگی میں اضافے کا سہرا مدارس کے سر بندھتا ہے۔ یہ وہ مدارس ہیں جو سرکاری اور غیر ملکی امداد کے بغیر تعلیم سے محروم بچوں کو روایتی اور دینی علم دیتے ہیں۔ آپ دیکھیے جس علاقے میں سرکاری اسکول قائم ہے آپ کو وہاں گرد و پیش میں غیر تعلیم یافتہ لوگ اور ان پڑھ بچے مل جائیں گے لیکن جس علاقے میں کوئی مدرسہ قائم ہو گا آپ کو وہاں خواندگی ملے گی، کیا کسی سرکاری بقراط نے کبھی اس پر غور کیا؟ آپ دلچسپ بات ملاحظہ کیجیے! ہماری حکومت

اور امریکا اس سلسلے کو بھی بند کرنا چاہتا ہے۔ وہ خیر کا یہ سلسلہ بھی منقطع کرنا چاہتے ہیں کیوں کرنا چاہتے ہیں؟ اس کا جواب آپ کو اپنے دل سے ملے گا، آپ ذرا اپنے دل سے پوچھ کر تو دیکھیے۔

پاکستان کی تاریخ میں علماء کا کردار:

اگر ہم پاکستان کی تاریخ میں علمائے کرام کے کردار کا مطالعہ کریں تو یہ بات بڑی واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ ہمارے علمائے کرام نے ہر موقع پر ملک وقوم کی فلاح اور بقاء کی جنگ لڑی۔ وہ ہمیشہ ملک وقوم کے ساتھ مخلص رہے۔ انہوں نے ہر دور میں ملک کی سلیت اور استحکام کے لیے قربانیاں دیں اور ان قربانیوں کے نتیجے میں ان کا امیج انتہائی شاندار رہا۔

یہ اس ملک کے علمائے کرام ہی تھے جن کے دم قدم سے پاکستان میں ڈاڑھی، جبے اور ٹوپی کو احترام کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ اگر ہم قیام پاکستان کے وقت کا مطالعہ کریں تو پتا چلتا ہے علمائے کرام نے پاکستان کے قیام میں بھی انتہائی اہم رول ادا کیا تھا۔ میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں جس طرح محمد علی جناح اور علامہ محمد اقبال نے پاکستان کے لیے جدوجہد کی اسی طرح ہمارے علما اور اکابرین نے بھی کوششیں کی تھیں۔ انہوں نے آزاد مملکت کے لیے ہر فورم پر آواز اٹھائی تھی اور وہ ہر محاذ پر دشمن سے لڑے تھے۔

اس میں کوئی شک نہیں اگر اس وقت یہ علمائے کرام تحریک پاکستان کا ساتھ نہ دیتے تو یہ تحریک شاید اتنی جلدی کامیاب ہوتی اور نہ ہی پاکستان کا خواب شرمندہ تعبیر ہوتا لہٰذا ہمارے اکابرین اور علمائے دین کی اس ملک کے لیے بے تحاشا خدمات ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو پاکستانی معاشرے میں علمائے کرام کو خاص مقام حاصل ہے۔ لوگ ان کی باتوں کو سنجیدگی سے بھی لیتے اور ان پر عمل بھی کرتے ہیں۔ چنانچہ معاشرے کو سنوارنے میں ان کا بڑا کردار ہے۔

میں سمجھتا ہوں پاکستان میں علمائے کرام کو جتنی عزت اور وقار حاصل ہے وہ دنیا کے کسی معاشرے میں نہیں لیکن بدقسمتی سے پچھلے چند برسوں میں علمائے کرام کے امیج کو بری طرح خراب کیا جارہا ہے۔ نائن الیون کے بعد مغربی میڈیا نے ان لوگوں کے خلاف محاذ کھول دیا اور انہیں پوری دنیا میں بدنام کر کے رکھ دیا۔ وہ علمائے کرام جو اقوام متحدہ کے اجلاس میں دنیا کو امن کا گہوارہ

بنانے کی تلقین کرتے تھے آج اس ملک میں انہیں دہشت گرد اور انتہا پسند ڈکلیئر کیا جا رہا ہے۔

ہر چرچ کے ساتھ اسکول کیوں؟

آپ اس بات سے اندازہ لگائیں نائن الیون کے بعد دنیا کے کسی کونے میں کوئی شخص قتل ہوا۔ کوئی بم دھماکا یا خودکش حملہ ہوا تو اس کی کڑیاں کسی نہ کسی طریقے سے پاکستان اور پاکستان کے علماء یا مذہبی طبقے سے ملانے کی کوشش کی گئی۔

گزشتہ دنوں امریکی وزیر خارجہ ہیلری کلنٹن نے کہا تھا: ''پاکستان کو تعلیمی شعبے میں بھی امداد دی جائے گی تاکہ یہ شعبہ مضبوط ہو اور بچے مدرسوں کا رُخ نہ کریں۔ ہیلری نے ان مدارس کو ہی خودکش حملوں کا ذمہ دار قرار دیا ہے۔ دینی مدارس حالات اور آج کی پیداوار نہیں ہیں۔ یہ اسلامی کلچر کا ناگزیر حصہ ہیں۔ یہ صدیوں سے چل رہے ہیں۔ ان مدارس کے فارغ التحصیل ہی اصل میں اسلام کی ترویج اور فروغ کے لیے اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ اسلام امن کا مذہب اور امن کا درس دیتا ہے۔ اس میں شدت پسندی کا شائبہ تک نہیں تاہم دفاع کے لیے جہاد کا حکم ضرور ہے اور جہاد ہر مسلمان کے ایمان کا حصہ ہے۔ خواہ وہ مدرسے سے نکلا ہو یا کالج سے۔ جب جنگ مسلط ہو تو دفاع کے لیے ہر حربہ اور حکمت عملی بروئے کار لائی جاتی ہے۔

خودکش حملوں کا سلسلہ افغانستان اور عراق میں امریکا اور اس کے اتحادیوں کے غاصبانہ قبضے اور معصوم لوگوں کے خون کی ندیاں بہانے کے باعث شروع ہوا ہے۔ پاکستان میں امریکی ڈرون حملوں کی وجہ سے خودکش بمبار پیدا ہوئے، نتیجتاً لوگوں کے پاس جیسے تیسے امریکا کا مقابلہ کرنے کے لیے یہی ایک موثر ہتھیار تھا۔ مسلمان کے لیے دین اور جہاد کی تعلیم تو ماں کی گود سے شروع ہو جاتی ہے۔ مدارس اور اسکول کی تعلیم کا دوسرا زینہ ہیں۔ امریکا مدارس بند کرانے کے لیے ڈالروں کے انبار بھی لگا دے تو بھی اپنے عزائم میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ برصغیر میں ہر چرچ کے ساتھ ایک اسکول بھی قائم کر دیا جاتا تھا۔ ہیلری بتائیں اس کو کیا نام دیا جائے؟ کیا وہاں بھی شدت پسند پیدا ہوتے تھے؟ پاکستان میں آج بھی ہر چرچ کے ساتھ ایک اسکول ہے جس میں مسلمان بچے بھی خوشی سے پڑھتے ہیں مگر کسی پاکستانی نے انہیں بند کرانے کا مطالبہ نہیں کیا۔ مدارس میں آج

کل دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ جدید تعلیم بھی دی جاتی ہے۔اس پر کیوں اعتراض کیا جاتا ہے؟

''سائلنس آپریشن'':

سوال یہ ہے آج تک جتنے خودکش ہوئے ہیں کیا وہ مدارس کے طلبہ نے کیے ہیں؟ آپ صرف 2007ء میں پاکستان میں ہونے والے خودکش حملوں کا جائزہ لیجیے۔ 2007ء میں 169 خودکش حملے ہوئے۔ان حملوں میں 9 سو سے زائد لوگ جاں بحق اور 2 ہزار سے زائد افراد زخمی ہوئے۔2007ء کے پہلے ہی ماہ میں چار خودکش دھماکے ہوئے۔

پہلا خودکش دھماکا ''میر علی'' میں ہوا۔اس دھماکے میں چار فوجی جوانوں سمیت ایک عورت جاں بحق ہوئی۔26 جنوری کو اسلام آباد میں میریٹ ہوٹل کے سامنے خودکش دھماکا ہوا جس میں ایک سیکورٹی اہلکار جاں بحق اور 5 راہگیر زخمی ہوئے۔27 جنوری کو پشاور کے قصہ خوانی بازار میں خودکش حملہ ہوا۔اس حملے میں ایک ڈی آئی جی، ایک ڈی ایس پی، دو ناظمین سمیت 3 شہری جاں بحق اور 30 سے زائد افراد زخمی ہوئے۔

اس ماہ کا آخری دھماکا 29 تاریخ کو ڈیرہ اسماعیل خان میں ایک چیک پوسٹ کے قریب ہوا جس میں دو پولیس اہلکار جاں بحق ہوئے۔فروری کے مہینے میں 3 خودکش حملے ہوئے۔3 فروری کو ٹانک میں ایک فوجی گاڑی کو نشانہ بنایا گیا۔6 فروری کو اسلام آباد ائرپورٹ کے باہر دھماکا ہوا۔ تیسرا حملہ 17 فروری کو کوئٹہ میں سول جج کی عدالت میں ہوا جس میں سول جج اور 6 وکلاء سمیت 17 سے زائد افراد جاں بحق ہوئے تھے۔اسی طرح 29 مارچ کو کھاریاں میں فوجی چھاؤنی کے قریب دھماکا ہوا۔

28 اپریل کو چارسدہ میں خودکش حملہ ہوا اور اس حملے میں 31 افراد زندگی کی بازی ہار گئے جبکہ آفتاب احمد خان شیر پاؤ اور ان کا بیٹا زخمی ہوگئے تھے۔15 مئی کو پشاور میں ایک ہوٹل پر خودکش حملہ ہوا تھا جس میں 25 افراد جاں بحق ہوگئے۔28 مئی کو بنوں میں ایک خودکش حملہ آور نے اپنی گاڑی فرنٹیئر کانسٹیبلری کی گاڑی سے ٹکرا دی۔جولائی خودکش حملوں کے حوالے سے انتہائی مہلک ثابت ہوا۔اس کی وجہ اسلام آباد کا ''سائلنس آپریشن'' بتایا جاتا ہے۔

سی آئی اے اور مدارس:

4 جولائی کو میران شاہ سے بنوں آنے والے ایک فوجی قافلے پر حملہ ہوا۔ 6 جولائی کو مالاکنڈ میں ایک پل کے قریب خودکش حملہ ہوا۔ 12 جولائی کو میرانشاہ میں پولیٹیکل ایجنٹ کے دفتر، 15 جولائی کو سوات اور ڈیرہ اسماعیل خان، 17 جولائی کو شمالی وزیرستان میں کھجوری چیک پوسٹ پر اور 18 جولائی کو اسلام آباد ڈسٹرکٹ بار میں سابق چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کی آمد پر وکلا کنونشن میں خودکش حملہ ہوا۔

اسی طرح 19 جولائی کو مینگورہ، کوہاٹ اور حب میں، 20 جولائی کو میرانشاہ چیک پوسٹ پر، 27 جولائی کو آبپارہ مارکیٹ اسلام آباد، 2 اگست کو سرگودھا، 4 اگست کو پاراچنار، 17 اگست کو ٹانک، 20 اگست کو ہنگو چیک پوسٹ، 24 اگست کو میر علی میں قمر چیک پوسٹ پر، 26 اگست کو ضلع شانگلہ، یکم ستمبر کو باجوڑ اور جنڈولہ میں۔ 4 ستمبر کو راولپنڈی، 10 ستمبر کو ڈیرہ غازی خان، 11 ستمبر کو ڈیرہ اسماعیل خان، 13 ستمبر کو تربیلا غازی، یکم اکتوبر کو بنوں چیک پوسٹ پر اور 18 اکتوبر کو بے نظیر بھٹو کی کراچی آمد پر خودکش حملے ہوئے۔ 19 اکتوبر کو ڈیرہ اسماعیل خان اور پشاور، 20 اکتوبر کو ڈیرہ بگٹی، 23 اکتوبر کو مالاکنڈ میں فوجی قافلے پر۔

24 اکتوبر کو سوات اور میرانشاہ میں فوجی قافلے پر۔ 25 اکتوبر کو ایف سی کے ایک ٹرک پر خودکش حملہ ہوا جس میں 21 لوگ مارے گئے۔ یکم نومبر کو سرگودھا میں فیصل آباد روڈ پر ایک بس میں۔ 9 نومبر کو پشاور میں امیر مقام کے گھر کے سامنے اور 24 نومبر کو راولپنڈی میں دو مختلف جگہوں پر خودکش حملے ہوئے جن میں 62 سے زائد افراد جاں بحق ہوئے۔ 4 دسمبر کو پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار ایک خاتون نے خودکش حملہ کیا۔ 9 دسمبر کو سوات میں، 10 دسمبر کو کامرہ میں، 13 دسمبر کو کوئٹہ آرمی چیک پوسٹ کے قریب، 15 دسمبر کو نوشہرہ میں، 17 دسمبر کو کوہاٹ آرمی پبلک کالج میں، 23 دسمبر کو مینگورہ میں اور 27 دسمبر کو راولپنڈی میں محترمہ بے نظیر بھٹو کے جلسے میں خودکش حملے ہوئے جس میں 22 افراد جاں بحق اور 50 سے زائد زخمی ہوئے۔

یہ دھماکے کون کر رہے ہیں؟ آج تک پاکستان کی کسی ایجنسی کی طرف سے اس کی کوئی رپورٹ

سامنے آئی اور نہ ہی کسی عالمی ادارے نے اس کی تحقیق کی لیکن ہر دھماکے کے بعد کوئی خفیہ ہاتھ میڈیا کے ذریعے ان خودکش حملوں کا ذمہ دار مذہبی طبقات کو ٹھہرا دیتے ہیں۔ اور پھر مدارس پر چھاپے شروع ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ انٹرنیٹ ویب سائٹ ''وکی لیکس'' اپنی رپورٹوں میں متعدد بار کہہ چکی ہے ''سی آئی اے پاکستان میں دہشت گردی کروا رہی ہے۔'' وکی لیکس نے ایک ماہ قبل 90 ہزار خفیہ دستاویزات شائع کی تھیں جس سے سامراجی طاقتوں کا مکروہ چہرہ کھل کر سامنے آ گیا تھا۔ اب 27 اگست 2010ء کو ایک دفعہ پھر باقی ماندہ 15 ہزار میں سے ایک خفیہ رپورٹ شائع کی ہے۔

اس میں کہا گیا ہے امریکی سی آئی اے پاکستان اور دیگر مسلم ممالک میں دہشت گردیاں کروا رہی ہے۔ قارئین! پس منظر و پیش منظر کے طور پر یاد رہے سی آئی اے دنیا کی سب سے بڑی انٹیلی جنس ایجنسی ہے۔ اس کے دو بڑے شعبے ہیں۔ آپریشنز اور ریسرچ۔ آپریشنز ونگ دنیا بھر میں امریکا کا اثر و رسوخ قائم رکھتی ہے۔ یہ ونگ اثر و رسوخ قائم رکھنے کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتی ہے۔ دنیا میں آپریشنز ونگ کے لگ بھگ بار سو خفیہ دفاتر اور 88 ہزار کارکن ہیں۔ یہ کارکن اور دفاتر دنیا کے مختلف ممالک کی صورتِ حال پر نظر رکھتے ہیں۔ یہ امریکا کی بالادستی قائم رکھنے کے لیے ایسی حکومتیں بناتے ہیں جو امریکا کا حکم بجالاتی ہیں، جو ان کے مفادات کی حفاظت کرتی ہیں۔

خطرہ کون؟

یہ حکومتوں کو گرانے، محب وطن رہنماؤں کو بدنام کرنے، انہیں رشوت دینے یا پھر قتل کرنے کا کام بھی کرتے ہیں۔ یہ ونگ امریکا کی نظر میں اہم ممالک میں اپنی لابی بھی تیار کرتی ہے۔ وہاں اپنی پسند کے بزنس مین، صنعت کار، سیاست دان، صحافی، کھلاڑی، جرنیل اور رہنما بھی پیدا کرتی ہے۔ اس کے برعکس ریسرچ ونگ کا کام دنیا میں ہونے والی تبدیلیوں پر نظر رکھنا اور مستقبل میں پیش آنے والے خطرات کا جائزہ لینا ہوتا ہے۔

اس ونگ نے اس کام کے لیے امریکا کے اندر اور امریکا کے باہر ہزاروں محقق، ماہرین اور تھنک ٹینکس کی خدمات حاصل کر رکھی ہیں۔ یہ لوگ تحقیق کے بعد اپنی رپورٹیں سی آئی اے کے ہیڈکوارٹر بھجوا دیتے ہیں۔ یہ رپورٹیں سی آئی اے کے سینٹرل ٹیبل پر جمع ہوتی ہیں۔ بعد ازاں

ان کی بنیاد پر سی آئی اے کے اعلیٰ دماغ آنے والے دنوں کے لیے مڈ اور لانگ ٹرم پالیسیاں بناتے ہیں۔ سی آئی اے کی ریسرچ ونگ نے کچھ عرصہ پہلے ''گلوبل ٹرینڈز 2020ء'' کے نام سے ایک رپورٹ تیار کی تھی۔ اس میں 2020ء میں ہونے والی سیاسی، سماجی، اقتصادی اور مذہبی تبدیلیوں کی نشاندہی کی گئی۔

اس کا ایک حصہ اسلام، مسلمانوں اور اسلامی ممالک سے متعلق ہے۔ اس حصے میں انکشاف کیا گیا ہے 2020ء تک دنیا میں اسلامی ممالک کا اثر و رسوخ بڑھ جائے گا۔ اسلامی دنیا یورپ کی طرح بلاک بنانے میں کامیاب ہو جائے۔ اسلامی شعائر ان اسلامی ممالک میں بھی پھیلنا شروع ہو جائیں گے جو اب تک لبرل ہیں۔ موجودہ حالات سے یوں محسوس ہوتا ہے آنے والے دور میں مسلمانوں کی آپس میں یکجہتی اور اتحاد بڑھنا شروع ہو جائے گا۔

وہ فلسطین، چیچنیا، عراق، کشمیر اور دیگر ممالک میں جاری آزادی کی تحریکوں کی بھرپور مدد شروع کر دیں گے۔ اس رپورٹ میں کہا گیا ہے 2020ء تک ''اسلامی دہشت گردی'' ختم نہیں ہو سکے گی بلکہ اس میں اضافہ ہو جائے گا اور القاعدہ کے طرز کی کئی نئی جماعتیں پیدا ہوں گی جو امریکا کو چیلنج کریں گی جن سے مستقبل میں امریکا کی سلامتی کو خطرات پیش آئیں گے۔

آنے والے دس برسوں میں اسلامی دہشت گرد تنظیمیں جوہری، کیمیائی اور حیاتیاتی ہتھیار حاصل کر لیں گی۔ ان کے علاوہ مشرقِ وسطیٰ کے ممالک بھی خطرات کے باعث ایٹمی ہتھیاروں کے حصول کی دوڑ میں شریک ہو جائیں گے۔ 2020ء تک گیس اور تیل کی ضرورت میں 50 فیصد اضافہ ہو جائے گا اور اب تک تیل اور گیس کے تمام بڑے ذخائر اسلامی دنیا کے پاس ہیں۔ یہ ذخائر بھی آنے والے وقتوں میں مغربی دنیا بالخصوص امریکا کی اقتصادی زندگی کے لیے خطرہ بن سکتے ہیں۔

اختلافات کو ہوا دینے کا مقصد:

سی آئی اے کی رپورٹ مسلمانوں کے بارے میں ''ایک نئی خلافت'' کا نظریہ بھی پیش کرتی ہے۔ اس خلافت میں دنیا کے تمام مسلمان، اسلامی ممالک اور ''اسلامی دہشت گرد'' تنظیمیں اکٹھی

ہو جائیں گی اور مل کر مغربی ثقافت اور مغربی اقتدار کے لیے چیلنج بن جائیں گی۔ رپورٹ کے آخر میں امریکی دانشوروں، ارباب بست وکشاد اور پالیسی سازوں کو بڑے دلچسپ مشورے دیے گئے ہیں اگر امریکا 2020ء کے خطرات سے بچنا چاہتا ہے، اگر وہ سپر پاور رہنا چاہتا ہے، اگر وہ دنیا کو معاشی طور پر غلام رکھنا چاہتا ہے تو اسے چین اور بھارت کے معاملے میں چند اقدامات کرنا ہوں گے۔

ان اقدامات میں امریکا کو سب سے پہلے بھارت کی معاشی مشینری کو سپورٹ کرنا چاہیے۔ امریکا کی اس معاونت کے نتیجے میں چین کی انڈسٹری پر برے اثرات پڑیں گے۔ وہاں کی مصنوعات اور معیشت خراب ہو جائے گی۔ چین اور بھارت کے مابین مسابقت پیدا ہوگی جس کے ردِعمل میں بھارت، امریکا اور اس کے اتحادیوں کو سستے داموں اشیا فراہم کرے گا۔ وہ تمام خریدار جو اس وقت چین جاتے ہیں وہ نئی دہلی، ممبئی اور کلکتہ کی مارکیٹوں کا رُخ کریں گے۔ جب بھارت معاشی طور پر چین سے آگے نکل جائے تو سینٹرل ایشیا کے کسی ملک کو اس کے مقابلے میں کھڑا کر دیا جائے اور بھارت کے ساتھ بھی وہی کچھ کیا جائے جو چین کے ساتھ ہوگا۔

ملائیشیا اور انڈونیشیا جیسے اسلامی ممالک میں کسی نہ کسی طرح مذہبی منافرت پھیلا دی جائے۔ وہاں کے مسلمانوں کو اختلافات کا شکار کر دیا جائے۔ ان تفرقہ بازیوں کے نتیجے میں ان ممالک کی ترقی رُک جائے گی۔ رپورٹ میں مشورہ دیا گیا ہے اسلامی بنیاد پرستی مستقبل قریب میں یورپ اور امریکا کے لیے انتہائی خطرناک ثابت ہوگی لہٰذا اس کے تدارک کے لیے ابھی سے کوئی جامع پالیسی بنانا ہوگی۔ امریکا کو چاہیے وہ تمام اسلامی ممالک کو لبرل بنائے۔ ان میں قائم دہشت گرد تنظیموں کو سپورٹ کرے۔ مساجد و مدارس اور دیگر مقدس مقامات پر بم دھماکے کروائے۔ ان ممالک میں ڈسکو کلب، شراب خانے اور جوا خانے کھولے جائیں۔

نظامِ تعلیم سے اسلامی تعلیمات خارج کر دی جائیں۔ مخلوط تعلیم کو قانونی شکل دی جائے۔ تمام سرکاری اور غیر سرکاری دفتروں میں خواتین کی تعداد بڑھائی جائے۔ اسکولوں میں جنسی تعلیم دی جائے۔ میڈیا پر ایسے ڈرامے اور پروگرام دکھائے جائیں جن میں جنسی اشارے اور لبرل ماحول ہو۔ ٹیلی ویژن پر شراب اور دیگر منشیات کے اشتہار دکھائے جائیں۔ وہ تمام ممالک جن

کے درمیان اختلاف پائے جاتے ہیں اور ان اختلافات کے نتیجے میں اسلامی ممالک میں جہادی سوچ پروان چڑھ رہی ہے۔ ان ممالک کے درمیان اتحاد اور صلح جوئی پیدا کی جائے۔ جہادی تنظیموں، دینی رفاہی اداروں، مدرسوں اور مذہبی جماعتوں پر پابندی لگادی جائے۔ نقاب، حجاب، ڈاڑھی اور نماز کی حوصلہ شکنی کی جائے۔ مذہب کو ریاست کے بجائے پرائیویٹ معاملہ بنایا جائے۔

ظلم کی طویل رات:

اسلامی دنیا کے پڑھے لکھے نوجوانوں کو یورپ اور امریکا منتقلی کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ اسلامی دنیا میں ایسے دانشور اور اسکالر پروان چڑھائے جائیں جو ان ممالک کے عوام کو احساسِ کمتری کا شکار بنادیں۔ جو اپنے ممالک کے شہریوں کے دل و دماغ میں یہ بات راسخ کردیں ہم یورپ اور امریکا سے پیچھے ہیں۔ اگر یورپ اور امریکا کی زندگی اور اصول نہ اپنائے گئے تو ہم ختم ہوجائیں گے۔ سی آئی اے کی اس رپورٹ میں امریکا کو مشورہ دیا گیا ہے اگر امریکا نے ان معاملات پر فوری توجہ نہ دی تو 2020ء وہ سال ثابت ہوگا جس کے بعد امریکا کا عروج زوال بن جائے گا۔

چین کو دبانے کے لیے امریکا نے بھارت کو مضبوط کرنا شروع کردیا ہے۔ مدارس کا ڈیٹا جمع کیا جارہا ہے۔ تمام اسلامی ممالک کے نصابوں کا جائزہ لیا جارہا ہے۔ ان سے جہاد اور اسلامی اتحاد پر مبنی آیات اور احادیث خارج کی جارہی ہیں۔ مسلم دنیا میں کیبل کے ذریعے فحاشی اور عریانی کو پروان چڑھایا جارہا ہے اور اسلامی دنیا میں دیندار طبقوں کا امیج برباد کیا جارہا ہے۔ مولانا، مولوی، جہاد، داڑھی، پگڑی، حجاب اور شعائر اسلام کو گالی بنانے کی بھونڈی کوششیں جاری ہیں۔ یہ سارے آثار ثابت کرتے ہیں اسلامی دنیا خصوصاً واحد ایٹمی طاقت پاکستان کے خلاف سازشوں اور دہشت گردی کا عمل پوری قوت سے جاری ہے۔ اسی کا اظہار انٹرنیٹ ویب سائٹ "وکی لیکس" نے اپنی خفیہ رپورٹ میں کیا ہے۔

ظلم کی رات جتنی بھی طویل ہو، سویرا ہوکر ہی رہتا ہے۔ امریکا نے کون سا ظلم، ناانصافی اور دہشت گردی ہے جو نہیں کی؟ اور کونسا الزام ہے جو دینی مدارس کے اجلے کردار پر نہیں لگایا؟

گزشتہ دنوں ایک دفعہ پھر دینی مدارس پر چھاپوں کا ملک گیر سلسلہ شروع ہوا۔ اسلام آباد میں وفاقی وزارت داخلہ کی ہدایت پر غیر رجسٹرڈ مدارس کے خلاف کارروائی کا آغاز کر دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں وفاقی پولیس نے جامعہ محمدیہ، جامعہ عمر، جامعہ فاروقیہ و دیگر میں سیکورٹی اداروں کی بھاری نفری کے ساتھ چھاپہ مار کر 2 افراد کو گرفتار کر لیا۔ کارروائی سے مدارس کی ملحقہ آبادی میں خوف و ہراس پھیل گیا۔

وفاق المدارس نے اس حکومتی اقدام کی شدید مذمت کرتے ہوئے کہا چھاپوں سے معاملات بگڑیں گے۔ رجسٹریشن سے انکار نہیں کیا۔ اس کے سسٹم کی سست روی پر اعتراض ہے۔ کارروائی کا سلسلہ فوری بند کیا جائے۔ ادھر وزیر داخلہ رحمٰن ملک کا کہنا ہے کسی مسجد و مدرسے کے خلاف کارروائی نہیں کی جارہی البتہ کسی غیر ملکی کو امام مسجد بننے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ اسلام کے نام پر بننے والے اس ملک کا المیہ یہ رہا ہے اس کے حکمرانوں نے ہمیشہ حق کا کلمہ کہتے ان مدارس دینیہ کو اپنے شکنجے میں کسنے کی کوششیں کیں۔ جو حکمران بھی آیا اس پر مدارس میں "اصلاحات" کی "فکر" سوار ہوگئی اور اسی کے تحت اس نے مدارس کو تنگ کرنا چاہا۔

نام نہاد دانشوروں کے بے رحم تیر:

مقام افسوس ہے 18 فروری 2008 کو عوام کے ریلیف کا نعرہ لگا کر برسر اقتدار آنے والی موجودہ حکومت نے بھی صرف پونے دو سال میں سابقہ حکمرانوں کا وتیرہ اپنا لیا ہے۔ ہر دہشت گردی پر اپنے ازلی دشمنوں بھارت اور اسرائیل کو نظر انداز کر کے دینی مدارس پر الزامات کی بارش کی جارہی ہے حالانکہ مدارس پر یہ الزامات کوئی بھی ثابت نہیں کر سکا۔ وفاق المدارس کی جانب سے کئی بار یہ چیلنج کیا گیا کسی ایک طالب علم کو دہشت گرد ثابت کر کے دکھایا جائے لیکن آج تک یہ چیلنج کوئی نہیں قبول کر سکا۔ میاں چنوں میں بارود پھٹنے سے کئی ہلاکتوں کا ذمہ دار بھی ایک مدرسے کو قرار دینے کی سازش کی گئی مگر جب گرد چھٹی تو یہ الزام بھی ریت کی دیوار ثابت ہوا۔ گزشتہ دنوں راولپنڈی، اسلام آباد، پشاور اور کوہاٹ میں ہونے والے پے در پے حملوں کے بعد ایک بار پھر سارا نزلہ مدارس پر گرایا جا رہا ہے۔

ایک مخصوص فکر کا حلقہ اور اس کے نام نہاد دانشور قوم کو گمراہ کرتے ہوئے اپنے تئیں یہ بتانا چاہ رہے ہیں کہ یہ سب کچھ جنوبی پنجاب کے مدارس کا کیا دھرا ہے۔ قومی مجرم پرویز مشرف نے بھی امریکا میں بیٹھ کر ہرزہ سرائی کی ان مدارس سے انتہا پسندی بڑھ رہی ہے۔ انہیں قانون کے دائرے میں لایا جانا نہایت ضروری ہے۔ عجیب بات ہے یہ باتیں ایسا شخص کہہ رہا ہے جو خود قانون کے قفس سے بچنے کے لیے ملک سے باہر جا بیٹھا ہے۔ مدارس کے خلاف یہ نیا پروپیگنڈا ایسے وقت کیا جا رہا ہے جب اسلام کے ان قلعوں میں نئے تعلیمی سال کا آغاز ہو رہا ہے۔ غیر جانبدارانہ ذرائع کے مطابق اس سال گزشتہ سال کی نسبت سیکڑوں نئے طلبہ، طالبات کا اضافہ ہوا ہے۔ عصری تعلیمی اداروں سے بھی طلبہ مدارس کی طرف کھچے چلے آ رہے ہیں۔ اس سے پہلے جب مدارس میں سالانہ امتحانات ہو رہے تھے تب بھی ایسی ہی منفی مہم شروع کر دی گئی تھی۔

مدارس میں طلبہ کی تعداد روز بروز بڑھتے دیکھ کر بعض قوتیں پریشانی میں مبتلا ہیں۔ ہو سکتا ہے ثبوت کے بغیر صرف الزامات کی بناء پر کی جانے والی کارروائیاں بھی انہی قوتوں کے چہروں سے تشویش کا جالا ہٹانے کے لیے ہوں۔ حقیقت یہ ہے مدارس میں اس وقت قال اللہ اور قال الرسول کے سانچے میں طلبہ کو ڈھالا جاتا ہے۔ اکثر میں تو دینی کے ساتھ ساتھ دنیاوی تعلیم کا سلسلہ بھی زور و شور سے جاری ہے۔ بعض تو ایسے ہیں جہاں پی ایچ ڈی تک کی تعلیم دی جاتی ہے جو خود عصری اداروں میں بھی شاذ و نادر ہی ہے۔ صاف ستھرے ماحول میں تعلیم کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہاں کبھی رینجرز کی تعیناتی کی ضرورت پیش نہ آئی جبکہ عصری تعلیمی اداروں میں سے اکثر کا حال یہ ہے کہ اضافی سیکورٹی دستے مقرر کیے بغیر درس و تدریس ممکن ہی نہیں لیکن دینی و دنیاوی تعلیم کا خوبصورت امتزاج پیش کرنے والے ان دینی اداروں کے ساتھ ہمیشہ سوتیلی ماں کا سا سلوک کیا جاتا ہے۔ بجٹ میں مختص رقم کا اکثر حصہ عصری اداروں کے سربراہان کی جیبوں میں جاتا ہے اور مدارس کے لیے صرف ''اصلاحات'' کا ہی اعلان کیا جاتا ہے حالانکہ ان اصلاحات کا ظاہری مقصد تو بڑی حد تک مدارس پورا کر ہی رہے ہیں۔

مہرباں کیسے کیسے؟:

اس کے باوجود روز انہیں کسی نہ کسی نئے الزام کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ صدر زرداری نے بھی گزشتہ دنوں مدارس کے لیے ترک فارمولے کی بات کی اور یہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں کہ اتاترک کا ایجاد کردہ ترک فامولا کیا تھا؟ دینی مدارس کو سیل کرنا، طلبہ کو ہراساں کرنا، عربی کی تعلیم پر پابندی، اذان پر پابندی وغیرہ وغیرہ۔ پرویزی پالیسیوں پر عمل درآمد نے آج حکومت کو پرویز مشرف کے عبرت ناک انجام سے متعلق سوچنا بھی چھڑوادیا ہے۔ شاید کچھ لوگ سمجھتے ہیں سابق صدر امریکا میں عیش کررہے ہیں لیکن حقیقت اس سے کافی دور ہے۔ کیا یہ سچ نہیں لال مسجد میں 1800 بچیوں کو فاسفورس بموں سے جلانے کا حکم دینے والا آج جہاں جاتا ہے اس کا قاتل قاتل کے نعروں سے استقبال کیا جاتا ہے۔ اپنے دور میں مدارس اور اہلِ مدارس کی زندگیاں تنگ کردینے والے پر آج خود اس کی اپنی دھرتی تنگ ہوچکی۔ اس کا محل آج ویران پڑا ہے۔ اپنے پیشرو کے ایسے انجام کو دیکھ کر موجودہ حکمرانوں کو بھی سبق سیکھنا چاہیے۔

مدارس اس ملک کے سب سے بڑے محافظ ہیں، وہ نظریاتی سرحدوں کی ڈیفنس لائن ہیں۔ ان کو ہراساں اور خوف زدہ کرنے اور ان کے متعلق ترک فارمولے کا خواب دیکھنا ترک کردینا چاہیے۔ اگر حکومت کو کوئی جائز شکایات ہیں تو مدارس کی نمایندہ تنظیم وفاق المدارس کو اعتماد میں لیا جائے لیکن کڑوا سچ تو یہ ہے صدر، وزیراعظم اب تک وفاق المدارس وفد کو ملاقات کے لیے وقت ہی نہیں دے پائے۔ ''جمہوری'' ہونے کا دعویٰ کرنے والی حکومت کو مدارس کے ساتھ اس برتاؤ پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ حکمرانوں کو ہر کام اپنی مرضی اور کسی کو اعتماد میں لیے بغیر کرنے کی آمرانہ روش اب چھوڑ دینی چاہیے۔

اسلام آباد کے مدارس پر چھاپوں کے بعد لاہور اور فیصل آباد سے ہوتا ہوا یہ سلسلہ کراچی کے مدارس تک پھیل گیا۔ اس آپریشن کے دوران بیسیوں مدارس پر چھاپے مارے گئے لیکن کہیں سے نہ تو اسلحہ برآمد ہوا اور نہ ہی کسی مشکوک شخص کی گرفتاری عمل میں آئی۔ پولیس نے اپنی ناکامی اور سبکی مٹانے کے لیے عجیب اوچھے ہتھکنڈوں سے کام لیا۔ کراچی کے ''مدرسہ رحمانیہ'' بفرزون کی مثال لے لیجیے۔

اس ادارے میں قریبی تھانے کے پولیس اہلکار آئے، انہوں نے پوچھا: ''کیا آپ کے ہاں غیر ملکی طلبہ زیر تعلیم ہیں؟'' ادارے کی انتظامیہ نے کہا: ''جی ہاں! بالکل ہیں مگران کے پاس مکمل سفری اور قانونی دستاویزات، این او سی اور نادرا کارڈ موجود ہیں۔'' پولیس اہلکاروں نے کہا ''بہت اچھی بات ہے، آپ مہربانی فرما کران طلبہ کو ہمارے ساتھ بھیج دیں، ہم اپنے ہاں ان کے کوائف کا اندراج کرنا چاہتے ہیں۔''

ہدف مدارس ہیں یا پھر؟

مدرسہ انتظامیہ نے ان طلبہ کو پولیس کے ہمراہ بھیج دیا لیکن پولیس نے ان کے کوائف کا اندراج کرنے کے بجائے میڈیا کے نمائندوں کو تھانے بلالیا اوران معصوم، مظلوم اور مہمان طلبہ کو دہشت گردوں کے روپ میں میڈیا کے سامنے پیش کردیا اوران کی گرفتاری ڈال دی۔ ان طلبہ کو اگلے دن جب عدالت میں پیش کیا گیا تو عدالت نے ان کے کاغذات کو تسلی بخش اور قابل قبول قرار دیتے ہوئے انہیں بری کردیا لیکن میڈیا کے ذریعے جو ڈھنڈورا پیٹا جاچکا تھا، اس کا ازالہ ممکن نہ تھا۔ اسی طرح پنجاب کے علاقے ''میاں چنوں'' کے ایک گاؤں میں ہولناک دھماکا ہوا۔ نصف گاؤں صفحۂ ہستی سے مٹ گیا۔ پولیس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، جھٹ سے اعلان کردیا مدرسہ میں دھماکا ہوا ہے اور حسبِ روایت میڈیا نے مدارس پر لعن طعن شروع کردی۔ بعد میں تحقیق سے معلوم ہوا یہ تو ماسٹر ریاض کا گھر ہے۔ مدرسہ اور اہل مدرسہ سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔''

اس وقت کی آزاد ذرائع کی رپورٹ ملاحظہ کیجیے: ''میاں چنوں کے جس مکان میں دھماکا ہوا وہ کوئی مدرسہ نہیں، بلکہ حاضر سروس اسکول ٹیچر ماسٹر ریاض کا مکان تھا۔ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت دہشت گردی کے ہر واقعے کا ملبہ مدارس پر ڈال کر درسگاہوں کو بدنام کیا جارہا ہے جو افسوس ناک ہے۔ میڈیا اس سازش کو ناکام بنائے۔ وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے علماء ومشائخ کے وفد نے جائے وقوع کا دورہ کیا اور اطلاع دی اس واقعے کو سراسر غلط رپورٹ کیا گیا۔ وہاں کوئی مدرسہ نہیں، بلکہ ایک حاضر سروس اسکول ٹیچر ماسٹر ریاض کا گھر تھا۔ اس سے قبل اس اسکول ٹیچر کی مشکوک سرگرمیوں کی پولیس کو اطلاع دی گئی وہ گرفتار بھی ہوا لیکن پولیس نے پیسے لے کر چھوڑ دیا۔

وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے رہنما مولانا سلیم اللہ خان، قاری محمد حنیف جالندھری، مفتی محمد رفیع عثمانی، ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر نے کہا اس واقعہ میں ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت مدارس کو بدنام کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔"

اسی طرح 2009ء کے شروع میں ذرائع ابلاغ پر یہ خبر بڑے زور وشور کے ساتھ چلائی گئی کہ ڈیرہ غازی خان کے ایک دینی مدرسے سے اتنا خطرناک گولہ بارود برآمد ہوا ہے۔ وفاق المدارس العربیہ کے ناظم اعلیٰ قاری محمد حنیف جالندھری کے مطابق اس واقعے کا کسی دینی مدرسے سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے اور جہاں سے گولہ بارود برآمد ہوا ہے وہ ایک گودام ہے جہاں ہر قسم کا مال رکھا جاتا ہے۔

اوچھے ہتھکنڈے:

اسی طرح کے اوچھے ہتھکنڈے دوسری جگہوں پر بھی بروئے کار لائے گئے۔ یہاں یہ بات یاد رہے مدارس کی انتظامیہ اور تمام مدارس کے نمائندہ وفاقوں نے ہمیشہ قانون نافذ کرنے والے اداروں کے ساتھ تعاون بھی کیا اور اپنے اداروں کو کھلی کتاب کی مانند قرار دیا، یہ مدارس کبھی بھی نوگوایریا نہیں رہے کہ ان پر پورے لاؤ لشکر سمیت یلغار کی ضرورت پیش آئے لیکن عجیب بات یہ ہے وقفے وقفے سے ان مدارس کو مشقِ ستم بنایا جاتا ہے اور معمول کی چیکنگ، کوائف وغیرہ کے حصول، خفیہ نگرانی کے مسلسل اور مربوط سلسلے کے ہوتے ہوئے سمجھ نہیں آتی کیوں کچھ عرصے بعد مدارس پر اس انداز سے چڑھائی کردی جاتی ہے جیسے اسرائیلی افواج غزہ یا بھارتی افواج کشمیر پر چڑھائی کیا کرتی ہیں۔ حالانکہ کئی دفعہ محض شک کی بناء پر مدارس کے طلبہ گرفتار کیا گیا۔ غیر ملکی قرار دیدیا گیا۔ بعد ازاں "غیر ملکی" قرار دیے جانے کا دعویٰ جھوٹا نکلا۔

جن دنوں میں مدارس کے خلاف جن حالات میں کریک ڈاؤن کیا گیا، ان سے اندازہ ہوتا ہے ان چھاپوں کے لیے ڈوری کہیں اور سے ہلائی گئی تھی۔ کیری لوگر بل میں چونکہ مدارس کی مشکیں کسنے کی شرط بھی شامل تھی اس لیے اس بل کی وفاقی کابینہ سے منظوری ہوتے ہی مدارس کے خلاف کریک ڈاؤن شروع کردیا گیا اور عین اس موقع پر جب سینیٹر "جان کیری" اور "جنرل پیٹریاس" پاکستان کے دورے پر آئے ہوئے تھے، مدارس پر چھاپے مارے گئے اور لاہور کے

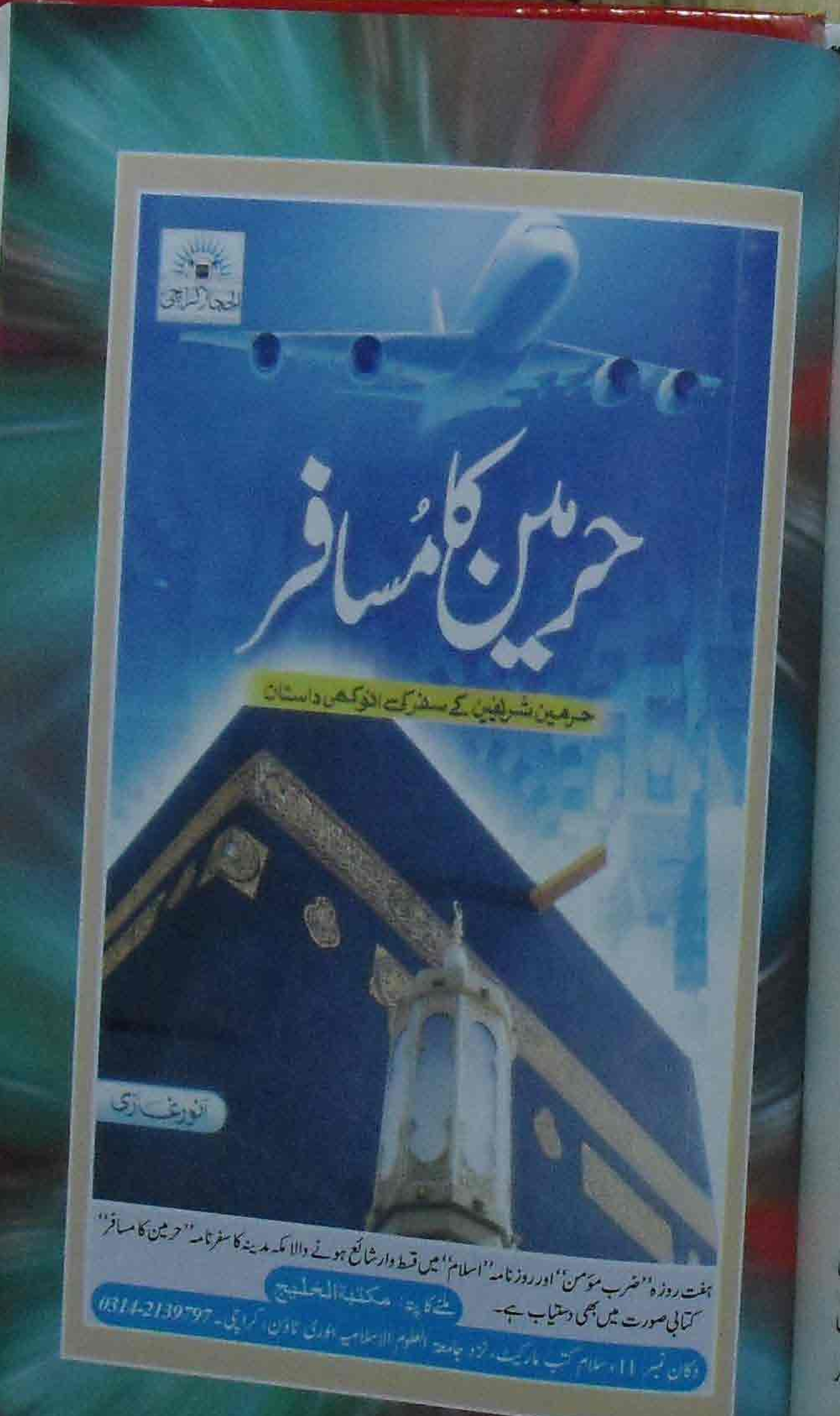
مدارس کو اس وقت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا جب بعض ''اہم مہمانوں'' کی لاہور آمد تھی۔ مدارس کے ذمہ داران نے ایک بات بطور خاص نوٹ کی کہ چھاپے مارنے سے قبل پورے میڈیا کو باقاعدہ اطلاع دے کر ان کی حاضری کو یقینی بنایا جاتا تھا اور پھر اس چھاپہ مار مہم کا خوب ڈھنڈورا پیٹا جاتا تھا۔ اس سے لگتا ہے یہ آپریشن مدارس کے میڈیا ٹرائل اور ایک منظم مہم کا حصہ تھا۔

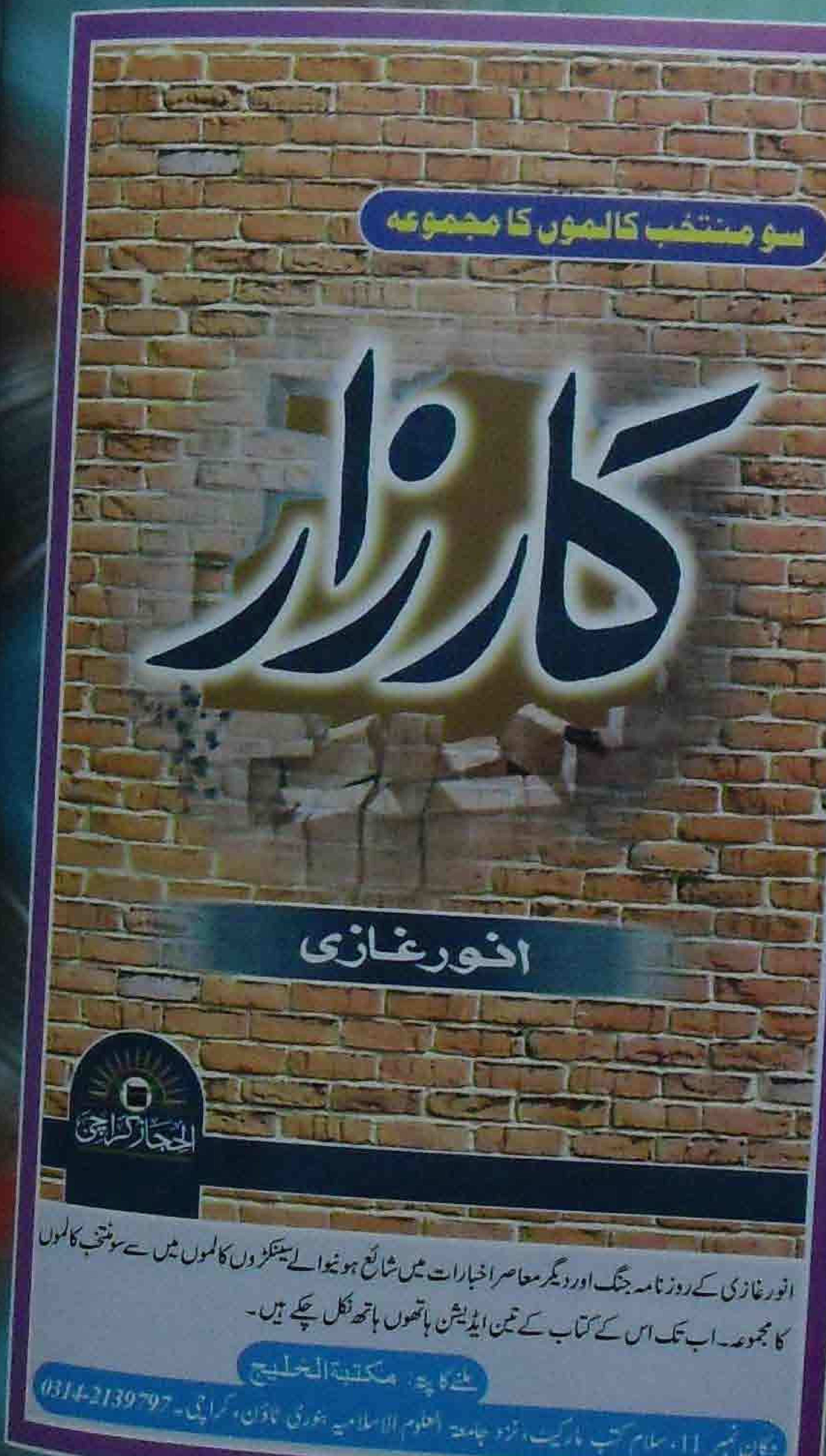
ان چھاپوں کے بعد ایک اور بات یہ نوٹ کی گئی بعض نجی چینلز کے بعض اینکر پرسنز نے مدارس کو آڑے ہاتھوں لیا اور بعض نام نہاد دانشوروں اور قلم کاروں نے مدارس کے خلاف مزید کارروائی کے لیے ہلہ شیری دی اور بتدریج مدارس کے خلاف ماحول بنایا جانے لگا۔ یہ سب کچھ ایک ہی سلسلے کی مختلف کڑیاں لگتی ہیں۔ ملک میں دہشت گردی کی حالیہ لہر کے تناظر میں مدارس پر چھاپے مار کر جہاں اس عسکریت پسندی اور دہشت گردی کے ڈانڈے مدارس سے ملانے کی کوشش کی گئی، وہیں حکومتی اداروں نے اپنی ناکامی کو چھپانے کے لیے بھی مدارس کو ہی اپنا ہدف بنایا۔

چادر اور چار دیواری کا تقدس:

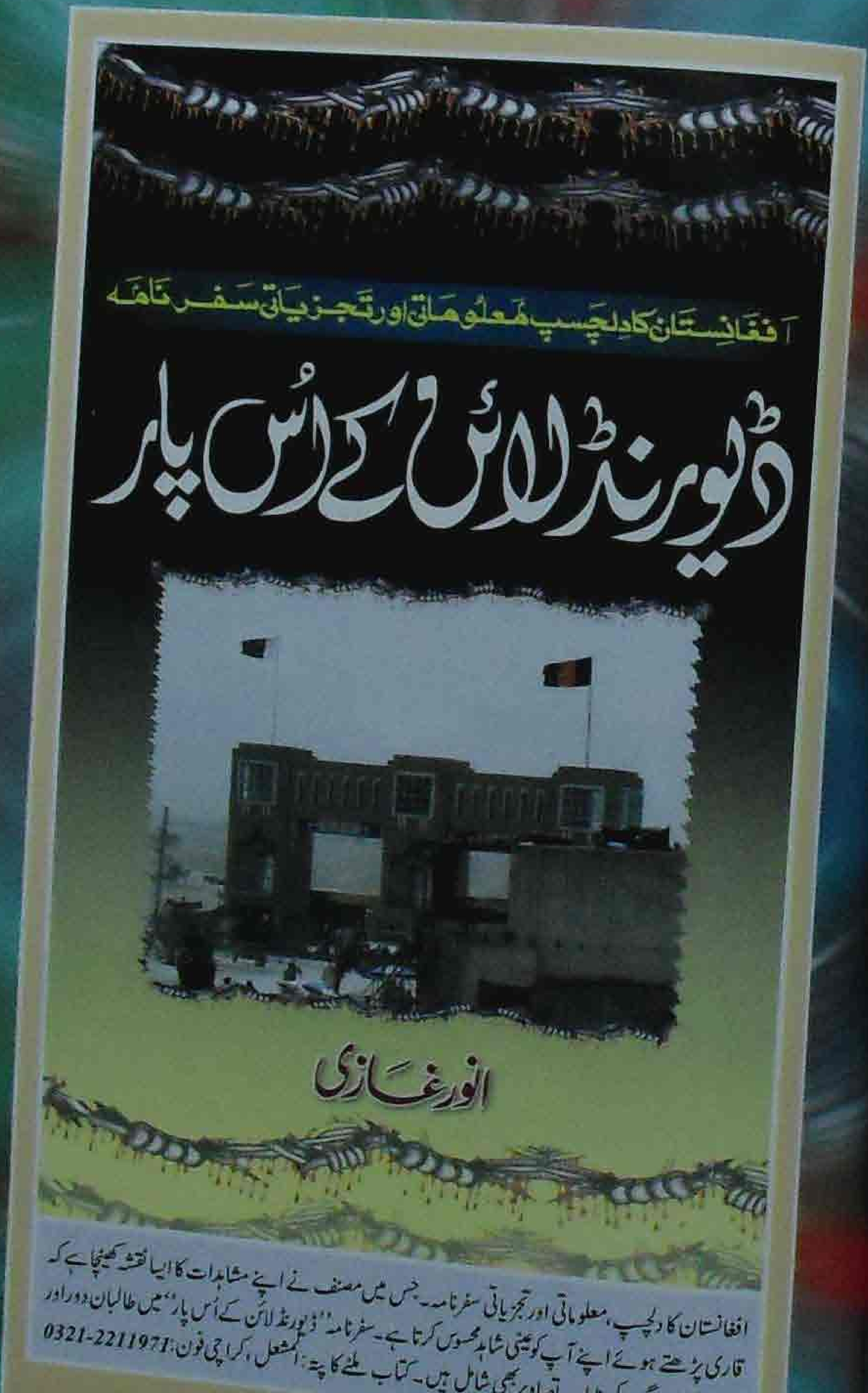
ہمارے ہاں یہ عجیب ماحول بن گیا ہے ملک میں دہشت گردی اور تخریب کاری کی واردا تیں کروانے والی اصل قوتوں کو بے نقاب کرنے کے بجائے ''مرے کو مارے شاہ مدار'' کے مصداق ہمارے قانون نافذ کرنے والے ادارے دینی مدارس پر چڑھ دوڑتے ہیں اور اپنے نمبر بنانے اور لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دوسری طرف اصل تخریب کاروں کو افغانی بھیس، جعلی نمبر پلیٹ، ناجائز اسلحہ سمیت گرفتار کر کے اپنے ''صوابدیدی اختیارات'' کی بنیاد اور ایک فون کال پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ مدارس کے خلاف یہ کریک ڈاؤن ایک ایسے وقت کیا گیا جب وطن عزیز تاریخ کے انتہائی نازک ترین دور سے گزر رہا ہے۔

اس وقت ضرورت اس امر کی ہے کہ عوام کے گلے شکوے دور کیے جائیں اور مختلف ناراض طبقات کے خدشات کے ازالے کی فکر کی جائے جبکہ ہمارے ارباب اختیار الٹا نئے محاذ کھول رہے ہیں۔ مدارس کے لاکھوں طلبہ، ہزاروں علماء اور مدارس کے ملک بھر میں پھیلے معاونین اور متعلقین میں تشویش واضطراب پیدا کر کے وطن عزیز کو مزید بدترین حالات اور بحرانوں سے


حرمین کا مُسافر
حرمین شریفین کے سفر کی انوکھی داستان
انور غازی
ہفت روزہ "ضرب مؤمن" اور روزنامہ "اسلام" میں قسط وار شائع ہونے والا مکہ مدینہ کا سفرنامہ "حرمین کا مسافر"
کتابی صورت میں بھی دستیاب ہے۔
ملنے کا پتہ: مکتبۃ الخلیج
دکان نمبر 11، اسلام کتب مارکیٹ، نزد جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی۔ 0314-2139797



سو منتخب کالموں کا مجموعہ
کارزار
انور غازی
الحجاز کراچی
انور غازی کے روزنامہ جنگ اور دیگر معاصر اخبارات میں شائع ہونیوالے سینکڑوں کالموں میں سے سو منتخب کالموں کا مجموعہ۔ اب تک اس کے کتاب کے تین ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکل چکے ہیں۔
ملنے کا پتہ: مکتبۃ الخلیج
دکان نمبر 11، سلام کتب مارکیٹ، نزد جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن، کراچی۔ 0314-2139797


افغانستان کا دلچسپ معلوماتی اور تجزیاتی سفر نامہ
ڈیورنڈ لائن کے اُس پار
انور غازی
افغانستان کا دلچسپ، معلوماتی اور تجزیاتی سفرنامہ۔ جس میں مصنف نے اپنے مشاہدات کا ایسا نقشہ کھینچا ہے کہ قاری پڑھتے ہوئے اپنے آپ کو عینی شاہد محسوس کرتا ہے۔ سفرنامہ ''ڈیورنڈ لائن کے اُس پار'' میں طالبان دور اور حالیہ افغان جنگ کی نایاب تصاویر بھی شامل ہیں۔ کتاب ملنے کا پتہ: المشعل، کراچی فون: 0321-2211971

دوچار کررہے ہیں۔ موجودہ حالات میں مدارس کے خلاف چھاپے جہاں غلامانہ ذہنیت کی عکاسی کرتے ہیں، وہیں بدترین ناعاقبت اندیشی کے زمرے میں بھی آتے ہیں۔

اس وقت اعلیٰ سرکاری حکام کو سوچنا چاہیے کہیں کوئی ایسی خاص قسم کی لابی تو نہیں جو دانستہ طور پر حالات کو بگاڑنا چاہتی ہے اور حکومت اور دینی قوتوں کے مابین محاذ آرائی کے لیے راہ ہموار کررہی ہے۔ مدارس پر چھاپے مدارس کے خلاف امتیازی سلوک بھی ہے کیونکہ وہ عصری ادارے جہاں سے آئے روز اسلحہ برآمد ہورہا ہے، جہاں قتل وغارت گری اور طلبہ کے مابین تصادم روز کا معمول بن گیا ہے، ان کے خلاف کریک ڈاؤن کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی اور سارا نزلہ صرف مدارس پر گرایا جاتا ہے۔

اسی طرح نجی ہاسٹلز، ہوٹلوں اور دوسری جگہوں پر کریک ڈاؤن نہیں ہوتا، صرف مدارس کے خلاف ہی کیوں ہوتا ہے؟ دینی مدارس جہاں سے ہر وقت ''قال اللہ وقال الرسول'' کی صدائیں گونجتی ہیں، جہاں ملک کے استحکام وسلامتی کے لیے قرآن کریم کا ختم، سورۂ یٰسین کی تلاوت اور آیت کریمہ کا ورد کیا جاتا ہے، وہاں اس طرح چھاپے مار کر ان اداروں کا تقدس پامال کرنا نہایت افسوس ناک ہے۔ بعض جگہوں سے یہ اطلاعات بھی موصول ہوئی ہیں کہ پولیس اہلکار جوتوں سمیت مسجدوں میں گھس گئے، بعض جگہوں پر بچیوں کے مدارس میں چادر اور چاردیواری کا تقدس بھی پامال کیا گیا۔ یہ کس قدر شرمناک بات ہے؟

بہترین حکمت عملی کیا ہے؟

پاکستان کے عوام یہ سمجھ رہے ہیں کہ دینی مدارس کو اس لیے نشانہ بنایا جارہا ہے تاکہ وہ مراکز جو اسلام کی حفاظت کے قلعے ہیں، ان میں نقب لگائی جائے اور جو ادارے لوگوں کے دین سے وابستگی اور حصول علم کا ذریعہ ہیں ان کو بدنام کردیا جائے، اس لیے اس قسم کے کریک ڈاؤن کا سلسلہ فی الفور بند ہونا چاہیے تاکہ عوامی تشویش واضطراب کا خاتمہ ہوسکے۔ ان چھاپوں کے بعد تقریباً ہر مدرسے کی انتظامیہ اور مہتمم صاحبان سے رابطہ کیا، ان کی حوصلہ افزائی اور دلجوئی کی، اس دوران یہ بات بڑی شدت سے محسوس کی کہ اس قسم کی کارروائیوں سے ملک بھر میں بہت زیادہ

اشتعال اور غم وغصہ پایا جاتا ہے۔

ان چھاپوں کے بعد راولپنڈی اسلام آباد کے علماء نے تمام اہم سرکاری شخصیات اور اعلیٰ حکام سے وفد کی صورت میں ملاقاتیں کیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ ان لوگوں میں سے کوئی بھی مدارس کے خلاف ہونے والے کریک ڈاؤن کی ذمہ داری قبول کرنے کے لیے تیار نہیں بلکہ ہر ایک اس کی ذمہ داری دوسرے پر ڈال رہا ہے اور زبانی طور پر مدارس کے خلاف کارروائی نہ کرنے کی یقین دہانی کروائی جاتی ہے لیکن عملاً پھر مدارس پر چڑھائی کر دی جاتی ہے۔ سمجھ نہیں آتی تعلیم وتعلم میں مصروف لوگوں کے غم وغصہ اور مدارس کے طلبہ کے اشتعال کو آخر کب تک کنٹرول کیا جاسکتا ہے اور ہم یہ بھی سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اس صورتِ حال کو کیا نام دیا جائے؟

قول وفعل کا تضاد کہا جائے یا کسی تیسری قوت کی کارستانی؟ اسلام دشمنی سمجھا جائے یا استعماری قوتوں کی غلامی؟ ستم ظریفی ملاحظہ کیجیے! دھماکے میں شہید ہونے والے کسی بھی باریش شخص کو مدرسے کا طالب علم یا امام مسجد قرار دے کر ملزم نامزد کر دیا جاتا ہے اور حقائق سے چشم پوشی اختیار کی جاتی ہے جس کی وجہ سے علمائے کرام کے امیج کو شدید نقصان پہنچ رہا ہے حالانکہ متعدد بار ملک بھر کے علمائے کرام خودکش حملوں کے بارے میں اپنا موقف واضح کر چکے ہیں۔ دور نہ جائیں! اسی سال ڈیڑھ سو علماء کے اجلاس میں بھی اسی طرح کی باتیں ہوئی تھیں۔ ہمیں یاد ہے ڈیڑھ سو علماء نے مشترکہ طور پر کہا تھا: ''ہم پورے اعتماد اور دیانت کے ساتھ اس بات پر یقین رکھتے ہیں پاکستان کے موجودہ حالات میں نفاذ شریعت اور ملک کو غیر ملکی تسلط سے نجات حاصل کرنے کے لیے پُرامن جدوجہد ہی بہترین حکمت عملی ہے۔

داخلی سطح پر مسلح جدوجہد شرعی اعتبار سے غلط ہونے کے علاوہ دیگر مقاصد کے لیے بھی سخت مضر ہے۔ اس کا براہِ راست فائدہ ہمارے دشمنوں کو پہنچ رہا ہے۔ امریکا اُسے اس علاقے میں اپنے اثر ورسوخ کو دوام بخشنے کے لیے استعمال کر رہا ہے۔ اگر کوئی شخص اخلاص کے ساتھ اُسے دین کا تقاضا سمجھتا ہے تو یہ اجتماع اس بات پر اتفاق کرتا ہے ایسے حضرات کو حالات کے تقاضوں اور ضرورتوں سے آگاہ کر کے مثبت کردار کی ادائیگی پر آمادہ کرنے کے لیے ناصحانہ اور خیر خواہانہ روش

اختیار کی جائے گی۔"

تاریخ شاہد ہے:

یہ الفاظ 150 علماء ومشائخ کے منظور کردہ مشترکہ اعلامیہ کے ہیں۔ یہ اجلاس 14 تا 17 اپریل 2010ء کو جامعہ اشرفیہ لاہور میں منعقد ہوا۔ اس میں ملک بھر کے چوٹی کے ڈیڑھ سو علماء ومشائخ نے شرکت کی۔ اس چار روزہ اجلاس میں پہلے دو دن تک بند کمرے میں دس بڑے...... جن کو ملک بھر کی کریم کہا جاسکتا ہے...... علماء، فقہاء، مشائخ اور مفتیانِ کرام سر جوڑے بیٹھے رہے۔ مفتی تقی عثمانی، مفتی رفیع عثمانی، مولانا سلیم اللہ خان، ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر جیسے جید علماء بارہ بارہ گھنٹے سوچ وبچار کرتے رہے۔ بالآخر ایک متفقہ نتیجے پر پہنچے تو اگلے دو دن کراچی تا خیبر سے آئے ہوئے 150 کے قریب نمائندہ علماء نے اس ایجنڈے پر بحث کی۔ دلائل دیے۔ آخر کار طے پایا داخلی سطح پر عسکری رویوں کی حوصلہ شکنی کی جائے۔ افہام وتفہیم سے کام لیا جائے۔

تاریخ شاہد ہے اندرونی شورشوں اور بغاوتوں کا حل بالآخر پُرامن مذاکرات کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔ اب بھی یہی کچھ ہونا ہے۔ چنانچہ اجلاس کے آخر میں 5 نکاتی یہ مشترکہ اعلامیہ جاری کیا گیا۔ اس میں علماء نے جو کچھ کہا، اس کا خلاصہ یوں بیان کیا جاسکتا ہے: "اس بات پر ہمارا ایمان غیر متزلزل ہے کہ اسلام نے یہ ملک بنایا تھا اور اسلام ہی اسے بچا سکتا ہے، لہٰذا حکومت کا فرض ہے وہ ملک میں اسلامی تعلیمات اور قوانین کو نافذ کرنے کے لیے مؤثر اقدامات کرے۔ یہ اللہ کی طرف سے ہمارا دینی فریضہ بھی ہے اور ملک کے آئین کا اہم ترین تقاضا بھی۔ اسی کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے ملک میں انتہا پسندی کی تحریکیں اُٹھی ہیں۔

اگر ملک نے اپنے اس مقصدِ وجود کی طرف واضح پیش قدمی کی ہوتی تو ملک اس وقت اس اذیت سے دوچار نہ ہوتا۔ وقت کا اہم ترین تقاضا ہے پُرامن ذرائع سے پوری نیک نیتی کے ساتھ ملک میں نفاذِ شریعت کے اقدامات کیے جائیں۔ اس غرض کے لیے اسلامی نظریاتی کونسل اور فیڈرل شریعت کورٹ کو فعال بنا کر ان کی سفارشات اور فیصلوں کے مطابق اپنے قانونی اور سرکاری نظام میں تبدیلیاں بلا تاخیر لائی جائیں۔ ملک سے کرپشن، بے راہ روی اور فحاشی وعریانی

ختم کرنے کے لیے مؤثر اقدامات کیے جائیں۔ تمام سیاسی اور دینی جماعتوں کا فرض ہے وہ اپنے دوسرے مقاصد پر نفاذ شریعت کے مطالبے کو اوّلیت دے کر حکومت پر دباؤ ڈالیں۔ اس غرض کے لیے مؤثر مگر پُرامن جدوجہد کا اہتمام کریں۔ عوام کا فرض ہے جو جماعتیں اور ادارے اس مقصد کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں ان کے ساتھ مکمل تعاون کریں۔

سب سے بڑا مسئلہ کیا ہے؟

اس وقت ملک کا سب سے بڑا مسئلہ دہشت گردی کو قرار دیا جا رہا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے دہشت گردی نے ملک کو اُجاڑنے میں کوئی کسر چھوڑ نہیں رکھی۔ جگہ جگہ حملوں اور تخریبی کارروائیوں نے ملک کو بدامنی کی آماجگاہ بنایا ہوا ہے۔ ان تخریبی کارروائیوں کی تمام محب وطن حلقوں کی طرف سے بار بار مذمت کی گئی ہے لیکن اس تمام مذمت کے باوجود یہ کارروائیاں مستقل جاری ہیں۔ اس صورتِ حال کا ٹھنڈے دل سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ سوچنا چاہیے آخر ملک بھر کی متفقہ مذمت اور فوجی طاقت کے استعمال کے باوجود یہ کارروائیاں کیوں جاری ہیں؟ اس کے بنیادی اسباب کیا ہیں؟ ہماری نظر میں اس صورتِ حال کا بہت بڑا سبب وہ افغان پالیسی ہے جو جنرل (ر) پرویز مشرف صاحب نے غلامانہ ذہنیت کے تحت کسی تحفظ کے بغیر شروع کردی تھی اور آج تک اسی پر عمل ہوتا چلا آرہا ہے جبکہ یہ حقیقت بالکل واضح ہے ہمارے ملک کو زخمی کرنے کے سوا کوئی خدمت انجام نہیں دی۔

ہمارا مطالبہ ہے حکومت امریکا نوازی کی اس پالیسی کو ترک کرکے افغانستان کی جنگ سے اپنے آپ کو بالکل الگ کرے۔ امریکی افواج کو مدد پہنچانے کے تمام اقدامات سے دستبردار ہو۔ حکومت اس بات کا احساس کرے اندرونی شورشوں کا پائیدار حل بالآخر پُرامن مذاکرات کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ چنانچہ ملک کی پارلیمنٹ نے اس موضوع پر اپنی متفقہ قرارداد میں ایک طرف سابق حکمرانوں کی خارجہ پالیسی پر نظرثانی کرنے، ڈرون حملوں اور غیر ملکی مداخلت کے بارے میں قومی خودمختاری کے تحفظ پر زور دیا تھا تو دوسری طرف اندرونی شورش کے لیے مذاکرات ہی کا طریقہ تجویز کیا تھا، لیکن پارلیمنٹ کی اس قرارداد کو عملاً بالکل نظرانداز کردیا گیا ہے۔ حکومت کا فرض ہے

وہ اس قرارداد کے مطابق اپنی حکمت عملی کو تبدیل کر کے خانہ جنگی کا خاتمہ کرے۔

دینی مدارس کا فرض یہ ہے وہ تعلیم و تربیت سے متعلق اپنے اصل مقاصد تک اپنی توجہ مرکوز رکھیں۔ اس نظام کو زیادہ مؤثر بنانے کی پوری کوشش کریں جس سے اپنے زیر تربیت افراد میں تدین، امانت اور سچائی کی اس طرح پرورش کریں وہ اسلام کے زریں اصولوں کی صحیح عملی تصویر کے آئینہ دار اور مجسم دعوت و تبلیغ کا ذریعہ بنیں۔ اجلاس کے آخر میں علماء نے متفقہ طور پر کہا: ''ہم پورے اعتماد اور دیانت کے ساتھ اس بات پر یقین رکھتے ہیں پاکستان کے موجودہ حالات میں نفاذ شریعت اور ملک کو غیر ملکی تسلط سے نجات حاصل کرنے کے لیے پُر امن جدوجہد ہی بہترین حکمت عملی ہے۔

مسلح جدوجہد شرعی اعتبار سے غلط ہونے کے علاوہ مقاصد کے لیے بھی سخت مضر ہے۔ اس کا براہِ راست فائدہ ہمارے دشمنوں کو پہنچ رہا ہے اور امریکا اُسے اس علاقے میں اپنے اثر و رسوخ کو دوام بخشنے کے لیے استعمال کر رہا ہے۔ اگر کوئی شخص اخلاص کے ساتھ اُسے دین کا تقاضا سمجھتا ہے تو یہ اجتماع اس بات پر اتفاق کرتا ہے ایسے حضرات کو حالات کے تقاضوں اور ضرورتوں سے آگاہ کر کے مثبت کردار کی ادائیگی پر آمادہ کرنے کے لیے ناصحانہ اور خیر خواہانہ روش اختیار کی جائے گی۔''

نفاذِ اسلام کی طرف پیش رفت:

اس پانچ نکاتی اعلامیے پر مفتی تقی عثمانی، مفتی رفیع عثمانی، مولانا سلیم اللہ خان، مولانا فضل الرحمن، مولانا سمیع الحق، ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر، قاری حنیف جالندھری، مولانا عبدالمجید لدھیانوی، مفتی عبدالرحیم، مفتی غلام الرحمن، مولانا عبدالغنی، مولانا محمد احمد لدھیانوی، مولانا زاہد الراشدی سمیت 131 جید علما، اکابر و مشایخ اور مفتیوں کے دستخط ہیں۔ اس اہم ترین اجلاس میں 16 قراردادیں منظور کی گئیں جن کا خلاصہ یہ ہے۔

یہ اجتماع موجودہ ملکی اور علاقائی سنگین صورتِ حال کو ''اسلامی جمہوریہ پاکستان'' میں نفاذِ اسلام سے مسلسل روگردانی اور ایک اسلامی معاشرہ کی تشکیل کے تقاضوں کو نظر انداز کرنے کا منطقی نتیجہ قرار دیتا ہے اور دوٹوک رائے کا اظہار کرتا ہے قومی خود مختاری کے تحفظ اور نفاذِ اسلام کے بغیر ملک و قوم کو موجودہ دلدل سے نکالنا ممکن نہیں ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے دستور پاکستان کی

اسلامی دفعات اور اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کے مطابق نفاذِ اسلام کی طرف عملی پیش رفت کا اہتمام کیا جائے۔

یہ اجتماع قومی خود مختاری اور ملکی سلامتی کو درپیش مبینہ خطرات وخدشات کے حوالہ سے شدید تشویش واضطراب کا اظہار کرتا ہے اور حکومت سے مطالبہ کرتا ہے عوامی جذبات اور قومی مفادات کی پاسداری کرتے ہوئے اپنی داخلی اور خارجی پالیسیوں پر فوری نظر ثانی کرے اور پارلیمنٹ کی متفقہ قرارداد اور پارلیمانی کمیٹی کی سفارشات پر عمل درآمد کر کے قومی پالیسیوں کا قبلہ درست کرنے کو یقینی بنائے۔ یہ اجتماع امریکا میں پاکستانی ڈاکٹر عافیہ صدیقی کے ساتھ ناروا سلوک اور سفاکانہ د غیر منصفانہ رویے کی شدید مذمت کرتا ہے اور حکومت پاکستان سے مطالبہ کرتا ہے ڈاکٹر عافیہ صدیقی اور دیگر سیکڑوں گمشدہ یا امریکا کے حوالے کیے جانے والے مظلوم پاکستانیوں کی بازیابی اور رہائی کے لیے اپنی دستوری اور قومی ذمہ داریوں کو پورا کرے۔

یہ اجتماع سوئٹزرلینڈ میں مساجد کے میناروں پر پابندی، بعض یورپی ممالک میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گستاخانہ خاکوں کی مسلسل اشاعت، فرانس میں حجابِ شرعی کے خلاف مہم اور اس قسم کے دیگر معاملات کو اسلام کے خلاف مغربی ثقافت کے علمبرداروں کے معاندانہ رویے کا آئینہ دار سمجھتا ہے۔ دنیا بھر کی مسلم حکومتوں اور اسلامی سربراہ کانفرنس کی تنظیم "او آئی سی" سے مطالبہ کرتا ہے وہ اسلامی تعلیمات واحکام کے خلاف مغربی ثقافتی یلغار کے سدِ باب کے لیے مشترکہ پالیسی وضع کریں۔ یہ اجتماع دینی مدارس کے خلاف مختلف ایجنسیوں اور حکومتی اداروں کی روز افزوں اور مسلسل کارروائیوں پر شدید احتجاج کرتا ہے اور آپریشن سے متاثرہ علاقوں میں سیکڑوں مساجد و مدارس کے انہدام کو شرمناک قرار دیتے ہوئے حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ دینی مدارس پر چھاپوں اور ان کے اساتذہ وطلبہ کے خلاف کارروائیوں کا سلسلہ فوری بند کر کے منہدم شدہ اور متاثرہ مدارس ومساجد کی فوری بحالی کا اہتمام کیا جائے۔ بند مدارس کو کھول کر ان میں طلبہ کی رہائش وتعلیم کا نظام بحال کیا جائے۔

مقدمات ختم کرنے کا مطالبہ:

یہ اجتماع ملک میں روز افزوں مہنگائی اور لوڈ شیڈنگ کے عذاب کو غریب عوام سے زندگی

چھین لینے کے مترادف تصور کرتا ہے اور یہ سمجھتا ہے سرمایہ دارانہ، جاگیردارانہ نظام کے تسلسل اور غلط حکومتی پالیسیوں کے باعث اس عذاب میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے اور عام شہریوں پر زندگی کا دائرہ تنگ ہوتا جا رہا ہے۔ یہ اجتماع حکومت سے مطالبہ کرتا ہے عوام کو مہنگائی اور لوڈشیڈنگ کے اس عذاب سے نجات دلانے کے لیے اپنی پالیسیوں پر نظرثانی کے ساتھ ساتھ ہنگامی بنیادوں پر اقدامات کا بھی اہتمام کرے۔

یہ اجتماع ملک میں مغرب کی بے حیا ثقافت کے فروغ کے لیے این جی اوز اور میڈیا کی آزادانہ روش، حکومتی اداروں کی طرف سے اس کی حوصلہ افزائی اور قومی وسائل کے بے دریغ استعمال کو افسوس ناک قرار دیتا ہے اور اسے پاکستان کے اسلامی تشخص، قرآن وسنت کی تعلیمات اور عوام کے دینی رجحانات کے منافی سمجھتے ہوئے حکومت سے مطالبہ کرتا ہے اس پالیسی پر نظرثانی کی جائے۔ وطنِ عزیز کی اسلامی ثقافت کے تحفظ کا اہتمام کیا جائے۔ یہ اجتماع بارہ ربیع الاوّل کے روز فیصل آباد، ڈیرہ اسماعیل خان، کراچی اور بعض دیگر شہروں میں رونما ہونے والے افسوس ناک واقعات کو ملک میں فرقہ وارانہ کشمکش کو فروغ دینے کی سازش کا حصہ قرار دیتا ہے اور ان سانحات میں متاثرہ افراد اور خاندانوں کے ساتھ گہری ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے حکومت سے مطالبہ کرتا ہے ایسے واقعات کی مکمل عدالتی تحقیقات کرا کے مجرموں اور ان کے پشت پناہوں کو قرار واقعی سزا دی جائے۔

یہ اجتماع ملک کے تمام مکاتبِ فکر کے رہنماؤں اور کارکنوں سے اپیل کرتا ہے وہ موجودہ سنگین قومی صورتِ حال میں جبکہ قومی خودمختاری، ملکی سالمیت اور پاکستان کے اسلامی تشخص کو داؤ پر لگا دیا گیا ہے اور فرقہ وارانہ کشیدگی کی فضا پیدا کر کے استعماری قوتیں اپنے مذموم مقاصد کو آگے بڑھانے کا ایجنڈا رکھتی ہیں۔ قومی وحدت اور ہم آہنگی وقت کا اہم ترین تقاضا ہے۔ اس لیے کسی بھی سطح پر ایسی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی نہ کی جائے جو فرقہ وارانہ کشمکش کا باعث بن سکتی ہوں بلکہ قومی ہم آہنگی کو بڑھانے کے اقدامات کیے جائیں تاکہ قوم متحد ہو کر موجودہ بحران کا مقابلہ کر سکے۔ یہ اجتماع پارلیمنٹ میں دستوری ترامیم کے حالیہ بل میں اسلامی دفعات کے تحفظ کی

جدّ و جہد کرنے والے علمائے کرام اور دیگر ارکانِ پارلیمنٹ کو اس کامیاب جدو جہد پر مبارک باد پیش کرتا ہے اور دستور کی اسلامی دفعات کے تحفظ پر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے پارلیمنٹ سے مطالبہ کرتا ہے ان اسلامی دفعات پر موثر عمل درآمد کے لیے بھی اقدامات کیے جائیں۔

یہ اجتماع ملک بھر کے علمائے کرام اور دینی جماعتوں و کارکنوں سے اپیل کرتا ہے وہ قومی وحدت کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے باہمی اختلافات کے عمومی اظہار سے حتی الوسع گریز کریں اور مشترکہ قومی و دینی مقاصد کے لیے باہمی تعاون و اشتراک کی فضا کو فروغ دیں۔ نیز یہ اجتماع قوم کے تمام طبقات اور حلقوں سے بھی اپیل کرتا ہے قومی وحدت کے بھرپور مظاہرہ کے ساتھ بیرونی مداخلت کا راستہ روکنے کا اہتمام کریں۔ یہ اجتماع ملک بھر میں اس قسم کے مشترکہ اجتماعات کا انعقاد جاری رکھنے کا اعلان کرتا ہے۔ یہ اجتماع میڈیا سے اسلامی شعائر اور دینی حلقوں کے خلاف کردار کشی کے مسلسل پروپیگنڈے پر احتجاج کرتا ہے اور خاص طور پر ایک لڑکی کو کوڑے مارے جانے کی ویڈیو کے بارے میں اس انکشاف کی بنیاد پر کہ یہ جعلی طور پر فلمائی گئی تھی حکومت سے مطالبہ کرتا ہے اس کی انکوائری کرا کے اسلامی احکام کو تمسخر کا نشانہ بنانے والوں کے خلاف کارروائی عمل میں لائی جائے۔ ایبٹ آباد میں جلسے اور جلوس پر بے تحاشا فائرنگ اور اس کے نتیجہ میں متعدد افراد کے قتل کے واقعہ کی شدید مذمت کرتا ہے۔

یہ اجتماع کراچی میں مولانا سعید احمد جلال پوریؒ، مولانا عبدالغفور ندیم اور دیگر مختلف سانحات میں جامِ شہادت نوش کرنے والے تمام علمائے کرام کے وحشیانہ قتلِ عام کی شدید مذمت کرتا ہے، اور حکومت سے مطالبہ کرتا ہے علمائے کرام اور دیگر شہداء کے قاتلوں کو فی الفور گرفتار کر کے قرار واقعی سزا دی جائے۔ یہ اجتماع دینی مدارس کے بے گناہ اساتذہ، طلباء اور کارکنوں کو ہراساں کرنے، اغواء کرنے اور بلاوجہ مقدمات قائم کرنے کی شدید مذمت کرتا ہے اور مقدمات ختم کرنے اور ان کی رہائی کا مطالبہ کرتا ہے۔"

نصاب میں تبدیلی کی باتیں:

اس تاریخی اجلاس کا پس منظر یہ تھا کہ گزشتہ چند سالوں سے وطنِ عزیز خودکش حملوں سے گونج

رہا ہے، جس کی وجہ سے پاکستان اس وقت مشکلات کے جس گرداب میں پھنسا ہوا ہے اس پر ملک کے مذہبی اور دینی حلقوں میں گہری تشویش پائی جا رہی تھی۔ ہر دردمند مسلمان اس ملک کو امن و امان کے ماحول میں ترقی کرتا ہوا اور قومی اداروں کو پروان چڑھتا ہوا دیکھنا چاہتا ہے۔

اسی طرح اس ملک کی اسلامیت و مذہبیت کو نہ صرف باقی رکھنا چاہتا ہے بلکہ اپنے ہدف اصلی یعنی صالح اسلامی معاشروں کی تشکیل اور حکومت الٰہیہ کے قیام کی جانب گامزن دیکھنا چاہتا ہے۔ اسی تناظر میں یہ اجتماع ہوا جس سے امید ہے مسائل کی نوعیت وحساسیت نیز وجوہ اسباب معلوم ہوں گی اور پھر ممکنہ حل وتدارک کی صورتیں بھی سامنے آئیں گی۔ اول تو ہمیں مدارس کو درپیش مسائل کو اپنے غور وفکر کا محور بنانے کے بجائے ملک کی مجموعی صورتِ حال کو سامنے رکھ کر منصوبہ بندی کرنی چاہیے۔

بہرحال! مدارس کو درپیش مسائل جزوی حیثیت رکھتے ہیں جب تک کلی طور پر صورتِ حال میں بہتری نہیں آتی اور بعض بنیادی اور کلیدی نوعیت کے مسائل حل نہیں ہوتے اس وقت تک مدارس اور اہل دین کے حق میں فضا سازگار ہوتی نظر نہیں آتی۔ اگر اہل دین فقط اپنے اداروں کے بچاؤ اور حفاظت پر ہی توجہ مرکوز رکھیں گے عامۃ الناس کو درپیش مسائل پر توجہ نہیں دیں گے تو قوم اپنی مشکلات کے حل کے لیے دوسری طرف دیکھنے پر مجبور ہوگی۔ اہل دین سے روز بروز مایوس ہوتی چلی جائے گی۔ اگر قوم اجتماعی طور پر اہل دین سے اور دینی اداروں کے تقدس کی منکر ہوگئی تو ان اداروں کی بقاء وترقی کو شدید مشکلات پیش آنے کا اندیشہ ہے۔

اللہ کا بے پایاں احسان وکرم ہے ہم آج ایک ایسے ملک میں بیٹھے ہیں جس کو بعض ایسی خصوصی امتیازات حاصل ہیں 57 اسلامی ملکوں میں سے کوئی ملک بھی ان میں اس کی ہمسری تو درکنار پاسنگ میں بھی نظر نہیں آتا۔ ان امتیازی خصوصیات کا تذکرہ اس لیے ضروری ہے تاکہ ہمیں ان کی قدر معلوم ہو اور ان مواقع سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کا موقع ملے۔

ان نمایاں ترین خصوصیات کو نمبروار یوں بیان کیا جاسکتا ہے۔ نمبر ایک، پاکستان میں دینی اداروں، تحریکوں اور مسجد ومنبر کو جو مذہبی آزادی حاصل ہے وہ کسی اسلامی ملک میں نہیں ہے۔ آپ جو چاہیں پڑھائیں، جو چاہیں لکھیں اور جو چاہیں بولیں۔ اخبارات کی حد تک علماء کی زبان بندی

اور مدارس کے نصاب میں تبدیلی کی بہت باتیں ہوتی ہیں مگر عملاً ہمارے نصاب میں ایک شوشہ کی تبدیلی نہیں کی جاسکی۔

عالم اسلام کا بہت بڑا اثاثہ:

اگر موجودہ اسلامی دنیا کے اہم ممالک مصر، شام، ترکی وغیرہ کے حالات پر اس حوالے سے ایک نظر ڈالی جائے تو فرق خوب معلوم ہوسکتا ہے۔ جہاں آزاد دینی مدارس ناپید اور منبر و محراب کے حلق سے سرکار کی صدا ہی بلند ہوسکتی ہے۔ نمبر دو، عوام میں دین کے لیے قربانی دینے کا غیر معمولی جذبہ پایا جاتا ہے۔ دینی تہذیب و تمدن کے جو مظاہر اس وقت پاکستان میں دیکھے جاسکتے ہیں اس پر بجا طور پر عالم کفر ازحد پریشان ہے۔ دینی تحریکوں کے لیے جو بے مثال قربانی دی گئی اسی طرح ناموس رسالت اور اس جیسے دیگر حساس معاملات پر قوم میں دینی غیرت اور حمیت کی جو ایک برق دوڑ جاتی ہے وہ مذہب کے ساتھ والہانہ تعلق کا ثبوت ہے۔

نمبر تین، پاکستان کے عوام کو جہاد کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ تین جنگیں ہندوستان سے ہوئیں جس کو جہادی جوش و خروش کے ساتھ لڑا گیا اور اس طرح افغانستان میں ہونے والے جہاد کے تینوں ادوار میں پاکستان ایک بیس کیمپ کے طور پر استعمال ہوا۔ چاہے وہ روس سے جہاد کا دور تھا یا طالبان کا سات سالہ دور یا نیٹو فورسز کے خلاف موجودہ جہاد، جس کو نو سال ہوچکے ہیں۔ جہاد سے اس قریبی تعلق اور مشاہدے نے بھی سرفروشی اور جفاکشی کے جذبات عموماً پیدا کیے ہیں جس سے مادہ پرستی اور تنعم کی زندگی بسر کرنے والی قومیں کوسوں دور ہوتی ہیں۔ نمبر چار، پاکستان کی جغرافیائی اہمیت اس کو عالم اسلام میں ایک غیر معمولی مقام دلاتی ہے۔ ایک طرف بحیرۂ عرب ہے جو ایک آبی شاہراہ ہے۔

دوسری طرف گلوب پر غیر معمولی اہمیت رکھنے والے چین، ہندوستان اور ایران جیسے ممالک ہیں۔ تیسری طرف افغانستان ہے جو وسطی ایشیائی ریاستوں کے لیے گیٹ وے کی حیثیت رکھتا ہے۔ امریکا اور اس کے چالیس اتحادیوں کا غیر معمولی نقصانات اٹھانے کے باوجود اس خطے کو چھوڑنے سے گریز اس کی بے انتہا اہمیت کے لیے کافی ہے۔ نمبر پانچ، عالم اسلام کی سب سے

بڑی اور مضبوط فوج پاکستان کی ہے جو جدید ترین ہتھیاروں سے لیس ہے۔فوج کی اسلام دشمن پالیسیوں سے سو بار اختلاف کیا جا سکتا ہے اور کیا جاتا ہے مگر عالم کفر کو کسی اسلامی ملک میں اس قسم کی تربیت یافتہ، عددی طور پر بہت بڑا حجم رکھنے والی اور اپنی پیشہ ورانہ صلاحیتوں کا دنیا بھر سے لوہا منوانے والی فوج کا وجود کسی طور قابل قبول نہیں۔

اسی طرح موجودہ دور میں تمام بڑے فیصلے انٹیلی جنس رپورٹس اور خفیہ جاسوسی و تحقیقاتی اداروں کی رائے کے مطابق کیے جاتے ہیں۔اس حوالے سے پاکستان کا فوجی ادارہ آئی ایس آئی اپنی پیشہ ورانہ صلاحیتوں کی وجہ سے دنیا کی چند بڑی انٹیلی جنس ایجنسیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔اگر اس کا رخ صحیح ہو جائے تو یہ عالم اسلام کا بہت بڑا اثاثہ ہے جس سے پوری اسلامی دنیا کو غیر معمولی فوائد حاصل ہو سکتے ہیں۔

اسباب اور ممکنہ حل:

نمبر چھ، پاکستان کا آئین اس ملک میں اسلام کو جو تحفظ دیتا ہے وہ اپنی نوعیت کا ایک منفرد اور قابل قدر دستوری تحفظ ہے اور اس میں اسلام کو ریاست کا سرکاری مذہب ماننا، حاکمیت اعلیٰ اور اقتدار اعلیٰ کا مالک اللہ کو ماننا، قرآن وسنت کے خلاف قانون سازی کا ممنوع ہونا، اسلامی تہذیب اور عربی زبان کو فروغ دینے کا حکومتوں کو پابند کرنا، صدر و وزیر اعظم کا مسلمان ہونا وغیرہ وغیرہ ایسی دفعات ہیں جو سعودی عرب کے علاوہ شاید ہی کسی اسلامی ملک کے قانون کا حصہ ہوں۔نیز جید علمائے کرام کی تیار کردہ قرارداد مقاصد آئین کا مستقل حصہ ہے۔

نمبر سات، پاکستان عالم اسلام کا واحد ایٹمی صلاحیت سے لیس ملک ہے۔بلکہ اس وقت اس کا شمار دنیا کے فقط ان آٹھ ممالک میں ہوتا ہے جو ایٹمی طاقت کہلاتے ہیں۔آج پاکستان کو اسی جوہری صلاحیت سے محروم کرنے کے لیے عالم کفر ہر سطح تک جانے کے لیے تیار ہے۔پاکستان کی اسی جوہری صلاحیت پر بھروسہ کر کے بہت سے اسلامی ممالک اپنے دشمنوں کے خوف سے آزاد ہیں۔حرمین شریفین کی طرف اٹھنے والی میلی نگاہوں کے راستے میں ایک بڑی رکاوٹ پاکستان کی فوجی اور جوہری صلاحیت ہے۔جس کا ماضی میں ان کو تجربہ ہو چکا ہے۔"واعدو لھم ما استطعتم ......"

کی اس دور کی سب سے اعلیٰ صورت جوہری صلاحیت ہی ہے جو بفضل خدا اس ملک کو حاصل ہے۔

ان خصوصیات کو دیکھتے ہوئے پاکستان کو بلا شرکت غیرے عالم اسلام کا قائد اور رہنما مانا جاسکتا ہے۔ اس ملک کو پہنچنے والا کوئی بھی نقصان در حقیقت دین، دینی اداروں، دینی محنتوں اور اسلامی تہذیب وتمدن کا نقصان ہوگا اور چونکہ بظاہر کوئی متبادل جگہ یا ملک بھی نظر نہیں آرہا جہاں کئی صدیوں کی محنت کے اس اثاثے کو ٹھکانہ مل سکے تو ان حالات میں اس بات کو بخوبی سمجھا جاسکتا ہے کہ ملک کو کوئی نقصان پہنچا تو وہ دین کو پہنچنے والا ناقابل تلافی نقصان ہوگا۔ کسی بھی ملک میں انتشار و بے چینی اور شکست و ریخت کے پیدا کرنے کے لیے اگر تین میدانوں میں دشمن کو پیش رفت کا موقع مل جائے تو پورے ملک کی سلامتی داؤ پر لگ جاتی ہے: امن وامان۔ معاشی بدحالی۔ میڈیا۔ اگر غور کیا جائے تو پاکستان اس وقت ان تینوں میدانوں میں شدید مشکلات اور آزمائش سے دوچار ہے۔

امن وامان کے حوالے سے افغانستان اور عراق کے بعد پوری دنیا میں پاکستان کی حالت دگرگوں ہے۔ ڈرون حملے ہورہے ہیں۔ امریکی تھنک ٹینک کے مطابق کراچی سمیت پورے پاکستان میں محدود علاقوں میں حملوں کا آغاز ہونے والا ہے۔ عالمی طاقتوں نے اسی ناگفتہ صورتِ حال کی وجہ سے جوہری اثاثوں کی حفاظت سے متعلق اپنی شدید تشویش کا بار بار اظہار کیا ہے۔ عالمی تجزیہ نگاروں نے یہ لکھا ہے جوہری اثاثوں کی حفاظت کے پیش نظر نیٹو فورسز یا اقوام متحدہ کی امن فوج کی پاکستان میں تعیناتی کے امکان کو خارج نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح معاشی طور پر ملک روز بروز تباہی کے دہانے کی طرف بڑھتا ہوا نظر آرہا ہے۔ ضروریات زندگی اس قدر مہنگی ہوچکی ہیں کہ عام آدمی کا جینا دوبھر ہوگیا ہے۔ فوج اور قومی اداروں کے ہوش ربا اخراجات پورے کرنے کی بظاہر کوئی صورت سامنے نہیں ہے۔ اہم قومی ادارے جو اربوں روپے کماتے تھے آج اربوں روپے کے خسارے میں جارہے ہیں۔ اس صورتِ حال میں ملک کی نااہل اور بدعنوان سیاسی قیادت سے چند ٹکوں کے عوض کچھ بھی منوایا جاسکتا ہے۔ خاص طور پر دین اور دینی اداروں کو قربانی کا بکرا بنانے میں تو شاید ان کو ایک لمحہ کا بھی تامل نہ ہو۔ اس معاشی بدحالی اور اس کے اسباب، غیر معمولی بدعنوانی، کرپشن اور اس کے اسباب اور ممکنہ حل کی جانب علماء کو خصوصی توجہ مبذول کرنے

کی ضرورت ہے۔

حالات کی کروٹیں:

ان حالات میں میڈیا کو بھی ذمہ داری کا احساس کرنا چاہیے۔ عوامی رائے میڈیا کے ہاتھ میں ہے۔ وہ ملک کا جو ماحول بنانا چاہیں چند لمحوں میں بنا سکتے ہیں۔ اسی طرح عالمی طاقتیں کسی ملک میں اپنے اثر و نفوذ کے اضافے بلکہ اس کے مکمل نظام کو اپنے ہاتھ میں لینے کے لیے جو تین چار بڑے اقدامات کرتی ہیں وہ بھی اس وقت پاکستان میں پورے جوبن پر نظر آ رہے ہیں۔ اس میں پہلا نمبر غیر سرکاری تنظیموں یعنی این جی اوز کے ذریعہ رفاہی خدمات کا ایک جال بچھا دیا جاتا ہے۔ عامۃ الناس کی ضروریات اور توقعات کو ان اداروں سے اس طرح وابستہ کر دیا جاتا ہے کہ ایک قسم کی متوازی حکومت قائم ہو جاتی ہے۔ پاکستان میں اس وقت کئی ہزار این جی اوز اپنے لاکھوں کارکنوں اور کھربوں روپے کے بجٹ کے ساتھ مصروف کار ہیں جس کے تباہ کن نتائج سامنے آنا شروع ہو چکے ہیں۔

کئی ملٹی نیشنل کمپنیاں حکومتوں سے بدر جہا زیادہ مالدار ہوتی ہیں۔ یہ تیسری دنیا کے ملکوں کی حکومتوں کے ردوبدل میں کلیدی کردار ادا کرتی ہیں بلکہ امریکا جیسے ملک میں بھی الیکشن پر سب سے زیادہ اثر انداز ہونے والا عامل ملٹی نیشنل کمپنیوں کو مانا گیا ہے۔ یہ اپنی مصنوعات کی فروخت کے لیے مادہ پرست اور مادر پدر آزاد ماحول بناتی ہیں۔ اسلامی تہذیب اور مشرقی روایات و تمدن کو جتنا بڑا خطرہ ان اداروں سے ہے شاید ہی کوئی اور چیز اس سے زیادہ خطرناک ہے۔ گزشتہ سال ایک معروف ملٹی نیشنل کمپنی کی جانب سے کراچی میں ڈھائی ہزار لوگوں کی اجتماعی طور پر ڈاڑھی مونڈھنے کی تقریب اور اس کے ذریعہ بین الاقوامی ریکارڈ قائم کرنے کے عزم کا اظہار ان کے کارناموں کی ایک معمولی جھلک ہے۔

اسی طرح سول اور فوجی بیوروکریسی میں اپنے ہمدردوں کی تعیناتی اور ذہنی طور پر مغربیت زدہ افراد کو کلیدی مناسب تک پہنچانا جو عالمی طاقتوں کے آلہ کار ہوں، ان قوتوں کا قدیم طریقہ ہے۔ گوروں کے ان کالے غلاموں کے سیاہ کارناموں سے ہماری ملکی تاریخ بھری پڑی ہے۔ انگریز ہم پر جو نظام تعلیم مسلط کر گیا ہے ایک تو اس کا خاصہ یہ ہے کہ اس نظام سے گزرنے والے افراد اپنا

وزن انہی کے پلڑے میں ڈالیں گے اوران کو اپنی ذہنی تشکیل میں اہم کردار ادا کرنے والوں سے کوئی بُعد محسوس نہیں ہوگا۔ پھر بدعنوان اور کرپٹ افراد کو چن چن کروہ اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ پاکستان کی موجودہ قیادت میں یہ چہرے نامعلوم نہیں ہیں۔ اس ساری صورتِ حال سے توہم کافی عرصے سے دوچار تھے۔ گیارہ ستمبر کے بعد ہماری مشکلات میں بے پناہ اضافہ ہوااور ہمارے حالات نے یکسر ایک نئی کروٹ لی ہے۔

ہم چو من دیگرے نیست:

ہماری قومی اور خارجہ پالیسی نے پاکستان کے اسلامی تشخص، خودمختاری، ملکی سلامتی اور ریاستی مفادات کوشدید نقصان پہنچایا۔ امریکا نواز پالیسیوں کے نتیجہ میں عوام میں عموماً اور مذہبی طبقہ میں خصوصاً ریاستی اداروں کے خلاف جونفرت اور اشتعال کا ماحول بناوہ قابل فہم ہے۔ پھراس نفرت و اشتعال کوختم کرنے کے لیے جن اقدامات کا سہارالیا گیا، اس نے صورتِ حال کومزید خراب اور ماحول کو بہت آلودہ کردیا۔ مذہبی طبقہ کے نوجوان اس وقت غم وغصہ اوراشتعال کی جن منزلوں پر کھڑے ہیں اس میں سب سے بڑاعامل ہمارے حکمرانوں کی ناعاقبت اندیشی اوردین دشمنی ہے مگراس حقیقت کے اعتراف کے باوجوداس میں کوئی کلام نہیں نوجوانوں کی اس جذباتیت اوراس کے نتیجہ میں اٹھائے گئے بعض اقدامات نے جہاں عوام کے دلوں میں ایک خوف ودہشت اور باہم قدرے تنفر کا ماحول پیدا کیا ہے وہاں دینی اداروں اور دینی محنتوں کی مشکلات میں بھی بے پناہ اضافہ کیا ہے، مگر ہم کو بہت ٹھنڈے دل سے اپنے نوجوانوں کی جذباتیت کے اسباب اوراس کے درپردہ عوامل پرغورکرنا چاہیے تاکہ اس کے تدارک کی جانب پیش قدمی کی جاسکے۔

بادی النظر میں چندعوامل اہم معلوم ہوتے ہیں۔ حکمرانوں کی امریکا نواز پالیسیاں اور مغرب زدہ سوچ۔ ذہنی طور پر مفلوج ومرعوب سیاسی قیادت کی غلامانہ ذہنیت۔ سیکولر طبقے اور ذرائع ابلاغ کی جانب سے شعائرِ اسلام کی توہین اورضروریاتِ دین کا انکار۔ دینی قیادت میں اتحادویکجہتی کا فقدان اور روز بروز بڑھتے ہوئے اختلافات۔ تاریخ وسیرت سے ناواقفیت اورفقہ کے درست فہم کی شدید کمی۔ ان اسباب کو دیکھتے ہوئے ان کا تدارک ہی دراصل ہماری اولین ذمہ داری ہے۔ ملک وملت کے خیرخواہ ہر

عالم کو اس صورتِ حال میں اصلاح احوال کی کسی کوشش میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرنا چاہیے۔

اگر فوری اقدامات کی طرف بڑھا جائے تو درج ذیل اقدامات اس صورت حال میں بہتری لا سکتے ہیں: نمبر ون، ہر سطح پر اجتماعیت اور اتحاد و اتفاق کا ماحول پیدا کرنا ہوگا۔ کس قدر افسوس کا مقام ہے سامراج تو افغانستان جیسے چھوٹے سے ملک پر جو تین دہائیوں کی جنگ کے نتیجہ میں بالکل تباہ حال ہے، حملہ کرنے کے لیے سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح کھڑا نظر آئے اور ہم اہل دین جو امت کی رہنمائی و پیشوائی کے مدعی ہیں چھوٹے چھوٹے اختلافات کی وجہ سے ٹکڑوں اور اکائیوں میں بٹے رہیں۔ اجتماعیت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب اپنی طبیعتوں اور مزاجوں کو اجتماعی بنایا جائے۔ صبر، حوصلہ، برداشت، وسعت ظرفی، قربانی، حسن ظن اور خود پیچھے رہ کر دوسرے کو آگے بڑھانے کا ماحول بنانا ہوگا۔ عدم برداشت، تنقید، تعلّی اور ''ہم چو من دیگرے نیست'' کے ماحول میں اجتماعی سوچ کیسے سامنے آسکتی ہے؟

ارباب مدارس کو مشورہ:

حکمرانوں کی امریکا نواز پالیسیوں کے خلاف بھرپور موقف اپنایا جائے۔ مذہبی قیادت اس حوالے سے عوامی جذبات کی نمایندگی کرے اور ملک پر بڑھتے ہوئے مغربی اثر و رسوخ، جغرافیائی اور نظریاتی سرحدوں کی پامالی اور غلامانہ ذہنیت کے فروغ کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہ کیا جائے۔ اس کے لیے پرامن اور مؤثر احتجاج کے تمام طریقوں اور صورتوں پر غور و فکر کیا جائے اور منظم انداز میں اپنا احتجاج ریکارڈ کرایا جائے۔ نمبر تھری، دینی جماعتوں، اداروں اور تحریکوں کی ذہنی سطح کو بلند اور کارکنوں کے ذہنی افق کو روشن کرنے کے لیے تاریخ و سیرت کے علم اور فقہی احکامات کے فہم میں جو کمزوری اور سقم آرہا ہے اس کو دور کیا جائے۔

نوجوانوں کو شریعت کے ضابطوں اور قاعدوں کی پابندی کی عادت ڈلوائی جائے اور جذباتی نعروں اور پرجوش تقریروں کے بجائے شرعی مسائل پر اکابر کی رائے کا پابند بنایا جائے۔ شرعی مسائل میں خودرائی اور آزادی کی ہرگز اجازت نہ دی جائے۔ اسی طرح سیرت طیبہ سے حکمت، تدریج اور صبر و حوصلے کے واقعات کو درسی انداز میں پڑھایا جائے اور اطاعت و انقیاد کی تربیت دی

جائے۔ نمبر فور، ماضی قریب کے علماء نے برصغیر میں انگریز سامراج کے مقابلے کے لیے جو پالیسی اختیار کی تھی وقت نے اس کو بہت کامیاب ثابت کیا ہے۔

آج برصغیر میں پورے عالم اسلام کے مقابلے میں جو دین کا چرچا نظر آتا ہے وہ اسی کامیاب حکمت عملی کا شاندار نتیجہ ہے۔ اس طریقہ کار سے نوجوانوں کو واقف کرایا جائے اور ان کو بتایا جائے کہ حفاظت دین کی کیا کیا صورتیں ہو سکتی ہیں؟ اس پر امن پالیسی کے برعکس باقی عالم اسلام میں پر جوش مذہبی قیادت نے ٹکراؤ کی پالیسی اختیار کی جس کے نتیجے میں آزاد دینی مدارس کا وجود صفحہ ہستی سے مٹا دیا گیا، منبر و محراب کو سرکار کا مکمل پابند کر دیا گیا۔ آج وہاں منبر کی صدا اور وزارت اطلاعات و نشریات کے پریس ریلیز میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔

مغربی تہذیب نے ایسے پنجے گاڑے ہیں کہ علماء و مشائخ کی وضع قطع اور حلیے تک مغرب زدہ کر دیے ہیں۔ نوجوانوں کو اپنے سابقہ اور موجودہ اکابر سے فکری اور نظریاتی طور پر جوڑنے کی کوشش کی جائے۔ اس مقصد کے لیے ایک انتہائی اعلیٰ سطحی ''ھیئۃ العلماء''..... جس میں ہمارے طبقہ کے چوٹی کے تین چار فقہاء ہوں..... بنائی جا سکتی ہے جو نئے پیش آنے والے مسائل پر فوری غور کر کے شرعی مسئلہ کی روشنی میں اپنی رائے یا فتویٰ بروقت جاری کرے۔

بے بسی اور بے حسی کا حال:

ان گزارشات پر ڈیڑھ سو کے قریب علماء و مشائخ نے غور کیا اور تہیہ کیا ان شاء اللہ وقتاً فوقتاً ایسے اجلاس ہوتے رہیں گے۔ پاکستان جو ایک عرصے سے خودکش حملوں سے گونج رہا ہے، جس کی وجہ سے ملک میں انتشار، بدامنی، انارکی، لاقانونیت اور اندھیر نگری چوپٹ راج والی کیفیت تھی، اس تاریخ ساز اجتماع نے جہاں اسے کم کرنے میں اہم کردار ادا کیا وہاں ہمارے دین سے محبت رکھنے والے طبقے کو بھی یہ پیغام گیا کہ علمائے اسلام اور پاکستان پر بیک وقت ٹوٹنے والی آفتوں سے بے خبر نہیں اور اس کے ازالے کی کوششوں کا محاذ انہوں نے چھوڑا نہیں۔

پورے پاکستان کے جید علمائے کرام اور مشائخ عظام نے متحد ہو کر یہ ثابت کر دیا ہے ان سے زیادہ محب وطن کوئی نہیں۔ اسلامی جمہوریہ کہلانے والے ملک میں اسلام کا نام لینے پر ستائے

جانے والوں کا ''پاکستان نہ کھپے'' ریلی نکالنے کے بجائے یہ کہنا کہ جب تک ہم زندہ ہیں کوئی پاکستان کی طرف میلی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا۔ اس سے بڑی وطن کی محبت کیا ہوگی، لیکن افسوس اس بات پر ہے کہ جامعہ اشرفیہ لاہور میں ہونے والے تاریخ ساز اجتماع جو وقت کے نازک اور اہم ترین موضوع پر منعقد ہوا تھا...... کو میڈیا نے کوریج نہیں دی۔ اگر ملک بھر میں ڈیڑھ سو کے قریب نمائندہ علماء کی باتوں، مشترکہ اعلامیے اور قراردادوں کی صحیح طریقے سے تشہیر کی جاتی تو داخلی سطح پر عسکری رویوں میں واضح تبدیلی متوقع تھی۔

جون 2010ء میں جب اقوام متحدہ کی طرف سے بے نظیر بھٹو کے قتل کی تحقیقات سامنے آئیں تو اسٹیبلشمنٹ کی طرف سے اصل ملزموں اور مجرموں کو چھپانے اور حقائق پر پردہ ڈالنے کے لیے سارا نزلہ دینی مدارس پر ڈال دیا گیا۔ رپورٹ کے مطابق ملک کے معروف اور قدیم دینی، مذہبی اور عصری علوم کی عظیم درسگاہ جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کو بے نظیر قتل کیس میں ملوث کرنے کی گھناؤنی اور بھونڈی کوشش کی جارہی ہے۔ رپورٹ میں کہا گیا بے نظیر بھٹو کو قتل کرنے کی سازش یہاں تیار کی گئی۔ یہ بات کہتے ہوئے کسی کو شرم نہیں آئی۔ سب جانتے ہیں بے نظیر بھٹو کو کس نے قتل کیا؟ کن کے اشاروں پر مارا گیا؟ ان کے خون کے چھینٹے کن کن کے دامنوں اور آستینوں پر ہیں؟

اصل بات یہ ہے امریکا اور اس کے اتحادیوں نے اپنا ہدف اور ٹارگٹ دینی مدارس کو بنالیا ہے۔ ان کا بغیر کسی ثبوت اور دلیل کے کہنا یہ ہے ان مدارس نے طالبان کو پیدا کیا ہے اور کررہے ہیں۔ ان کی تمام سرگرمیوں کے ذمہ دار یہی ہیں، حالانکہ پاکستان بھر کے مدارس کی تنظیمیں اور ان کے ذمے دار حضرات ایک سے زائد مرتبہ اس کی تردید کرچکے ہیں کہ ان کے ہاں اس طرح کی کوئی تربیت دی جاتی ہے۔ امریکا جس کی لاٹھی اس کی بھینس کی پالیسی اپنائے ہوئے ہے۔ وہ اپنی طاقت کے بل بوتے پر سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنے کا عادی ہوچکا ہے۔ ہمارے حکمرانوں کی بے بسی اور بے حسی کا حال یہ ہے کہ وہ امریکا سے کسی بھی کارروائی کی وضاحت مانگتے ہیں اور نہ ہی ان میں یہ جرات ہے۔

سازشوں کا سدباب:

دینی مدارس کھلی کتاب کی طرح ہیں۔ ان میں نہ کسی کے آنے پر پابندی ہے اور نہ ہی ان کے

ہاں کسی بھی طرح کی کوئی خفیہ کارروائی ہوتی ہے۔ ہم پورے وثوق سے کہتے ہیں پاکستان بھر میں کوئی بھی ایسا مدرسہ نہیں جس میں عسکری تربیت یا دہشت گردی کی کوئی تعلیم دی جاتی ہو۔ پاکستان کے دینی مدارس ایک لمبے عرصے سے ملکی ہی نہیں عالمی سطح پر دہشت گردی، رواداری، عدم برداشت اور اظہار رائے کی آزادی سمیت مختلف حوالوں سے زیر بحث ہیں۔ خصوصاً نائن الیون کے بعد کی دنیا میں تو ان کو اس طرح نشانے پر لیا گیا ہے جیسے اس اندوہناک واقعے کے ذمہ دار دینی مدارس ہوں۔

جب امریکا نے نام نہاد دہشت گردی کے خلاف جنگ کا آغاز کیا تو پاکستان کے دینی مدارس بھی اس کی زد میں آ گئے اور امریکا نے بالواسطہ طور پر بھی ان کو اپنا ہدف بنالیا ہے۔ جہاد کے دہشت گردی قرار پانے کے بعد میڈیا کے زور پر یہ باور کرایا گیا پاکستان کے دینی مدارس جہاد بمعنی دہشت گردی کی نرسریاں ہیں اور ان مدارس میں دہشت گردی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ مدارس پر یکطرفہ طور پر ''فردِ جرم'' عائد کرنے کے بعد دوسرے مرحلے میں انہیں ختم یا ان کا کردار محدود کرنے کے لیے منصوبے بنے گئے ہیں۔ اس ضمن میں کبھی مدارس کے نصاب میں تبدیلی کی ضرورت کو اُجاگر کیا گیا۔ کبھی اس سے بھی آگے بڑھ کر ان کی مشکیں کسنے کے لیے سخت ترین کارروائیاں تجویز کی گئیں اور یہ سلسلہ اب بھی پوری طرح جاری ہے۔ مدارس اب بھی امریکا اور اس کے اتحادیوں کے عتاب کا شکار ہیں۔

پہلے پرویز مشرف حکومت اور اب موجودہ جمہوری حکومت بھی براہِ راست امریکی احکامات یا امریکی اداروں اور ذرائع ابلاغ کی رپورٹوں، جو درحقیقت ان کی خواہشات کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ موجودہ حکومت اس حد تک دباؤ کا شکار ہے کہ وہ مدارس کی قیادت کے ساتھ مذاکرات کے دوران ان کے حسن کردار، فروغ تعلیم میں ان کے حصے اور دہشت گردی سے ان کے عدم تعلق کے اعتراف کے باوجود بیرونی اشارہ ملتے ہی سب کچھ بھول کر ایک دفعہ پھر ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ ان کا کسی عسکریت پسندی یا دہشت گردی سے کوئی تعلق نہیں۔ اس ضمن میں ان پر الزامات لگانا عناد کا شاخسانہ ہے۔ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کو بے نظیر بھٹو کے قتل کی کسی بھی سازش میں ملوث کرنا

بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

اس پر دینی مدارس کی نمائندہ تنظیموں اور تمام مذہبی جماعتوں کو پرزور احتجاج کرنا چاہیے۔ اگر تمام مدارس کی تمام تنظیموں اور مذہبی سیاسی جماعتوں نے باہم مل کر اس پر مؤثر احتجاج نہ کیا۔ اس طرح کے بے بنیاد الزامات اور بھونڈی سازشوں کا سد باب نہ کیا تو خاکم بدہن مستقبل میں کوئی بھی مدرسہ، جامعہ اور دار العلوم محفوظ نہیں رہے گا۔

مدرسہ کس چیز کا نام ہے؟

ادھر دینی مدارس پر یلغار کرنے والے سرکاری اہلکاروں کو یاد رکھنا چاہیے اگر آپ ان اداروں کی عمارتوں پر قبضہ کرلیں یا انہیں مسمار کردیں تو آپ اپنے مقصد میں پھر بھی کامیاب نہیں ہوسکیں گے۔ اس لیے کہ عمارت کے منہدم ہونے سے دینی تعلیم کو اگر آج تک کوئی نہیں روک سکا تو آیندہ بھی کوئی نہیں روک سکے گا۔ مفتی محمود رحمہ اللہ نے فرمایا تھا: "مدرسہ عمارت کا نام نہیں بلکہ مدرسہ استاد، شاگرد اور کتاب کے تعلق کا نام ہے۔ اگر حکومت نے مٹی اور گارے سے بنی عمارتوں پر قبضہ کرلیا تو ہم درختوں کے سائے میں چٹائیاں بچھا کر تشنگانِ علوم اسلامیہ کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کریں گے۔"

حضرت مولانا محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ سے پوچھا گیا اگر حکومت نے آپ سے مدارس چھین لیے تو آپ کیا کریں گے؟ تو انہوں نے برجستہ فرمایا: "میں کسی دیہات میں ویران اور بند مسجد کو کھلوا کر جھاڑو لگاؤں گا۔ اذان اور باجماعت نماز کا اہتمام کروں گا اور اہلِ محلہ سے درخواست کروں گا اپنے بچوں کو پڑھنے کے لیے بھیجیں۔" لہٰذا حکومت کو چاہیے وہ دینی مدارس کے خاتمے یا ان پر الزام تراشی سے باز آجائیں اور ان کے ساتھ ہر طرح کا تعاون کر کے اپنی آخرت بہتر بنائیں۔

نائن الیون کے بعد:

نائن الیون کے بعد دہشت گردی اور دہشت گردی کے خلاف عالمی جنگ کا جو امریکا نے ڈھنڈورا پیٹا ہے، اس کے کئی مقاصد ہیں۔ ایک مقصد مسلم دنیا کے علماء و طلبہ کو بدنام کرنا، قرآن میں موجود آیات جہاد اور اس کی تعلیم کو دہشت گردی سے منسلک کروانا ہے۔ پاکستان کے اندر لسانی یا فرقہ ورانہ یا دہشت گردانہ فسادات کرانے سے امریکا کا پہلا مذموم مقصد دستور پاکستان کی شرعی

حیثیت کا خاتمہ کر کے اسے سیکولر نظام کی شکل دینا ہے۔ ہم نے ایک قرارداد پاس کرائی تھی ہمارے ملک کی پارلیمنٹ نے دستور پاکستان کی ''اوور ہالنگ'' کے لیے ایک پارلیمانی کمیٹی قائم کی ہے جو دستور پاکستان کے اندر ترامیم کرے گی۔

اس پارلیمانی کمیٹی کے پاس بعض سیکولر سیاسی جماعتوں، بعض غیر سیاسی سیکولر اداروں اور ہیومن رائٹس کی بعض تنظیموں، بعض اقلیتی گروہوں اور سیکولر لابیوں کی طرف سے انتہائی خطرناک اور اسلام دشمنی پر مبنی مطالبات سامنے آرہے ہیں۔ یہ کمیٹی اس فکر اور مقصد کو سامنے لے کر بیٹھی ہے کہ دستور اور اسلامی دفعات کا خاتمہ کیسے ممکن ہے؟ اس پارلیمانی کمیٹی کے سامنے جو مطالبات اور سفارشات پیش کیے جارہے ہیں اندازہ کیجیے وہ کیا ہیں؟

ان اسلام دشمن سیکولر اور لبرل لابیوں کا پہلا مطالبہ یہ ہے پاکستان کی آئینی اور دستوری حیثیت تبدیل کی جائے۔ پہلے یہ اسلامی جمہوریہ پاکستان ہے اب اسے عوامی جمہوریہ پاکستان بنایا جائے۔ 1973ء کے آئین میں اس کو جو اسلامی حیثیت دی گئی ہے، وہ یکسر ختم کردی جائے۔

دراصل دستور کے ''آرٹیکل ون کی شق نمبر ون'' میں صراحت کی گئی ہے کہ مملکت پاکستان ایک وفاقی جمہوریہ ہوگی جس کا نام اسلامی جمہوریہ پاکستان ہوگا جسے بعد ازیں پاکستان کہا جائے گا۔ اسلام دشمن سیکولر لابیاں اس شق کو دستور سے ختم کرانے کی سازشوں اور کوششوں میں مصروف ہیں۔ اسلام دشمن سیکولر لابیوں کی طرف سے دوسرا مطالبہ یہ کیا جارہا ہے کہ قرارداد مقاصد کو دستور سے خارج کردیا جائے۔ قیام پاکستان کے بعد ملک کے اندر قانون سازی کے لیے کچھ اصول وضع کیے گئے تھے جو علامہ شبیر احمد عثمانی نے اپنے دیگر رفقا سے مل کر مرتب کیے تھے۔

''کھڈے لائن'' لگانے کی کوششیں:

ان اصولوں کو قرارداد مقاصد کا نام دیا گیا یعنی قیام پاکستان کے مقاصد کی قرارداد۔ اس قرارداد مقاصد کو آئینی طور پر تسلیم کیا گیا۔ اس میں اس بات کی وضاحت وضمانت موجود ہے کہ اللہ ہی کائنات کا بلاشرکت غیر حاکم ہے۔ پاکستان کے اندر جمہوری طریقہ سے جو حکمران برسر اقتدار آئیں گے وہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ حدود کے اندر ہی اپنا اختیار استعمال کرسکیں گے۔ اور یہ اقتدار

واختیاران کے پاس اللہ تعالیٰ کی مقدس امانت ہوگا۔
وہ ملک کے اندر جمہوریت، آزادی، مساوات، رواداری اور عدل وانصاف کے اصولوں پر اسلامی تعلیم وتشریح کی روشنی میں عمل کریں گے۔ وہ اپنی اور دیگر مسلمانوں کی زندگی کو قرآن وسنت اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ڈھالنے کی کوشش کریں گے۔ گویا قرارداد مقاصد کے اندر اس بات کی ضمانت موجود ہے کہ پاکستان کی پارلیمنٹ اور حکومت قرآن وسنت کے خلاف کسی قسم کی غیر اسلامی قانون سازی نہیں کرسکتی۔ یہ قرارداد مقاصد 1973ء کے دستور میں صرف ایک ''دیباچہ'' تھی۔ جنرل ضیاء الحق مرحوم نے اسے صدارتی آرڈی نینس کے ذریعے دستور کا باقاعدہ حصہ بنادیا جسے 1985ء کی منتخب پارلیمنٹ نے پارلیمنٹ کے اندر باقاعدہ منظور کر کے باقاعدہ دستور کا حصہ تسلیم کرلیا۔ آج وہ دستور کا باقاعدہ حصہ ہے۔
چند سال قبل جب جسٹس نسیم حسن شاہ سپریم کورٹ کے چیف جسٹس تھے، سپریم کورٹ میں ایک درخواست دائر کی گئی تھی جس میں تقاضا کیا گیا تھا قرارداد مقاصد کو دستور کی باقی دفعات پر بالادستی کا فیصلہ دے کر غیر اسلامی قانون سازی کا ہمیشہ کے لیے راستہ بند کیا جائے لیکن سپریم کورٹ کے 9 رکنی بینچ نے یہ درخواست خارج کردی۔ اگر اس وقت سپریم کورٹ قرارداد مقاصد کی بالادستی کا فیصلہ کردیتی تو آج ان تمام بحثوں کا دروازہ بند ہوجاتا۔ جن میں پاکستان کے اسلامی ریاست یا سیکولر اسٹیٹ ہونے پر بیان بازیاں ہورہی ہیں۔ اب اس قرارداد مقاصد کو دستور سے نکالنے یا اسے پھر سے دستور کا دیباچہ بنا کر اسے ''کھڈے لائن'' لگانے کی کوشش کی جارہی ہے۔

اسلام دشمن لابیوں کے مطالبے:

اسلام دشمن سیکولر لابیوں کی طرف سے تیسرا مطالبہ یہ سامنے آرہا ہے کہ دستور کے ''آرٹیکل ٹو'' میں جو یہ وضاحت کی گئی ہے کہ اسلام پاکستان کا مملکتی مذہب ہوگا، اسے بھی ختم کیا جائے، کیونکہ اس سے پاکستان کے فرقہ ورانہ ریاست ہونے کا تصور اُبھرتا ہے۔ اس کے اندر موجود دیگر مذاہب کے افراد کے اندر غیر ملکی ہونے کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ سراسر ایک احمقانہ تصور اور نظریہ ہے کیونکہ پاکستان کا قیام اسلامی نظریاتی بنیادوں پر عمل میں آیا۔ اس کے اندر موجود دیگر

مذاہب کی اقلیتوں نے پاکستان کی اس نظریاتی حیثیت کو تسلیم کرنے کے باوجود جب یہاں قیام کا فیصلہ کرلیا تو اب اس کی وہی نظریاتی حیثیت آج ان کے لیے احساس کمتری یا احساس محرومی کا سبب کیسے بن سکتی ہے؟

اسلام دشمن سیکولر لابیوں کی طرف سے چوتھا مطالبہ یہ سامنے آرہا ہے کہ دستور کے آرٹیکل ''62'' میں رکن پارلیمنٹ کے لیے جو شرائط مقرر کی گئی ہیں کہ وہ رکن پارلیمنٹ نہیں بن سکتا جو اچھے کردار کا حامل نہ ہو۔ جو احکام اسلام سے انحراف میں مشہور ہو۔ جو اسلامی تعلیمات کا خاطر خواہ علم نہ رکھتا ہو۔ جو اسلام کے مقرر کردہ فرائض کا پابند نہ ہو۔ جو کبیرہ گناہوں سے مجتنب نہ ہو۔ جو سمجھ دار اور پارسا نہ ہو۔ جو فاسق ہو۔ جو ایمان دار اور امین نہ ہو۔

سیکولر لابیوں کا کہنا ہے کہ دستور کے آرٹیکل 62 کی یہ تمام شقیں ختم کی جائیں۔ ظاہر ہے ان شقوں کی موجودگی میں کون سا سیاست دان رکن پارلیمنٹ بننے کی اہلیت رکھتا ہے؟ کون ہے ان میں سے اللہ کے فرائض کو پوری طرح ادا کرنے والا؟ کون ہے جو ان میں سے کسی کبیرہ گناہ کا مرتکب نہ ہو؟ کون ہے جو ان میں سے اسلامی تعلیمات کا خاطر خواہ علم رکھتا ہو؟ کون ہے جو ان میں سے اچھے کردار کا حامل ہو؟ ایمان دار اور امانت دار ہو؟ وہ ان شقوں کے خاتمے کا مطالبہ نہیں کریں گے تو کیا کریں گے؟ عملی اور پریکٹیکل طور پر تو یہ آرٹیکل پہلے ہی غیر موثر ہے، سیکولر لابیوں کی کوشش ہے کہ اس کی غیر قانونی حیثیت بھی ختم ہو جائے۔

اسلام دشمن سیکولر لابیوں کی طرف سے پانچواں مطالبہ سامنے آرہا ہے کہ دستور پاکستان کے آرٹیکل 41 کی شق نمبر ٹو میں جو یہ شرط رکھی گئی ہے کہ صدر پاکستان کے لیے 45 سال کی عمر کا مسلمان ہونا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ صدر کے لیے رکن پارلیمنٹ کی شرائط کا حامل ہونا بھی ضروری قرار دیا گیا ہے۔ سیکولر لابیاں یہ کوشش کر رہی ہیں کہ دستور کی یہ شقیں بھی ختم کی جائیں۔ یہ مطالبہ حکومت خیبر پختونخوا اور اے این پی کی مرکزی قیادت کی طرف سے کیا جا رہا ہے۔ گویا وہ چاہتے ہیں اسلام کے نام پر بنائے جانے والے اس اسلامی مل کا سربراہ، صدر مملکت عیسائی بھی ہوسکتا ہے۔ ہندو اور سکھ بھی ہوسکتا ہے۔ قادیانی بھی ہوسکتا ہے۔ اس کے علاوہ سیکولر لابیاں، ختم

نبوت، توہین رسالت اور قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی آئینی دفعات کو ختم کرنے کا مطالبہ بھی کر رہی ہیں۔

خواب جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوگا:

اس ساری صورتِ حال کے حوالے سے میں دوٹوک لفظوں میں کہتا ہوں کہ پاکستان کے اندر دہشت گردی کی کارروائیوں کے پیچھے وہ قوتیں سرگرم ہیں جو دستور پاکستان کی اسلامی دفعات کا خاتمہ چاہتی ہیں۔ جو پاکستان کو سیکولر اسٹیٹ بنانا چاہتی ہیں۔ ان میں سرفہرست امریکا ہے، جس نے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے اور توہین رسالت کے قوانین ختم کرانے کے لیے ایک طویل عرصہ تک پاکستان کی امداد بند رکھی۔ ایف سولہ طیاروں کی رقم لے کر بھی ان کی ڈلیوری روکے رکھی اور اب بلیک واٹر کے ذریعے دہشت گردی کی یہ کارروائیاں اس لیے کرا رہا ہے کہ مذہبی قوتوں کو خوف زدہ اور دہشت زدہ رکھا جا سکے۔ مذہبی قوتوں کو دہشت گردی کے واقعات میں ملوث قرار دے کر لوگوں کے دلوں میں ان کے خلاف نفرت پیدا کی جا سکے۔ ان کو دہشت گرد، انتہا پسند، شدت پسند اور دہشت گردوں کے پشت پناہ قرار دے کر عوام کو ان سے دور رکھا جا سکے تاکہ جب وہ آئین کی اسلامی دفعات کے تحفظ کی جنگ لڑیں، تحریک چلائیں تو پبلک ان کا ساتھ نہ دے۔

ہم اس مقام پر پاک فوج کے آرمی چیف جنرل اشفاق پرویز کیانی کے اس جرات مندانہ بیان کا خیر مقدم کرتے ہیں جس میں انہوں نے کہا تھا اسلام اور پاکستان لازم و ملزوم ہیں۔ پاکستان اسلام کے لیے بنایا گیا تھا اس کا نام اور اس نظام اسلامی ہوگا۔ کسی کو اس کا نام اور نظام بدلنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ پاکستان اسلامی جمہوریہ پاکستان ہے اور اسلامی جمہوریہ پاکستان ہی رہے گا۔ ہم آرمی چیف کے اس نعرۂ حق پر انہیں خراج تحسین پیش کرتے ہیں اور ان کے اس بیان کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ دہشت گردی کی ان کارروائیوں سے امریکا کا دوسرا مقصد یہ ہے کہ پاکستان کو اندرونی طور پر غیر مستحکم کر کے داخلی طور پر کمزور کر کے اس کا وجود مٹایا جائے۔ اسے ختم کر دیا جائے۔ امریکی تھنک ٹینک رپورٹ جو 2000ء میں منظر عام پر آ چکی ہے، اس میں امریکی عزائم بہت حد تک واضح ہو چکے ہیں۔

اس رپورٹ کے اندر پاکستان کو طالبان کے خلاف استعمال کرنے، طالبان حکومت ختم کرنے پاکستان کے اندر مذہبی ولسانی بنیادوں پر فسادات کرانے اور تخریبی کارروائیوں کے ذریعے پاکستان کو کمزور اور غیر مستحکم کرنے کا جو منظر پیش کیا گیا ہے اور اس کے بعد امریکی طیاروں کے ذریعے پاکستان کے جوہری ہتھیاروں کو تباہ کر کے انڈین آرمی کو پاکستان میں داخل کرنے اور 2020ء میں پاکستان کا نقشہ دنیا سے مٹا دینے کا خاکہ پیش کیا گیا ہے، اس سے امریکی عزائم اور اس کے مقاصد کسی سے پوشیدہ نہیں رہے۔ نواب اکبر بگٹی اور بے نظیر بھٹو کے قتل پاکستان کے اندر لسانی فسادات برپا کرنے کی سازش ہی تھی۔ امریکا اپنے اس ایجنڈے کے تحت بلیک واٹر کے ذریعے دہشت گردی کی یہ کارروائیاں کرا رہا ہے تاکہ پاکستان کو اندرونی طور پر کمزور کر کے اسے ختم کر سکے لیکن یاد رکھو امریکا کا یہ منحوس خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہیں ہوگا۔ اب آتے ہیں جہاد اور دہشت گردی میں فرق کی طرف!

دہشت گردی کی تعریف:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد ارشادات کی روشنی میں جو جنگ آسمانی تعلیمات کی بالادستی اور اعلیٰ انسانی اقدار کے فروغ کے لیے ہو وہ جہاد ہے۔ جس جنگ کا مقصد نسل، رنگ، علاقہ، قومیت اور لسانیت کے حوالے سے ایک انسانی گروہ پر دوسرے گروہ کی بالادستی ہو وہ جاہلیت، فساد اور دہشت گردی ہے۔ اسلام کے نزدیک دہشت گردوں کا اطلاق بھی اسی جنگ پر ہوتا ہے۔ دہشت گردی اور جہاد کے درمیان فرق کا ایک پس منظر تو یہ ہے۔ دہشت گردی اور جہاد کے درمیان فرق کا دوسرا پس منظر معروضی ہے جس کا مشاہدہ ہم ایک عرصے سے کر رہے ہیں۔ مغرب آسمانی تعلیمات اور مذہب کے لیے ہتھیار کے استعمال کو مسلسل دہشت گردی قرار دے رہا ہے مگر اپنے فلسفہ وتہذیب کے لیے ہتھیار کا استعمال جائز بلکہ ناگزیر ہے۔ افغانستان میں روسی فوجوں کی موجودگی کے خلاف مسلح جنگ مغرب کے نزدیک جہاد تھی مگر خلیج عرب میں امریکی فوجوں کی موجودگی کے خلاف ناراضگی کا مسلح اظہار دہشت گردی ہے۔

کویت پر عراق کی فوج کشی اور قبضہ مغرب کے نزدیک ناقابلِ معافی جرم تھا اور جب تک مسلح طاقت کے ذریعہ یہ قبضہ ختم نہیں کرا لیا گیا مغرب نے چین کا سانس نہیں لیا مگر 40 سال سے

بیت المقدس پر اسرائیل کی فوج کشی اور پھر کچھ عرصہ بعد اس پر جارحانہ قبضہ مغرب کے نزدیک کوئی جرم نہیں بلکہ اس کو تسلیم کرانے کے لیے اپنے تمام ذرائع استعمال کر رہا ہے اور بیت المقدس کی تاریخ تک مٹانے پر تلا ہوا ہے۔ اگر اسرائیلی فوج فلسطینیوں پر اندھا دھند فائرنگ کرے، ہیلی کاپٹروں سے وحشیانہ بمباری کرے، ٹینک روڈوں پر دندناتے پھریں اور بلڈوزر ان کے گھروں کو مسمار کر دیں تو یہ دہشت گردی ہے اور نہ ہی اسے ظلم وستم کہا جا سکتا ہے۔ اگر اس کے ردعمل میں نہتے فلسطینی پتھر اٹھا کر پھینک دیں تو دہشت گرد قرار پاتے ہیں۔

مشرقی تیمور کی مسیحی اکثریت کو حق خود ارادیت کے ذریعہ آزادی دلوانے میں اقوام متحدہ کا کردار ایک متحرک اور فعال ادارے کا کردار ثابت ہوا مگر مقبوضہ کشمیر کی مسلم اکثریت کا حق خود ارادیت کی قرار دادیں اقوام متحدہ کی فائلوں میں 62 سالوں سے سڑ رہی ہیں۔

سوڈان میں ان قوتوں کو دارفر کا مسئلہ اُجاگر کرنے میں کوئی باک نہیں لیکن ہندوستانی جارحیت ان کی نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ گزشتہ ساٹھ سالوں میں 92 ہزار کشمیری بھارتی فوج کے ہاتھوں شہادت پا چکے۔ کشمیریوں کی زندگی اجیرن ہو چکی۔ گرفتاریاں، تشدد، فائرنگ، کریک ڈاؤن اور ہلاکتیں معمول بن چکی ہیں جس کے ردعمل میں آزادی کے حصول کے لیے جب کشمیریوں نے مسلح جدوجہد شروع کی تو اسے دہشت گردی قرار دیا جاتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ بھارت کو کشمیریوں پر ظلم وستم سے کون روکے؟ اسرائیلی جارحیت کو عالمی عدالت انصاف میں کون چیلنج کرے؟ عراق وافغانستان میں امریکی جارحیت کو کون روکے؟ بوسنیا اور کوسوو میں سربوں کے مظالم کے آگے کون سدِ سکندری بنے؟

اصل بات یہ ہے کہ دہشت گرد کسے کہا جائے؟ مذہبی انتہا پسندی کا اطلاق کن پر ہو؟ دہشت گردی کی تعریف کیا ہے؟ دہشت گردی کی تعریف کون متعین کرے؟ یہ سب وہ پہلو ہیں جن پر سنجیدہ غور وفکر کرنے اور مل بیٹھ کر حل کرنے کی ضرورت پہلے بھی رہی ہے لیکن اب سب سے زیادہ ہے۔ ویسے تو اقوام متحدہ میں دہشت گردی کی تعریف متعین کرنے پر بحث ہوتی رہی ہے جواب تک نتیجہ خیز ثابت نہیں ہو سکی اور نہ ہی دوغلی پالیسی رکھنے کی صورت میں کبھی ہو سکتی ہے۔

مغرب کا دوہرا معیار:

درحقیقت حق خود ارادیت کی جدوجہد اور مبینہ دہشت گردی کی تعریف کے متعین کرنے اور اس کے لیے بنیادی اصول بنانے میں سب سے بڑی رکاوٹ سامراجی اور جارحیت پسند طاقتیں ہیں جنہوں نے دوسری اقوام پر جبراً ناجائز قبضہ جما رکھا ہے۔ اس سے چھٹکارے کے لیے دنیا کے مختلف خطوں میں تحریکیں چل رہی ہیں۔ آزادی کی اس جدوجہد کو دہشت گردی سے تعبیر کرتے ہیں اور حریت پسندوں کو دہشت گرد باور کرایا جاتا ہے جبکہ کئی ممالک آزادی اور حق خود ارادیت کی جدوجہد کو جائز قرار دیتے ہوئے ان کی حمایت کرتے ہیں۔

اگر حق خود ارادیت کی جدوجہد اور دہشت گردی میں فرق تسلیم کر لیا جاتا ہے تو یہ بات لازمی ٹھہرے گی کہ ان طاقتوں کو مقبوضہ علاقے واپس کرنا ہوں گے اس لیے وہ اس بحث کو نمٹانے پر کبھی سنجیدگی سے تیار نہیں ہوتیں۔ عالمی سامراجی طاقتوں نے طویل عرصے سے مسلم علاقوں پر ناجائز قبضہ جمایا ہوا ہے جس کا مقصد ان علاقوں کے وسائل پر مستقل قبضہ جمائے رکھنا اور عوام کا استحصال کرنا ہے۔

سابق سوویت یونین کے دور میں وسطی ایشیا کی مسلم ریاستوں پر دھاوا بولا گیا۔ ان کے سیاسی واجتماعی نظام کو پامال کر کے اشتراکیت کو نافذ کیا گیا۔ مسلم عوام کو دین اسلام سے برگشتہ کرنے اور اسلامی تہذیب وثقافت کے تمام آثار مٹانے کی کوشش کی گئی۔ افغان جہاد کے بعد یہ ریاستیں آزاد ہوگئیں مگر روس نے چیچنیا کو آزادی دینے سے انکار کر دیا جس کے ردعمل میں چیچن عوام نے آزادی کے حصول کے لیے مسلح جدوجہد شروع کردی جس کے بعد چیچنیا پر روسی ظلم وستم میں اضافہ ہوگیا۔ چیچن عوام انتہائی کربناک حالات میں زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ عالمی برادری چیچن عوام کی آزادی کی جدوجہد کو جائز تسلیم کرتی ہے لیکن روس اسے دہشت گردی قرار دے کر ان کے خلاف ریاستی دہشت گردی جاری رکھے ہوئے ہے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد مغربی طاقتوں کی کھلم کھلا اعانت کے ساتھ یہودیوں نے فلسطین پر قبضہ کر کے اسرائیلی ریاست کا اعلان کر دیا۔ یہودیوں کا فلسطینیوں کی سرزمین پر قبضہ تاریخی،

سیاسی، اخلاقی کسی بھی صورت جائز نہ تھا لیکن عالمی طاقتوں کے زیرِ سایہ اسرائیلی ریاست دن بدن مضبوط ہی ہوتی جارہی ہے جبکہ لاکھوں فلسطینی مہاجرین مختلف ممالک میں کیمپوں میں اپنی زندگی کے دن گزارنے پر مجبور ہیں۔

روشنی کا سفر:

ستم ظریفی دیکھیے کہ سامرجی طاقتیں مسلم علاقوں پر ناجائز قبضہ کرتی ہیں، وہاں کے امن وامان کو تباہ کر کے ہر قسم کے ظلم کو روا رکھتی ہیں اور آزادی کے حصول کے لیے جدوجہد کرنے والوں کو دہشت گرد قرار دیتی ہیں۔ بعدازاں ''دہشت گردی'' کو دینِ اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ جوڑ دیتی ہیں۔ جس سے عالم اسلام میں کنفیوژن پھیل جاتا ہے اور مسلمان بھڑک اٹھتے ہیں۔ میں ذاتی طور پر سمجھتا ہوں اس کی ذمہ داری مغرب پر عائد ہوتی ہے۔ اگر یہ سامراجی عزائم کی مالک قوتیں چاہیں تو دنیا امن کا گہوارہ بن سکتی ہے۔

چند سالوں سے مغرب ''رواداری بین المذاہب'' کا ڈھنڈورا پیٹ رہا ہے لیکن کام وہ ایسے کر رہا ہے جو اس میں خلیج پیدا کرنے کا سبب ہے۔ مغرب کے ہاں ہر شخص کو مذہب کی آزادی ہے کہ وہ جیسے چاہے کرے لیکن جب مغربی ممالک میں رہائش پذیر مسلمان اپنے مذہبی شعائر پر پابندی کرتے ہیں تو ان کے خلاف نت نئے قوانین وضع کیے جاتے ہیں۔ اگر کوئی موجودہ قانون مسلمانوں کے حق میں جاتا ہے تو اس میں ترمیم کی جاتی ہے۔ چند دن پہلے کی خبر ہے کہ کینیڈا کی حکومت نے باپردہ مسلمان خواتین کو ووٹ کی اجازت نہ دینے کا بل منظوری کے لیے پارلیمنٹ میں پیش کیا۔ کینیڈا کی حکومت نے یہ اقدام چیف الیکٹورل آفیسر کی طرف سے ووٹ دیتے وقت چہرے سے نقاب ہٹانے کو ضروری قرار دینے سے انکار کے بعد کیا ہے۔ چیف الیکٹورل آفیسر مارک میرانڈ نے موقف اختیار کیا تھا کہ کینیڈا کو موجودہ قانون ووٹ دینے والی مسلمان خواتین کو چہرے سے نقاب ہٹانے کے لیے مجبور کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔

دو عورتوں کی کہانی:

قارئین! مغرب کے دوہرے معیار کو ثابت کرنے کے لیے میں آپ کو ''دو عورتوں کی کہانی''

سنانا چاہتا ہوں۔ یہ صرف ایک داستان یا کہانی نہیں، بلکہ یہ دراصل دو تہذیبوں اور دو معاشرتی نظاموں کا پردہ چاک کرنے والی روداد ہے۔ یہ دو ایسی عورتوں کی کہانی ہے جن میں سے ایک کا تعلق مغرب سے ہے اور دوسری کا مشرق سے۔ کل جب ''مغربی عورت'' مشرق کی قید میں تھی تو اس کے ساتھ کیا سلوک ہوا، آج جب ''مشرق کی بیٹی'' مغرب کی قید میں ہے اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ پہلے اسی مغربی خاتون کی زبانی سنیے۔ اپنی قیدی کی روداد بیان کرتے ہوئے کہتی ہیں:

''طالبان اکثر میرا ذکر بطورِ قیدی نہیں بلکہ مہمان کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر تم غمزدہ ہو تو ہم بھی مضطرب رہتے ہیں۔ یہ لوگ میرے ساتھ بے حد نرم، انتہائی شریف اور احساس رکھنے والے ہیں۔ میں چاہتی ہوں ہر شخص یہ جان لے کہ مجھ سے کیسا اچھا سلوک ہو رہا ہے؟'' یہ ہے مغربی عورت کے الفاظ، جو مشرق کی قید میں تھی۔ اسلام کے شیدائیوں نے خاتون ہونے کے ناتے اس کی بے حد عزت کی۔ ان کا کہنا تھا ہمارے نبی نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ جنگ میں ایک خاتون کو قیدی بنا کر لایا گیا۔ آپ نے فرمایا: ''اس کے سر پر دوپٹہ رکھ دو۔'' عرض کیا گیا: ''یا رسول اللہ! یہ تو غیر مسلم ہے۔'' آپ نے فرمایا: ''بیٹی تو بیٹی ہے خواہ کسی کی بھی ہو۔'' تاریخ گواہ ہے مسلمانوں نے ہمیشہ حقوق خیال رکھا۔ یورپی اقوام سے تعلق رکھنے والی اس عورت کا نام ''ایوان ریڈلی'' ہے۔ یہ 1959ء میں انگلینڈ میں پیدا ہوئی۔ اپنے آبائی علاقے سے صحافت کا آغاز کیا اور پھر ترقی کے منازل طے کرتی ہوئی عالمی سطح پر سنڈے ایکسپریس تک جا پہنچی۔ ریڈلی نے 10 سالوں میں ''سنڈے ایکسپریس، دی آبزرور، ڈیلی مرر، اور انڈیپنڈنٹ آن سنڈے'' کے لیے ایسی رپورٹس بنائیں جن سے ان کا شمار نمایاں اور قابلِ اعتماد صحافیوں میں ہونے لگا۔ انہوں نے سی این این، آئی ٹی این اور Carlton چینل کے لیے افغانستان، عراق اور فلسطین کے سفر کیے اور صحافت کے میدان میں کئی انعامات اور اعزازات بھی جیتے۔

2001ء میں جب امریکا نے افغانستان پر یلغار کا فیصلہ کیا تو انہیں اپنی انتظامیہ کی طرف سے اسلام آباد جانے کے لیے کہا گیا۔ یہاں پہنچ کر ریڈلی نے افغانستان جانے کے لیے ویزہ کے حصول کی بھرپور کوشش کی لیکن ناکام رہیں۔ ادھر افغانستان پر شب خون مارنے اور طالبان کو

نیست ونابود کرنے کے لیے اُلٹی گنتی شروع ہو چکی تھی۔ چنانچہ ریڈلی نے اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داریاں نبھانے کے لیے ہر حال میں افغانستان جانے کا تہیہ کرلیا اور روپ بدل کر خفیہ طریقے سے غیر قانونی طور پر افغانستان جانے کے لیے مقامی آپریٹروں کی مدد سے روانہ ہو گئیں وہاں اس نے اپنا کام کیا اور جلال آباد سے واپس آتی ہوئی وہ افغانستان اور پاکستان کے بارڈر کے قریب ہی تھیں طالبان کے ہاتھوں پکڑی گئیں۔ ان دنوں امریکا کے وائٹ ہاؤس سے لے کر برطانوی ٹین ڈاؤننگ اسٹریٹ تک حکومتی ایوانوں میں ایوان رڈلی ہی کے چرچے تھے۔ ہر کوئی ایوان رڈلی کے لیے پریشان تھا۔ ہر روز لاکھوں افراد، تنظیمیں اور حکومتیں ان کی رہائی کا مطالبہ کرتی تھیں، پھر ایک دن انہیں رہائی مل گئی۔ دنیا بھر کے ذرائع ابلاغ طالبان کی قید میں رہنے والی ایوان رڈلی کے خیالات سننے کے لیے بے چین تھے۔ اس نے رہائی کے بعد طالبان کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ وہ طالبان جنہیں مہذب دنیا اجڈ، گنوار، تہذیب و اخلاقیات سے عاری اور انسانیت کے لیے خطرہ قرار دی رہی تھی ان کی قید میں ایک دشمن ملک کی جاسوس خاتون کے ساتھ جو سلوک ہوا، وہ ایسا حیرت انگیز اور روحانی اخلاقیات سے بھرپور نمونہ تھا ایوان ریڈلی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔ چنانچہ رہائی کے بعد انہوں نے اسلام کا مطالعہ شروع کیا اور 30 ماہ بعد وہ سوا ارب مسلمانوں کی برادری میں شامل ہو گئیں۔ مسلمان ہونے کے بعد انہوں نے کئی مقالے اور ڈاکومنٹریز تیار کیں۔ ان کی دو کتابیں ''طالبان کے ہاتھوں میں'' اور ''جنت کا ٹکٹ'' بہت مشہور ہوئیں جن میں انہوں نے دہشت گردی اور اعتدال پسندی کے پروپیگنڈے کو اسلام میں ابہام پیدا کرنے کی مغربی سازش قرار دیا ہے۔

ایوان ریڈلے اور عافیہ صدیقی:

مشرق سے تعلق رکھنے والی اس خاتون کا نام ''عافیہ صدیقی'' ہے۔ یہ 2 مارچ 1972ء کو کراچی کے ایک تعلیم یافتہ گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد محمد صدیقی پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر تھے۔ عافیہ نے اپنی محنت اور ذہانت کے بل بوتے پر امریکا کی صفِ اول کی یونیورسٹی MIT سے 1995ء میں علم حیاتیات کے شعبے سے ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد ایک اور اعلیٰ تعلیمی اور تحقیقی ادارے Brandies

سے پی ایچ ڈی کی اعلیٰ سند حاصل کی۔ تعلیم کے دوران عافیہ نے ایک پاکستانی ڈاکٹر امجد خان سے شادی کر لی جو بوسٹن میں مقیم تھا لیکن کچھ عرصے بعد دونوں میں جدائی ہوگئی۔ اس کے بعد عافیہ صدیقی اپنے بچوں کے ساتھ والدہ کے ہاں رہنے لگیں۔ 30 مارچ 2003ء کو عافیہ صدیقی اپنی والدہ کے گھر سے کراچی ایئرپورٹ کے لیے ٹیکسی میں سوار ہوئیں۔ ان کے ساتھ تین بچے تھے۔ گھر سے ایئرپورٹ تک کے راستے میں انہیں پکڑ کر بچوں سمیت ایف بی آئی کے حوالے کر دیا گیا۔ عافیہ کی والدہ اور بہن ڈاکٹر فوزیہ صدیقی کو اس وقت علم نہیں تھا عافیہ اور ان کے بچوں کے ساتھ کیا ہوا، مگر یہ خبر سننے کے بعد دونوں ماں بیٹی نے اس وقت کے وزیر داخلہ فیصل صالح حیات سے عافیہ اور بچوں کی بازیابی کی درخواست کی لیکن انہیں خاموش رہنے کا حکم دیا گیا۔ احتجاج کرنے پر خطرناک نتائج کی دھمکیاں دی گئیں۔ 5 سال تک عافیہ کا کچھ پتا نہ چل سکا۔

6 جولائی 2008ء کو اسلام آباد میں پریس کانفرنس میں قیام امن کے لیے متحرک ایوان ریڈلی نے انکشاف کیا کابل کے قریب ''بگرام ایئربیس'' پر ایک پاکستانی خاتون بغیر کسی جرم کے چار سال سے مردوں کی جیل میں قید ہے۔ قیدی نمبر 650 کی بیرک سے بلند ہوتیں صدائیں بگرام جیل کو دہلا ڈالتیں ہیں۔ اسے بدترین تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ اس کی چیخ و پکار پوری جیل میں سنائی دیتی ہے۔ اذیت اور تشدد کی وجہ سے وہ مسلمان عورت اپنا ذہنی توازن تک کھو بیٹھی ہے اور کوئی اس کا پرسان حال نہیں۔'' پھر انہوں نے عافیہ کو برآمد کروانے کے لیے امریکی حکام سے، جو اسے سرے سے اپنی تحویل میں لینے پر انکاری تھے، دو سوال کیے۔ عافیہ 2005ء تک ایف بی آئی کی ''انتہائی مطلوبین'' کی فہرست میں واحد خاتون تھی۔ اگر امریکا نے اسے گرفتار نہیں کیا تو 2005ء کے بعد کیا ہوا وہ اس فہرست سے غائب ہے؟ دوسرا یہ کہ گوانتاناموبے سے آنے والے معظم بیگ نامی قیدی نے بتایا جب وہ بگرام جیل میں تھا تو قیدی نمبر 650 کی چیخیں پورا جیل سنتا تھا۔ یہ قیدی واحد پاکستانی خاتون قیدی تھی۔ اگر وہ عافیہ نہیں تھی تو وضاحت کی جائے وہ کون تھی؟ مریم ریڈلی کے صحافیانہ دلائل جب عدالت میں سامنے آئے تو ایف بی آئی کے حکام کے پاس چارہ نہ رہا کہ وہ اسے عدالت میں پیش کریں۔

چنانچہ 5 راگست 2008ء کو عافیہ کو نیویارک کی عدالت میں پیش کیا گیا۔ امریکی قانون کے مطابق کسی خاتون کی جیل میں برہنہ تلاشی نہیں لی جائے گی لیکن عافیہ صدیقی کو نیویارک میں وفاقی عدالت ''یوایس کورٹ سدرن ڈسٹرکٹ'' میں پیشی کے لیے لے جایا جانے لگا تو ذلت آمیز طریقے سے برہنہ تلاشی لی گئی۔ ان پر یہ الزام لگایا گیا انہوں نے بگرام جیل میں امریکی فوجیوں پر گولی چلائی۔ اس بات کے ٹھوس دلائل اور شواہد نہ ہونے کے باوجود 4 فروری 2010 کو امریکی جیوری نے ان پر فردِ جرم عائد کر دیا۔ 30 مارچ 2010ء کو عافیہ صدیقی کے اغوا کے 7 سال پورے ہونے پر پاکستان بھر میں احتجاجی مظاہرے ہوئے۔ مقررین نے کہا: ''دنیا کو انصاف، آزادی، بنیادی حقوق اور مساوات کے دعوے دار امریکیوں نے تعصب، نفرت، عداوت، نسل پرستی اور مسلم دشمنی کا ثبوت دیتے ہوئے ڈاکٹر عافیہ کے ساتھ انتہائی شرمناک سلوک روا رکھا ہوا ہے۔ ایسے میں امریکی آئین میں مساوات، آزادی اور دیگر بنیادی حقوق کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے؟ سوال یہ ہے اس انسانی المیے پر عالمی ضمیر کہاں سویا ہوا ہے؟ جمہوریتوں کے چیمپئن اور عالمی انسانی حقوق کے دعوے دار کیوں چپ سادھ لیے بیٹھے ہیں؟ انسانی حقوق کی تنظیمیں اس ظلم و ستم اور کھلی انسانی خلاف ورزی پر کیوں خاموش ہیں؟ اقوام متحدہ اور ریڈ کراس کہاں ہیں؟ ایمنسٹی انٹرنیشنل اور درجنوں تنظیمیں اور ادارے کہاں چلے گئے ہیں؟''

امریکی صدر اوباما نے افغانستان کے ''بگرام ایئر بیس'' پر خطاب کرتے ہوئے کہا: ''امریکا انسانی عظمت کے لیے کام کرتا رہے گا۔'' ہم مسٹر اوباما سے پوچھنا چاہتے ہیں ڈاکٹر عافیہ کے ساتھ سات سال سے جو کچھ امریکا کر رہا ہے کیا یہ انسانی عظمت ہے یا انسانیت کی تذلیل؟ قارئین! یہ دو خواتین کی کہانی حقیقت میں دو تہذیبوں کی کہانی ہے۔ فیصلہ آپ کیجیے کون سی تہذیب جاہل، اجڈ اور گنوار ہے اور کس تہذیب کے علمبردار آج بھی اعلیٰ اخلاق کے مالک ہیں؟

مغرب کا دوغلا پن تو ملاحظہ کیجیے! آخر کیا وجہ ہے کہ معروف باکسر محمد علی جب اسلام قبول کرتا ہے تو انہیں زبردستی فوج میں بھرتی کرنے کا حکم دیا جاتا ہے؟ آئے دن مسلمانوں کی محترم ترین ہستیوں کے خلاف توہین آمیز خاکے شائع کر کے ان کے جذبات کو مجروح کیا جاتا ہے؟ مغربی

ممالک میں آئے دن ایسے واقعات پیش آتے رہتے ہیں کہ مسلمان خواتین کو صرف حجاب پہننے کی بنا پر ملازمتوں سے معطل کیا جاتا ہے۔ جب صدر بش عیسائیت کی ترویج کے لیے وہائٹ ہاؤس میں ''Faith-Based and Community Initiatives'' کے نام سے خصوصی ڈیپارٹمنٹ قائم کرتا ہے اور عیسائی مذہبی تنظیموں کو 40 ارب ڈالر دینے کا فیصلہ کرتا ہے تو روادار کہلاتا ہے لیکن اگر کوئی مال دار شخص کسی مدرسے کی سرپرستی کرے تو وہ رواداری کا دشمن! یہ تفریق کیوں؟

لڑائیاں کیسے ختم ہوسکتی ہیں؟

ہمیں یاد ہے 2003ء میں امریکا کے صدر بش نے دنیا بھر میں عیسائیت کی ترویج کے لیے مشنری تنظیموں کو فنڈ فراہم کرنے کے لیے وہائٹ ہاؤس میں ''Faith-Based and Community Initiatives'' نامی ڈیپارٹمنٹ قائم کیا تھا۔ اس کے ڈائریکٹر ''جم ٹووی'' کو امریکی سوسائٹی کو کٹر عیسائی مذہبی معاشرے میں تبدیل کرنے کا ہدف سونپا گیا تھا۔ رپورٹ کے مطابق انہوں نے 10 ہزار 5 سو 18 عیسائی تنظیموں کو ایک ارب 70 کروڑ ڈالرز فراہم کیے تھے۔ اس کے نتائج کیا نکلے وہ تو معلوم نہ ہوسکے البتہ ان ممالک میں نومسلموں کی تعداد میں ریکارڈ اضافہ ہوا۔ دوسری بات اس سے یہ بھی معلوم ہوگئی کہ امریکی صدر بش کس حد تک مذہبی جنونیت میں مبتلا ہیں۔ مذہبی انتہاپسندی کا الزام دوسروں کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا امریکا اربوں ڈالر خرچ کر کے اپنے معاشرے کو مذہبی شدت پسند، تنگ نظر اور انتہا پسند بنانے کے لیے کوشاں نہیں؟ اور یہ کیسا فلسفہ ہے اگر ایک کام صدر بش عیسائیت کی ترویج کے لیے کرے تو اچھا ہے لیکن اگر کوئی صاحب ثروت مسلمان، اسلام کی نشر و اشاعت کے لیے کرے یا کسی دینی مدرسے کو چندہ بھی دے تو اس کی انکوائریاں شروع ہوجاتی ہیں۔ اس کا رشتہ ناتہ مبینہ دہشت گردی سے جوڑ دیا جاتا ہے۔ یہ کیسی ناانصافی ہے اگر کوئی ''ہولوکاسٹ'' پر لکھے یا بولے تو وہ قابلِ گرفت ہے لیکن اگر کوئی ڈیڑھ ارب مسلمانوں کی معزز ترین ہستیوں کے بارے میں شرانگیزی کرے تو اس کو تحفظ دیا جاتا ہے۔ 1988ء میں ''وائی کنگ پبلی کیشنز'' کے یہودی ادارے نے ''شیطانی آیات'' کے نام سے بدنامِ زمانہ کتاب لکھی

تو کچھ نہ ہو لیکن جب ملائیشیا کے سابق وزیر اعظم ڈاکٹر مہاتیر محمد نے دنیا کی صرف 0.23 فیصد آبادی یہودیوں کے بارے میں ذرا الفاظ کہے تو ان کو یورپ و امریکا کی طرف سے دھمکیاں ملنے لگیں اور ان کے خلاف میڈیا پر پروپیگنڈا شروع ہو گیا۔ یہی نہیں اگر عیسائی، عیسائیت کی تبلیغ کے لیے ایک ارب کے قریب ویب سائنس استعمال کرتے ہوں تو اچھا ہے لیکن اگر مسلمان چند ہزار ویب سائٹ اسلام کی دعوت کے لیے استعمال کریں تو ان کو بین کر دیا جاتا ہے۔

ہم سمجھتے ہیں مغرب کی یہی دوغلی پالیسی ہے جو ان کے لیے نفرت اور عداوت میں اضافے کا باعث بن رہا ہے۔ عالمی طاقتوں کا یہی دوہرا معیار ہے جو ان کے رواداری کے دعووں کی قلعی کھول رہا ہے۔ اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ اس نے انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے آزاد کرا کر امن و امان کو ممکن بنایا۔ اسلام تو وہ مذہب ہے جس نے عرب کے پرتشدد ماحول کو امن کا گہوارہ بنایا۔ عربوں میں جنگیں معمولی باتوں پر شروع ہو کر نسلوں تک چلا کرتی تھیں لیکن اسلام نے یہ لڑائیاں ختم کروادیں۔ اس کے برعکس ان دنوں عیسائیت قیصر روم کی شکل میں فارس سے برسر پیکار تھی اور لڑنا لڑانا اس کا طرۂ امتیاز تھا۔

دہشت گرد کون؟

تاریخ میں صلیبی جنگوں کے مذہبی نام پر عیسائیوں نے مسلمانوں کا کتنا خون بہایا یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ بلکہ اب بھی ان کی طرف سے ظلم و ستم اور ناانصافی کا سلسلہ جاری ہے۔ امریکا کو پاکستان کے کئی مدارس خطرناک دکھائی دیتے ہیں لیکن اسرائیل کے عالمی دہشت گرد اور غنڈے دکھائی نہیں دیتے۔ ایک مغربی نشریاتی ادارے کی رپورٹ کے مطابق اسرائیل کی یونیورسٹی میں باقاعدہ مسلمانوں کو مارنے کی تربیت دی جاتی ہے اور ہر اسرائیلی نوجوان کے لیے فوجی تربیت لازمی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صہیونی دہشت گردوں نے بوڑھوں، بزرگوں حتیٰ کہ بچوں تک کو خاک و خون میں تڑپا رکھا ہے۔

یہ سب جانتے ہیں اس وقت پوری دنیا میں دہشت گردی کا ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے۔ پوری دنیا کے اندر یہ شور بپا ہے ایشیائی خطہ کے اندر دہشت گردی پھیل رہی ہے۔ امریکا کہہ رہا ہے ایشیائی

اقوام متحدہ کہہ رہا ہے ایشیائی ممالک کے اندر دہشت گردی ہے۔ سلامتی کونسل کہہ رہی ہے ایشیائی خطے کے اندر دہشت گردی پھیل رہی ہے۔

پوری دنیا کا یہی پروپیگنڈا ہے لیکن آپ حیران ہوں گے آج تک اس وقت تک اقوام متحدہ سمیت دنیا کا کوئی ملک اور کوئی ادارہ دہشت گردی کی تعریف نہیں کر سکا کہ دہشت گردی ہے کیا؟ مسلمان اس بات سے غافل ہیں اسلام دشمن قوتیں، دہشت گردی کے نام پر ہماری جہادی تعلیم کو مجروح کرنا چاہتی ہیں، حالانکہ مسلمان جہاد اور دہشت گردی میں فرق کرتے ہیں۔ قرآن پاک میں جہاد سے متعلق 447 آیات ہیں۔ جہاد عبادت ہے۔ جہاد اسلامی تعلیم ہے۔ جہاد اسلامی تعلیمات کی حفاظت کا ذریعہ ہے۔ جہاد دنیا میں امن کی ضمانت ہے۔ جہاد دہشت گردی کے خلاف ہے۔ جہاد اس دنیا کے اندر اللہ کے قانون کو لانے، اسے جاری کرنے کا ذریعہ ہے۔ جہاد جہاد ہے لیکن مسلمان اس قدر غفلت کی نیند سو رہا ہے کہ دہشت گردی کے نام پر اس کے عقیدۂ جہاد کو، اس کی تعلیم جہاد کو مجروح اور ختم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

کبھی کہتے ہیں ہمارے نزدیک نماز پابندی سے پڑھنے والا بھی دہشت گرد ہے، کبھی کہتے ہیں داڑھی رکھنے والا بھی دہشت گرد ہے۔ کبھی کہتے ہیں اسلامی کلچر کو پوری طرح اپنانے والا بھی دہشت گرد ہے۔ کیا ہم نے کبھی کہا گرجے کے اندر جا کر عبادت کرنے والا دہشت گرد ہے؟ کیا ہم نے کبھی کہا مندر اور گوردوارے کے اندر جا کر عبادت کرنے والا دہشت گرد ہے؟ لیکن یہ چرچا ہے کہ مساجد کے اندر جا کر عبادت کی پابندی کرنے والا بھی دہشت گرد ہے۔ داڑھی رکھنے والا بھی دہشت گرد ہے۔ دوسرے لفظوں میں صاف کہہ دوں کہ ان کے نزدیک تمہاری نماز بھی دہشت گردی ہے۔ خودکش بارودی جیکٹ ہے۔ تمہاری ڈاڑھی بھی کلاشنکوف ہے۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ دہشت گردی اور جہاد میں فرق کرنا ہے۔ دوسری بات یہ ہے دہشت گردی کے نام پر دنیا بھر کی حریت پسند تحریکوں کو بھی دہشت گرد قرار دیا جا رہا ہے۔ دنیا کے جس خطے کے اندر بھی مقامی باشندے کسی بیرونی طاقت کے تسلط کا راستہ روکنے کی جنگ لڑ رہے ہیں، وہ دہشت گردی نہیں، حریت پسندی ہے۔

کہانی کا اختتام:

فلسطین کا مسلمان، اسرائیل کے خلاف جو جنگ لڑ رہا ہے وہ دہشت گردی نہیں بلکہ حریت پسندی اور جہاد ہے۔ عراق کا مسلمان امریکا اور اس کے اتحادیوں کے خلاف جو جنگ کر رہا ہے، وہ دہشت گردی نہیں حریت پسندی اور جہاد ہے۔ افغانستان کا مسلمان اپنے ملک کے اندر غیر ملکی تسلط کے خلاف جو جنگ کر رہا ہے وہ دہشت گردی نہیں حریت پسندی اور جہاد ہے۔ کشمیر کا مسلمان انڈین آرمی اور انٹیلی جنس اداروں کے خلاف جو جنگ کر رہا ہے وہ دہشت گردی نہیں حریت پسندی اور جہاد ہے۔ سب کو ایک ہی لپیٹ میں مت لو۔ جہاد جہاد ہے۔ حریت پسندی، حریت پسندی ہے اور دہشت گردی دہشت گردی ہے۔ اگر جہاد اور دہشت گردی میں فرق کرلیا جائے اور ''دہشت گردی'' کی جامع مانع تعریف مقرر ہوجائے تو 70 فیصد مسائل حل ہوجائیں۔ یہ خوش آیند بات ہے کہ اب کچھ عرصے سے مغرب کی طرف سے دینی مدارس کے تعلیمی نظام پر اطمینان کا اظہار کیا جانے لگا ہے۔

جولائی 2010ء میں ایک امریکی تھنک ٹینک ''بروکنگز انسٹیٹیوٹ'' نے مدارس کے حوالے سے حقیقت پسند رائے کا اظہار یوں کیا تھا: ''پاکستان میں دینی مدرسے نہیں، بلکہ سرکاری تعلیم کا ناقص نظام عسکریت پسندی کے فروغ کی وجہ بن رہا ہے۔ سرکاری اسکولوں کا نصاب اور طریق تدریس عدم برداشت کو جنم دینے کا سبب بن رہا ہے۔ سیکیورٹی کے لیے چیلنج سمجھتے ہوئے صرف مدارس پر توجہ مرکوز کرنے کی غلطی کی تصحیح ہونی چاہیے۔'' امریکی تھنک ٹینک ''بروکنگز انسٹیٹیوٹ'' نے بالکل درست تجزیہ کیا ہے۔

آج بھی اکثر حضرات کا دینی مدارس کے بارے میں وہی تصور ہے جو سالوں پرانا بلکہ سالوں پرانے حقائق کے بھی خلاف ہے اور موجودہ زمینی حقائق تو اس کی یکسر نفی کرتے نظر آتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے اگر دینی مدارس کے اُجلے کردار اور قومی خدمات پر اعتراض اور نکتہ چینی کرنے والے بنظر غائر مشاہدہ کرلیں تو ان کے بہت سے اشکالات دور ہوسکتے ہیں۔ جس طرح امریکی تھنک ٹینک نے اپنی رپورٹ میں حقیقت پسندی کا مظاہرہ کیا ہے، اس طرح حقائق پر مبنی مزید

رپورٹیں بھی منظر عام پر آسکتی ہیں اور جس کہانی کا آغاز آج سے ایک سو اسی سال پہلے 1830ء میں ہوا تھا اس کا اختتام ٹھیک دس سال بعد 2020 میں ہوسکتا ہے۔

فیصلہ آپ پر ہے:

برطانوی سامراج نے آج سے پونے دوسو سال پہلے جب ''سونے کی چڑیا'' برصغیر پر قبضے کا منصوبہ بنایا تو ان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم بدلنا سرفہرست تھا۔ چنانچہ مشہور زمانہ ماہر تعلیم ''لارڈ میکالے'' کے ذریعے انقلاب بپا کیا گیا۔ اس کے بعد 99 فیصد پڑھے لکھے ان پڑھ شمار ہونے لگے۔ بڑے بڑے تعلیمی ادارے اور دینی مدارس بند کردیے گئے۔ مسلمانوں کی نئی نسل کو اسلامی کلچر وثقافت سے ہٹا کر انگریزی تہذیب وتمدن اپنانے پر مجبور کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک وقت ایسا بھی آیا داڑھی، ٹوپی، برقع، مسجد میں جانا اور اسلامی کلچر اپنانا جرم بن گئے لیکن جب سو سال بعد انگریز اس خطے سے گیا تو پھر آہستہ آہستہ حالات بدلے۔ انگریز تو اس خطے سے چلا گیا لیکن اثرات، ایجنٹ اور اپنے آدمی چھوڑ گیا۔ یہاں تک کہ 185 سال گزرنے کے بعد بھی اس خطے میں برطانوی پروفیسر اور ٹیچر تعلیم کے ذریعے اپنا مشن جاری رکھے ہوئے ہیں۔ 26 اکتوبر 2010ء کی شام ملکہ برطانیہ نے ''میجر جیفری لینگ لینڈز'' کو اعزازات سے نوازا۔

میجر جیفری لینگ لینڈز نے جو اس وقت 93 سال کے ہوچکے ہیں، اپنی زندگی کے 63 سال پاکستان میں گزارے ہیں۔ وہ 1947ء سے پاکستان میں ہیں۔ وہ دوسری جنگ عظیم کے دوران پاکستان کے شمالی علاقے میں آئے تھے۔ جنگ ختم ہونے کے بعد انہوں نے یہاں ایک اسکول کھولا۔ یہ اسکول پاکستان اور افغانستان کے درمیان سرحد کے اس علاقے میں واقع ہے جسے آج کل ''طالبان کا گڑھ'' کہا جاتا ہے۔ انہوں نے اپنے اس عرصے کے دوران عمران خان جیسے لوگوں کو پڑھایا۔ فوجی آمروں کے ساتھ چائے نوشی کی محفلیں کیں۔ کئی اہم عہدوں پر فائز شخصیات کی تربیت بھی کی۔

اب جبکہ وہ قبر میں ٹانگیں لٹکائے ہوئے ہیں تو انہیں اپنے لیے ایسے متبادل کی تلاش ہے جو ان کے بعد چترال میں ''لینگ لینڈز اسکول اور کالج'' کو جاری رکھ سکے تاکہ اس کا اور اس کی حکومت کا

"مشن" آگے منتقل ہو۔ ان کی "خدمات" کو سراہنے کے لیے اسلام آباد میں واقع برطانوی ہائی کمیشن میں ایک زبردست استقبالیہ دیا اور پھر ملکۂ برطانیہ نے اعزاز سے نوازا۔ قارئین! اب آپ بتائیں ہماری نئی نسل اور اسلامی کلچر کو تباہ و برباد کون کر رہا ہے؟ امریکی مداخلات کو روکنے والے علماء، طلبہ، مدارس اور طالبان خطرناک ہیں یا نئی مسلمان نسل کو تعلیم کے ذریعے مغربی تہذیب و تمدن میں رنگنے والے برطانوی پروفیسر میجر جیفری لینگ لینڈز؟ فیصلہ آپ پر ہے۔

☆☆☆

کتابیات/حوالہ جات

	ہمارا دینی نظام تعلیم	ڈاکٹر محمد امین	مرکز تحقیق اسلامی، لاہور
	دینی مدارس کی ضرورت......	مولانا محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ	بیت العلم، کراچی
	دینی مدارس: تبدیلی کے رجحانات	خالد رحمٰن	انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز اسلام آباد
	دینی مدارس کا نصاب و نظام: نقد و نظر کے آئینے میں	ابو عمار زاہد الراشدی	الشریعہ اکادمی
	تاریخ دار العلوم دیوبند	سید محبوب رضوی	ادارہ اسلامیات لاہور، کراچی
	دینی مدارس میں تعلیم	سلیم منصور خالد	انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز اسلام آباد
	عہد نبوی کا نظام تعلیم	محمد یاسین شیخ	ارشد بک سیلرز، آزاد کشمیر
	مسلمانوں کا نظام تعلیم	ڈاکٹر احمد شلبی	اردو اکیڈمی سندھ، کراچی
	دینی مدارس کی خدمات اور اہلِ مغرب کی اسلام دشمنی	محمد انور بن اختر	ادارہ اشاعت اسلام، کراچی
	دینی مدارس: ماضی، حال اور مستقبل	ابن الحسن عباسی	مکتبہ عمر فاروقؓ، کراچی
	خیر القرون کی درسگاہیں اور ان کا نظام تعلیم و تربیت	مولانا قاضی اطہر مبارکپوری	ادارہ اسلامیات لاہور، کراچی
	دینی مدارس اور ان کے خلاف پروپیگنڈا	مولانا محمد مظہر	کتب خانہ مظہری، کراچی
	جامعۃ الرشید کی ضرورت کیوں؟	حضرت مفتی رشید احمد رحمہ اللہ	الرشید، ناظم آباد، کراچی
	مدارس کی ترقی کا راز	حضرت مفتی رشید احمد رحمہ اللہ	الرشید، ناظم آباد، کراچی
	مکاتب دینیہ کی اہمیت	مولانا محمد طلحہ بن مولانا محمد زکریا رحمہ اللہ	مکتبۃ الحرمین، اردو بازار لاہور
	ایک اہم علمی تقریر	مولانا انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ	ناشر: عبد السلام ہوشیار پوری
	"رسالہ.....اسٹرائیک"	شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا رحمہ اللہ	کتب خانہ یحیوی مظاہر علوم، بھارت
	ذکر علی گڑھ	عبد المجید قریشی	مکتبہ اردو ڈائجسٹ، لاہور
	مختصر ارشاد الخیاری لی تحذیر المسلمین من مدارس النصاری	مؤلف و ناشر مجہول	کتب خانہ دار العلوم کراچی میں دستیاب
	المنهج المقترح لتبصير طلاب العلم مبرة الآل والاصحاب		مبرة الآل والاصحاب الكويت

	جامعۃ دار العلوم (دیوبند) واسلوبہا فی دراسۃ الحدیث	علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ	مکتب الاحتفال الکسوی، بھارت
	حرکۃ التعلیم الاسلامی فی الہند والطور المنہج	محمد واضح رشید الحسنی ندوی	المجمع الاسلامی العلمی، لکنائو، الہند
	تعلیم المتعلم۔ طریق التعلیم	علامہ زرنوجی	
	طرق تدریس۔۔۔ مواد التربیہ الاسلامیہ	عدنان حسن باحارث	دار المجتمع للنشر والتوزیع، جدہ
	آداب المتعلمین	مولانا صدیق احمد باندویؒ	
	درسگاہ نبوی کے طلبہ	مولانا اشفاق احمد قاسم گیاوی	مکتبہ قاسم العلوم، کورنگی کراچی
	درس نظام کا دور جدید سے ربط اور دینی تعلیم کی اہمیت	غلام کبریا	ملی تحقیقی ادارہ، لاہور
	اکابر ملت کا پیغام۔۔۔۔ دینی مدارس میں پڑھنے پڑھانے والوں کیلیے	غازی دفریدی	ادارہ ادبیات، دلی
	تعلیم۔۔۔۔ اسلامی تناظر میں	سلم سجاد، سلیم منصور خالد	انسٹی ٹیوٹ پالیسی سٹڈیز، اسلام آباد
	مروجہ مدارس نسواں شریعت کی روشنی میں	مفتی محمد نعیم مظاہری	
	تحفہ تعلیمات برائے مدارس دینیہ	مفتی عبد اللہ مظاہری	
	اسلام کے قلعے	مولانا سید ابوالحسن علی ندوی	
	تاریخ علی گڑھ تحریک	آل پاکستان ایجوکیشنل اکیڈمی	
	اصلاحی خطبات	مفتی محمد تقی عثمانی	میمن اسلامک پبلشرز
	ہمارا تعلیمی نظام	مفتی محمد تقی عثمانی	مکتبہ دار العلوم، کراچی
	دینی مدارس کا نصاب ونظام	مفتی محمد تقی عثمانی	مکتبہ معارف القرآن، کراچی
	سلف واکابر کا طریق مطالعہ وتدریس	مفتی فضل الحق امینی	مکتبہ امینیہ، ڈھاکہ
	العلم والعلماء	عبد الرزاق ملیح آبادی	ادارہ اسلامیات، لاہور
	آداب زرین برائے طلبہ ومدرسین	محمد یوسف ایوبی	احمد بخش پراچہ
	اہل علم کے لیے جواہر پارے	مفتی سبحان محمود	عارفی پبلشرز، کورنگی کراچی
	آداب طالب علم	مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ	مکتبۃ الاسلام، کراچی
	حکیم الامت کا علماء وطلبہ سے خطاب	مرتب۔ صوفی محمد اقبال قریشی	کتب خانہ مظہری
	تعلیمی نفسیات	عبد الحئی علوی	شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز
	مثالی شاگرد	ابو سجاد صدیق احمد	مکتبہ حمادیہ
	تحفہ علم	مولانا حبیب اللہ اچکزئی	مکتبہ محمود، کراچی
	علم اور حلم	مفتی محمود اشرف عثمانی	ادارہ اسلامیات، لاہور

	تربیت اولاد کا اسلامی نظام	مولانا قمر الزمان	کتب خانہ مظہر
	اصول زریں برائے طلبہ و مدرسین	شاہ ابرار الحق	خانقاہ امدادیہ اشرفیہ، کراچی
	پاکستان کی مثالی دینی درسگاہ	مولانا مسعود قاسم قاسمی	جامعہ قاسم العلوم بہاولنگر
	طلوع اسلام	مولانا ضیاء الرحمن فاروقی	اشاعت القرآن
	مقدمہ ابن خلدون	اُردو ترجمہ: مولانا راغب رحمانی	
	تحفۃ العلماء	مولانا زید	
	خطبات علی میاں	مولانا محمد رمضان میاں	
	احمقوں کی دنیا	مولانا فاروق حسن زئی	
	جدید حکومتیں	ڈاکٹر محمد اعظم چوہدری	
	یہودی سازشیں	مصطفیٰ کمال پاشا	اساس پبلشرز
	بین الاقوامی یہودیت	ہنری فورڈ اول	مکتبہ ندائے ملت، لاہور
	پروٹوکول	اُردو ترجمہ: میاں عبد الرشید	صدر مجلس فکر و کردار، لاہور
	تسخیر عالم کا یہودی منصوبہ	صہیونی داناؤں کی دستاویزات	
	دار العلوم دیوبند	مولانا عبید اللہ الاسعدی القاسمی	
	نظم و نسق مدرسہ		اُردو مرکز لاہور
	پیام ندوۃ العلماء	محمد الحسنی ندوی	
	نصاب تعلیم برائے مدارس آسام و بنگال	شیخ الاسلام حسین احمد مدنی رحمہ اللہ	
	دستور اساسی مع آئین دار العلوم دیوبند	مجلس شوریٰ دار العلوم دیوبند	جاری کردہ: شعبان 1368ھ
	دار العلوم دیوبند کی صد سالہ زندگی	مولانا قاری محمد طیب	دار العلوم دیوبند
	سہ ماہی نشانِ منزل	آرمی ایجوکیشن	آرمی ایجوکیشن
	جائزہ مدارس عربیہ اسلامیہ مغربی پاکستان	حافظ نذیر احمد	جامعہ چشتیہ ٹرسٹ، فیصل آباد
	احیائے اسلام کی عظیم تحریک	مولانا اسیر ادروی	مکتبہ خلیل، لاہور
	اشاعت اسلام میں مسجد کا کردار	محمد حسین صدیقی	زمزم پبلشرز، کراچی
	رہنمائے طلبہ	مولانا فیض الرحمن عثمانی	قرطاس پبلشرز
	باتیں ان کی یاد آتی ہیں بہت	مولانا محمد زکریا سنبھلی	الفرقان بک ڈپو نظیر آباد لکھنؤ
	التجائے مسافر	ابن الحسن عباسی	مکتبہ عمر فاروقؓ، کراچی
	خدمات دار العلوم دیوبند نمبر	ماہنامہ پیغام محمود	دفتر ماہنامہ پیغام محمود، دیوبند
	دار العلوم دیوبند	مولانا اسیر ادروی	مکتبہ خلیل
	تخصص حدیث، سہارنپور	مولانا محمد شاہد سہارنپوری	شعبہ نشر و اشاعت، بھارت
	اسلام کا نظریہ محنت	خلیل الرحمن	عارف پبلی کیشنز کراچی
	نظام اسلامی: مشاہیر اسلام کی نظر میں	خلیل حامدی	اسلامک پبلی کیشنز لاہور

	کیا اسلام ایک تحریک ہے؟	بشیر احمد حامد حصاری	مکتبہ سبحانیہ رحیم یار خان
	اسلامی سماج	ریو بن لیوی	ترقی اُردو بیورو نئی دہلی بھارت
	اسلام کا معاشرتی نظام	محمد بن علوی المالکی الحسینی	ضیاء القرآن پبلی کیشنز لاہور
	اسلامی نظریہ اجتماع	حیدر زمان صدیقی	نفیس اکیڈمی کراچی
	اسلامی فکر و ثقافت	عطش درانی	مکتبہ عالیہ لاہور
	اسلام اور دور جدید	محمد حسین للہی	خانقاہ چشتیہ سلیمانیہ للہ
	پاکستان میں مغربی ثقافت و ملحدانہ افکار کا نفوذ اور اس کے اسباب	نثار احمد خان فتحی	عظیم پبلشرز، ہمدرد پریس کراچی
	اسلام کا روشن مستقبل	سید خلیل اللہ حسینی	دار الاشاعت حیدرآباد انڈیا
	تعلیم و تربیت	عبد الرحمٰن شاد	فردوس پبلی کیشنز، دہلی بھارت
	اسلام کے بین الاقوامی اصول و تصورات	مولانا مجیب اللہ ندوی	مرکز تحقیق، لاہور
	تعلیم و تربیت اسلامی تناظر میں	اشاعت خصوصی مجلہ تنظیم	ادارہ تعلیمی تحقیق تنظیم اساتذہ، لاہور
	قصر بلند یعنی مطالعہ قرآن	ایچ ایچ امام اکبر آبادی	آفتاب اکیڈمی، کراچی
	دینی مدارس کے لیے مجوزہ متون کی فہرست	اوقاف، پاکستان	
	درسِ نظامی کی کتابیں کس طرح پڑھائی جائیں؟	مفتی محمد تقی عثمانی	مکتبہ نعمانیہ، کراچی
	جامعہ دار العلوم کراچی کا کردار	ڈاکٹر مولانا زبیر اشرف عثمانی	ادارۃ المعارف، کراچی
	علوم اسلامیہ کا بے مثال نظام تعلیم	عبد البر قاسم	مکتبہ قاسمیہ گھنٹہ گھر ملتان
	ندوہ کا ایک دن	ڈاکٹر محمد اکرم ندوی	مجلس نشریات اسلام، کراچی
	وضعیت کنونی مدارس دینی در افغانستان (فارسی)	ابو الخیر عبد الرحمٰن معصومی غوری	کتابخانہ فیضی، کوچہ گرام ہرات
	تحلیلی و تحقیق از اوضاع حوزہ ہای علمیہ (مولانا قاری محمد طیب)	ترجمہ فارسی: صلاح الدین شاہنوازی	انتشارات صدیقی زاہدان، ایران
	سیری در سیستم آموزشی حوزہ ہای علمیہ (مفتی محمد تقی عثمانی)	ترجمہ فارسی: صلاح الدین شاہنوازی	انتشارات صدیقی زاہدان، ایران
	Islamic Life and Thought	Sayyed Husain Nsar	George Allen and Unwin Ltd London
	First Asian Islamic Conference-1978, Pakistan Karachi, July 6-8-1978		
	Why Islam is our only choice	Muhammad Hanif Shahid	Dar-us-Salam Publications, Saudi Arabia

Institute of Islamic Culture	Abdul Jabbar Danner	The Islamic Tradition	

وہ اخبار و جرائد اور کالم نگار و مصنفین جن کی تحریروں سے استفادہ کیا گیا

ہفت روزہ ضرب مومن۔ روزنامہ اسلام۔ روزنامہ جنگ۔ نوائے وقت۔ حق نوائے احتشام۔ ڈان۔ دی نیوز۔ بی بی سی، لندن۔ نیویارک ٹائمز۔ واشنگٹن پوسٹ۔ سنڈے مرر۔ ماہنامہ الشریعہ۔ ماہنامہ وفاق المدارس.......... شیخ العرب والعجم مولانا حسین احمد مدنیؒ۔ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ۔ مولانا وحید الزمان کیرانویؒ۔ مفکر اسلام سید ابوالحسن علی ندویؒ۔ مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ.......... مولانا سلیم اللہ خان۔ مفتی محمد تقی عثمانی۔ مفتی ابولبابہ شاہ منصور۔ مولانا محمود اشرف عثمانی۔ مولانا سید عدنان کاکاخیل۔ مولانا زاہد الراشدی۔ مولانا قاری محمد حنیف جالندھری۔ مولانا محمد اظہر۔ مولانا اویس قاضی۔ مولانا محمد صدیق ارکانی۔ مولانا محمد شفیع چترالی۔ یاسر محمد خان اور دیگر کئی حضرات۔

انور غازی کی وہ سات کتابیں جو شایع ہو چکی ہیں

☆......کارزار (جلد اول)

☆......نکتہ در نقطہ (جلد اول)

☆......دوراہا (جلد اول)

☆......قلم کی قسم

☆......حرمین کا مسافر

☆......ڈیورنڈ لائن کے اس پار

☆......نقوشِ بندگی

انور غازی کی دیگر زیرِ طبع کتب

☆ کارزار (دوسری جلد)

روزنامہ جنگ میں شائع ہونے والے سو مضامین کا مجموعہ۔

☆ نکتہ در نقطہ (دوسری جلد)

ضربِ مؤمن میں شائع ہونے والے پچاسی مضامین کا مجموعہ۔

☆ دوراہا (دوسری جلد)

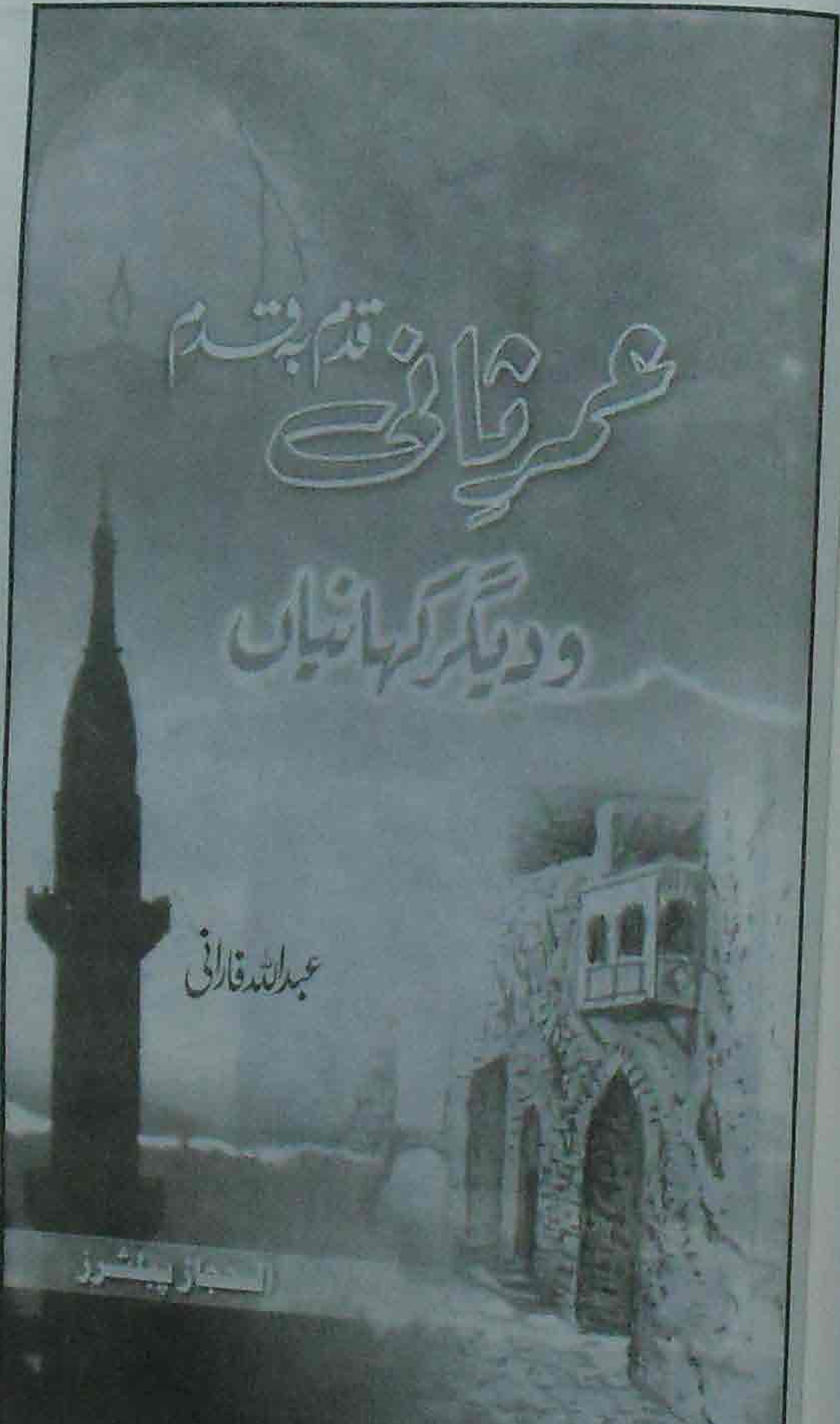
روزنامہ ''اسلام'' میں شائع ہونے والے منتخب کالموں کا مجموعہ۔

☆ حوا کی بیٹی

مظلوم خواتین کو این جی اوز کس طرح اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتی ہیں؟

☆ اِک طرزِ زندگی

آدابِ معاشرت پر ایک تہلکہ خیز کتاب۔


عمر ثانی قدم بہ قدم
و دیگر کہانیاں
عبداللہ قارانی
الحجاز پبلشرز